

عقائد امامیہ

۱۵۰ اصولوں پر مبنی شیعہ اثنا عشری عقائد کی مختصر لیکن واضح

اور

استدلالی شرح

تالیف

آیت اللہ جعفر سبحانی

ناشر

مرکز چاپ ونشر مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام



کتاب کا نام:ـــــــ ''عقائد امامیہ''

تالیف:ـــــــ آیت اللہ جعفر سبحانی

مترجم:ـــــــ سید قلبی حسین رضوی

اصلاح ونظر ثانی:ـــــــ سید احتشام عباس زیدی

ناشر:ـــــــ مرکز چاپ ونشر مجمع جہانی اہلبیت ؑ

طبع:ـــــــ اوّل

سال طبع:ـــــــ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ

تعداد:ـــــــ ۵۰۰۰

مطبع:ـــــــ لیلا

ISBN: 964-5688-86-8

جمہوری اسلامی ایران-تہران-پوسٹ بکس نمبر:۱۴۱۵۵/۷۳۶۸

ٹیلیفون نمبر:۸۹۰۷۲۸۹-۲۱-۰۰۹۸

فیکس نمبر:۸۸۹۳۰۶۱-۲۱-۰۰۹۸

☆ابن عباس نے فرمایا: پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی:

ما رأس العلم یارسول اللہ؟

قال :معرفة اللہ حق معرفته.

''اے پیغمبر علم و دانش کی ابتداء کیا ہے ؟
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدا کو اُس طرح پہچان لیا جائے جس کا وہ سزاوار ہے۔''(۱)

☆امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

انّ افضل الفرائض واوجبها علی الانسان معرفت الربّ و الاقرارله بالعبودیه.

''انسان پر سب سے اعلیٰ اور لازم ترین فریضہ خدا کی معرفت اور اس کی بندگی ہے۔''(۲)

۱۔توحید صدوق/۲۸۵ ۲۔بحارالانوار:ج۴،ص۵۵۔

فہرست

موضوع	صفحہ

موضوع	صفحہ

موضوع	صفحہ

موضوع	صفحہ
۳۰ویں اصل: کائنات میں خدا کے سوا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے (خالقیت میں توحید)۔ انسان پوری آزادی کے ساتھ اپنے وجود کے قبض سے استفادہ کرتا ہے لہذا اس کے اعمال کی مسئولیت خود اس کے ذمہ ہے۔	۹۴
۳۱ویں اصل: خدا کے سوا کائنات کا کوئی ربّ و مدبر نہیں ہے (تدبیر اور ہدایت میں توحید) اور دیگر مدبر جیسے فرشتے، صرف اس کی اجازت و حکیمانہ مشیت کے تحت فریضہ انجام دیتے ہیں۔	۹۶
۳۲ویں اصل: اگر کائنات کی تخلیق میں خدائے واحد ہی وجود و ہستی کا مدبر ہے، تو دین اور شرع سے مربوط امور میں بھی وہی حاکم مطلق اور قابل اطاعت ہے اور بعض دینی امور میں دوسرے افراد کا اقدام اسی کے حکم اور اذن کے تحت ہے۔	۱۰۲
۳۳ویں اصل: عبادت میں توحید، تمام آسمانی شریعتوں کے درمیان مشترک اصل ہے اور بعثت انبیاء کا مقصد اس اصل پر تاکید اور یاد دہانی ہے۔	۱۰۳

موضوع	صفحہ

اصول عقاید

تیسرا حصہ

خدا کے صفات

موضوع	صفحہ

پیغمبروں کی عصمت

صفحہ	موضوع
	گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا تھا۔ اور بعد میں بھی اس کتاب کے بارے میں دانشوروں کے عجز و انکساری میں روزافزوں اضافہ ہوتا رہا ہے۔
	۷۲ویں اصل:
۱۸۷	قرآن مجید ایک ادبی اعجاز کے علاوہ گوناگوں پہلوؤں سے معجزہ ہے: -قرآن کو لانے والا ایک ایسا شخص ہے جس نے کسی سے کچھ نہیں پڑھا ہے۔ -باوجوداس کے کہ قرآن مجید زمان ومکان کے لحاظ سے مختلف حالات، سفر و حضر، جنگ و صلح اور سختی وآسائش کے دوران نازل ہوا ہے پھر بھی اس کے مضمون میں ذرّہ برابر تضاداور دٹکراو نہیں پایاجاتا۔ -اس فطری، پائیداراور پاک کتاب نے انسان کوقانون سازی کا محور بنایا ہے اورانسانی فطرت کے پائیداراوردائمی ہونے کے پیش نظراپنے قوانین کولافانی بنادیا ہے۔
	۷۳ویں اصل:
۱۹۰	قرآن مجید نے آیات الٰہی کی تشریح کے ساتھ ساتھ تخلیق کائنات کے سلسلے میں کچھ سائنسی اسرار سے بھی پردہ اٹھایا ہے، جن سے متعلق اس زمانے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے وحی الٰہی کے سوا کوئی اورراستہ ممکن نہ تھا۔اس کے علاوہ اس

موضوع	صفحہ
٧٦ویں اصل: پیغمبراسلامؐ قرآن مجید کے علاوہ کچھ اور معجزات اور کرامتوں کے مالک تھے، جن میں شق القمر، معراج، اہل کتاب سے مباہلہ میں فتحیابی اور غیب کی خبر دینا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔	۱۹۷

پیغمبراسلامؐ کی نبوت کے خصوصیات

موضوع	صفحہ
٧٧ویں اصل: دین اسلام ایک عالمی دین ہے، یہ دین کسی خاص علاقہ یاقوم ونسل سے مربوط نہیں ہے۔ اگراس دین کی آسمانی کتاب عربی زبان میں ہے توصرف اسلئے کہ سنت الٰہی یہ ہے کہ پیغمبراپنی قوم کی زبان میں لوگوں سے بات کرتے تھے تاکہ لوگوں کے لئے قابل فہم ہو۔	۲۰۰
٧٨ویں اصل: پیغمبراسلامؐ نبیوں کے خاتم، آپؐ کی کتاب آسمانی کتابوں کی خاتم اورآپؐ کی شریعت پر بھی تمام آسمانی شریعتوں کاخاتمہ ہے۔ آپؐ کے بعد نبوت کاسلسلہ بند ہو گیااوراب نہ کوئی نبی آئیگا، نہ کوئی کتاب نازل ہو گی اور نہ کوئی شریعت آئیگی۔	۲۰۲

صفحہ	موضوع
	کے ان دشمنوں کی یأس وناامیدی کا سبب جانشین کے تعین کے بعد پیغمبرؐ کی ذمہ داریوں کا(نبوت کے علاوہ)تمام پہلوؤں سے جاری رہناتھا
۲۳۴	**۹۰ویں اصل:** پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد خلیفہ کی تعیین کامسئلہ صحابہ کے ذہن میں ایک قانونی اورضروری اصل کے حیثیت سے موجودتھا۔ اسی لئے پہلے خلیفہ کے ذریعہ دوسراخلیفہ مقرر ہوا اور تیسرا خلیفہ بھی دوسرے خلیفہ کی مقرر کردہ چھ رکنی شوریٰ کے ذریعہ منتخب ہوا،فرق اتنا ہے کہ شیعہ اس امر کے معتقدہیں کہ خلیفہ کا تقرر خدا کی جانب سے ہوتاہے نہ کہ پہلے کے خطاپذیر خلیفہ کے ذریعہ۔
۲۳۵	**۹۱ویں اصل:** پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعدامام کے فرائض حسب ذیل ہیں: مفاہیم قرآن کی وضاحت،احکام شرع کابیان،معاشرے کوہرقسم کے انحرافات سے بچانا،دینی واعتقادی مسائل کاجواب دینا،دشمنوں سے اسلامی سرحدوں کی حفاظت،معاشرے میں عدل وانصاف کانفاذ۔ اسلئے شیعوں کے عقیدہ کے مطابق ایسا شخص خاص الٰہی عنایات کاحامل ہوناچاہئے اوراسے غیبی تربیت کے نتیجہ میں ایسے مقام ومرتبہ پرفائزہوناچاہئے۔

موضوع	صفحہ
طرح حضرت ولی عصرؑ اپنی غیبت کے دوران اللہ کے غائب اولیاء میں شمار ہوتے ہیں۔	
۹۸ویں اصل: امام زمانہؑ کے بعض فرائض آپ کی غیبت کے دوران جامع الشرائط فقہاکے ذمہ ہیں۔ لوگوں کاآپ کے ظہور کی برکتوں سے محروم ہوناچندوجوہات کی بناپر ہے جن کی وجہ سے آپ کی غیبت ناگزیر بن گئی ہے اوران وجوہات میں سے ایک لوگوں کی عدم صلاحیت اور آپ کے ظہورکے لئے عدم آمادگی ہے۔	۲۴۹
۹۹ویں اصل: بعض انبیاء کی زندگی میں غیبت کودیکھتے ہوئے، حضرت ولی عصرؑ کی غیبت باعث حیرت وتعجب نہیں ہونی چاہئے۔آپ کی غیبت کے اسرار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ ایسے زمانے میں ظہور فرمائیں گے جب دنیاکے لوگوں میں عدل وانصاف کوقبول کرنے کی آمادگی پیداہوجائے گی۔ کیونکہ لوگوں میں ضروری آمادگی سے پہلے آپ کاانقلاب اور ظہور ظالم طاقتوں سے نبردآزمائی کے نتیجہ میں شکست اورشہادت کاباعث ہوسکتاہے۔	۲۴۹

صفحہ	موضوع

صفحہ	موضوع

موضوع	صفحہ

صفحہ	موضوع

بسمہ تعالیٰ

عرض ناشر

امتِ مسلمہ کے اہم فرائض میں سب سے اہم فریضہ مسلمانوں کے درمیان موجود اختلاف وفتنہ کے عناصر کو ناکام بنا کر ان کی صفوں میں اتحاد واتفاق پیدا کرنا ہے اور اللہ کی رسی سے مضبوطی کے ساتھ تمسک ہی اس کا واحد ذریعہ ہے جس سے امت مسلمہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے محفوظ رہ سکتی ہے اور پھر اتحاد واتفاق کی اس سیسہ پلائی ہوئی دیوار میں کوئی رخنہ اندازی نہیں کر سکتا.

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس وقت سامراج اور کفرونفاق کی عالمی طاقتیں پوری قوّت، اور جدید ترین وسائل وذرائع ابلاغ سے لیس ہو کر الٰہی مقدسات، خصوصاً اسلام اور قرآن مجید کے مقابلے میں صف آرا ہو چکی ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دشمنان اسلام، ملت اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لئے مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف وافتراق، شک وبدظنی کی فضا پیدا کر کے ان کی شان وشوکت اور عظمت کو نابود کرنے کے درپے ہیں اور اپنے ان منحوس ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہر لحہ طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں. اور اس سلسلے میں انہوں نے ذرائع ابلاغ کے جدید اور نت نئے وسائل جیسے: روزنامے، مجلّات، ویڈیو، ٹی وی، انٹرنٹ، فیلم، کتاب ومقالات وغیرہ کی بھرمار کر رکھی ہے؟ اگر ایسا ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہے تو ہمیں بیدار ہو کر تہمتوں کا جواب دینا چاہئے اور ملت اسلامیہ کے خلاف دشمن کی سازشوں کو بے نقاب کر کے انھیں ناکام بنا دینا چاہئے. واضح ہے کہ اسلام واسلامی معارف کے جانی دشمنوں کے ان چار سو حملوں اور یورشوں کی زد میں سب سے زیادہ شیعہ اور اہل بیت پیغمبرؐ کے پیرو قرار پائے ہیں. یہ لوگ امت مسلمہ کا ایک بڑا حصہ ہیں جو دنیا کے پانچوں براعظموں میں کروڑوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں اور دشمن اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ اس مذہب کے پیرو اسلام اور اسلامی اقدار کے سب سے بڑے محافظ ہیں لہذا ابھی ان پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ ان کا قرآن تمام مسلمانوں کے قرآن سے جدا ہے اور ستم ظریفی کا عالم یہ ہے کہ اس سلسلے میں یہ ڈھونگ رچایا گیا ہے کہ فلاں ''مسٹر''۔جس کے نام سے ظاہر ہے یہ شخص

یقیناً انگریز ہے- اس امر سے آگاہ ہوا ہے. حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کے اس ترقی یافتہ دور میں صرف یہ ''مسٹر'' ہی اس راہ سے آگاہ ہو سکا ہے.

کبھی دشمنان اسلام اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ پیروان اہل بیتؑ کافر ہیں اور ان کا خون بہانا جائز ہے، ان کے توحید، عدل، نبوت، معاد، نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کا کوئی فائدہ نہیں، ان کا اشهد ان لااله الاالله واشهدان محمداًرسول الله وانه خیر وخاتم انبیاء الله و...کا اقرار و اعتراف توحید اسلام کی دلیل اور ثبوت نہیں اسطرح کے دسیوں اور سیکڑوں جھوٹ، افتراء اور تہمتوں کے پلندے بنا کر صہیونیت کے بین الاقوامی ذرائع ابلاغ ومطبوعات اور ادارے دنیا بھر میں اس کا پروپگنڈا کرتے رہتے ہیں.

حقیقت میں یہ پروپگنڈے کوئی نئی ایجاد نہیں ہیں بلکہ صرف اس کا شیوہ اور طریقہ کار بدلا ہے. ورنہ کیا یہی مظلوم عالم حضرت علی ابن ابیطالبؑ نہ تھے جو بنی امیہ کے دارالخلافہ میں تارک الصلاۃ کے عنوان سے مشہور کئے گئے. کیا یہی حسنؑ وحسینؑ ابن علیؑ نہ تھے جنھیں خوارج و اپنے نانا رسول خداؐ کی سیرت کے مخالف کے طور پر مشہور کیا گیا؟

حوزہ علمیہ قم کے محترم ومحقق استاد آیت اللہ جعفر سبحانی نے دشمنوں کے ان بیجا حملوں کے مقابلے میں عقائد ومعارف اہل بیتؑ اور ان کے پیروں کے اعتقادات کو زیبا اور مثبت انداز میں ''عقائد امامیہ'' کے عنوان سے تألیف فرمایا ہے. اور اعلان کیا ہے کہ: یہ ہیں ہمارے عقائد و معارف اور یہ ہیں اسلام کے وہ احکام جن پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں، ان پر عمل کرتے ہیں اور اس راہ پر اپنی جان ومال کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتے.

مجمع جہانی اہل بیتؑ - جس کا قیام ولی امر مسلمین حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی کی عنایتوں سے عمل میں آیا- نے عقائد ومعارف اہل بیتِ پیغمبرؐ کی نشر واشاعت اور اہل بیتؑ کے پیروں کے خلاف لگائی جانیوالی تہمتوں اور افتراء پردازیوں کو طشت از بام کرنے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی ہے. آیت اللہ جعفر سبحانی کی مذکورہ کتاب کو دنیا کی مختلف زبانوں، من جملہ اردو میں ترجمہ کرنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے. امید ہے کہ تشنگان حقائق ومعارف اہل بیتؑ اس گرانقدر کاوش سے بھرپور استفادہ فرمائیں گے اور انشاء اللہ بارگاہ رب العزت میں ہماری یہ کوشش قبول ہوگی- آمین-

مجمع جہانی اہل بیت (ع)

پیش لفظ

آج کے انسان کا دین کی طرف میلان
اور
اس کتاب کی ضرورت

عصر جدید کو صنعت وٹیکنالوجی کے عصر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان نے آخری صدی میں اس میدان میں نمایاں ترقی کی ہے اور بجا ہے کہ اس امر کو ان خصوصیات کے تناظر میں اہمیت دی جائے لیکن اس خصوصیت کے پہلو بہ پہلو ایک عظیم ثقافت کا ظہور بھی پایا جاتا ہے اور یہ یقیناً آج کے انسان کی دین اور دینی تعلیم کی طرف اہمیت اور رجحان ہے۔ دین کی طرف انسان کا میلان اس کے اصلی اور قدیم ترین میلانات میں سے ہے۔ تاریخ نے اسے ثبت کیا ہے اور کر رہی ہے۔ اور استوار ومحکم اسناد و شواہد کی بناء پر ثابت ہو چکا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے کسی بھی موڑ پر دین کی طرف توجہ اور مذہب کے احساس سے بے نیاز نہیں تھا۔ اس کے باوجود دور رنسانس (Renaissance) کے بعد سائنسی دنیا میں روز افزوں ترقی کے نتیجہ میں انسان کا مادیات پر تسلّط بڑھا، بعض سیاسی وثقافتی عوامل کی وجہ سے دین کی طرف توجہ سست پڑ گئی اور مغربی معاشرے میں دین کے بارے میں بے توجہی رونما ہونے لگی۔ اس بیماری نے رفتہ رفتہ مشرقی ممالک میں بھی ایک بڑے طبقے کو متأثر کیا، اور یہ لہر اس حد تک بڑھی کہ لوگ تصور کرنے لگے کہ سائنس ہی انسان کی تمام ضروریات کو پورا کرسکتی ہے اور دین کے ذریعہ پورے ہونے والے تقاضوں کا نعم البدل بھی بن سکتی ہے۔ لیکن بعض عوامل کی حقیقت کھلنے اور تباہی وبربادی کے ظہور نے اس تصور پر خط بطلان کھینچا اور ثابت کر دیا کہ بشر کسی بھی وقت دین اور

دین کی ضرورت و رہبری سے بے نیاز نہیں تھا اور کوئی بھی چیز مذہب کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ ہم ان عوامل میں سے مندرجہ ذیل تین کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ بیسویں صدی میں عالمی جنگوں کا رونما ہونا:

پہلی اور دوسری عالمی جنگیں کہ جن کے نتیجہ میں دسیوں لاکھ انسان قتل عام ہوئے، دین سے جدا علم (سائینس) کے ذریعہ لڑی گئیں۔ اور جس علم کے بارے میں تصوّر کیا جاتا تھا کہ انسان کی آرزوں اور تمناؤں کو شرمندۂ تعبیر کریگا، اچانک اسی علم نے انسان کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لاکھڑا کر دیا۔

۲۔ اخلاقی برائیوں کے نتیجہ میں خاندانوں کا بکھرنا:

مغربی دنیا کے اکثر ممالک میں "خاندان" اپنے مفہوم کو کھو بیٹھے ہیں اور ایک عارضی اور ناپائیدار معاشرہ میں تبدیل ہو چکے ہیں، جدید علم (سائینس) خاندان کی اس ویرانگری اور تباہی میں بے اثر نہیں رہا ہے لیکن یہاں پر کنٹرول سے باہر اور دین سے جدا علم مقصود ہے۔

اس امر کی وضاحت لازم ہے کہ اسکا یہ مقصد نہیں ہے کہ جدید علم بہر حال ضرر و نقصان کا مظہر ہے، بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ علم و ٹیکنالوجی چونکہ دینی اور معنوی قیادت و رہبری سے محروم ہو چکی ہے، اسی لئے ان نقصانات اور تنزل کا باعث بن چکی ہے۔

۳۔ بعض علمی نظریوں کی ناکامی و بے اعتباری:

مذکورہ دو عامل کے علاوہ جو انسان کی علم جدید کے بارے میں انتہا پسندانہ فریفتگی اور خوش فہمی کو معاشرہ میں انتہائی تنزل تک لانے کا باعث بنے۔ بعض علمی نظریات کی ناکامی و بے اعتباری بھی اس امر کا سبب بنی کہ انسان عالمی شناخت کے سلسلے میں علم جدید سے مربوط اپنے ابتدائی عزم و اعتقاد سے ہاتھ دھو بیٹھے اور نتیجہ میں اس خواب غفلت سے بیدار ہو جائے جس نے انیسویں صدی میں یورپ کے انسان کو مست و مدہوش کر رکھا تھا۔

مذکورہ عوامل اور ان جیسے دوسرے عوامل باعث بنے کہ بشر ایک بار پھر فطرت انسانی کی طرف

لوٹ آئے اور دین ومعرفت کا دامن پکڑے۔حقیقت میں انسان ایک مدت تک خود کو دینی فوائد سے محروم کرنے کے بعد ایک پیاسے کے مانند پھر سے اس ٹھنڈے اور شیریں پانی (دین) کی تلاش میں نکلا ہے۔

یہ موضوع اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اس کیلئے دلیل و برہان کی ضرورت نہیں اور جو لوگ عالمی حوادث سے باخبر ہیں، اس سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ تازہ ظہور یافتہ میلان اس حد تک پہنچا ہے کہ دین ایک بار پھر دنیا کے اعلیٰ سطح کے علمی مراکز میں توجہ کا مرکز قرار پایا ہے اور مفکرین واساتذہ، دین کے بارے میں گفتگو کرنے لگے ہیں اور کوئی ہفتہ یا مہینہ ایسا نہیں گذرتا جس میں دین ودین شناسی سے متعلق دسیوں مقالات اور کتابیں شائع نہ ہوتی ہوں۔ایک مصنف کا قول ہے: ''انسان کا معنویات اور مذہب کی طرف پلٹنا مغربی سماج شناسی کی بنیادوں کیلئے ایک خطر بن کے ابھرا ہے۔لہٰذا یہ لوگ جہاں مسلمانوں کے اسلام کی طرف دوبارہ رجحان اور میلان سے خوف و وحشت سے دوچار ہیں وہاں عیسائیوں کے عیسائیت کی طرف پلٹنے سے بھی خوفزدہ ہیں''۔حقیقت میں یہ لوگ مغربی معاشرے میں ہر قسم کی معنوی واخلاقی یلغار اور ایمان و اخلاقیات کی حاکمیت حتیٰ انسان کی انفرادی زندگی میں بھی ایمان ومعنویت کے وجود سے خائف ہیں۔

ایک مغربی تبصرہ نگار اسلامی وغیر اسلامی معاشروں میں آئے دنوں مذہب کی طرف رجحان ومیلان اور ایمان وعقیدہ کی بالیدگی کے نمونے پیش کرتے ہوئے مغربی ممالک میں انتہا پسند عیسائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے کہ:''حالیہ برسوں کے دوران مختلف شکلوں میں مذہب پرستوں کی تعداد میں اضافہ اور پھیلاو بہت سارے ممالک کے لئے خطرہ کا باعث بن چکا ہے۔

ہم مذکورہ تبصرہ نگار کے اس تبصرہ کے باوجود رونما ہونے والے ان حالات کو فال نیک تصور کرتے ہیں اور خوش ہیں کہ بشر ایک بار پھر دین کی شفقت آمیز آغوش میں لوٹ رہا ہے۔لیکن

اس خوشحالی کے باوجود ایک پریشان کن مسئلہ یہ ہے کہ اگر بشر کی یہ پیاس صحیح ڈھنگ سے نہ بجھائی گئی اور خدانخواستہ دین کے عنوان سے ناپختہ وخام طرز تفکر نشوونما پائے تو آج کا انسان نہ فقط اپنے گمشدہ کو نہ پائے گا بلکہ دوبارہ دین سے متنفر ہوجائے گا۔لہٰذا دین شناس اور درد آشنا قلم کاروں پر لازم ہے کہ اس فطری ندا کا جواب دینے کے لئے کمر ہمت باندھیں اور دینی تعلیمات کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرنے کے لئے آمادہ ہوجائیں اور اس جاوداں فیض وبرکت الٰہی کو شفاف صورت میں حق کے طالبوں تک پہنچادیں۔

موجودہ شرائط میں جبکہ دین خواہی پوری دنیا میں ظہور پذیر ہورہی ہے اور دین سے منحرف ہوئے افراد پھر سے دین کی طرف پلٹنے لگے ہیں، بے شک ایسے حالات میں خودغرض افراد یا گروہ، اپنے شخصی یا گروہی مقاصد تک پہنچنے کیلئے دین کے لبادے میں دین کو نابود کرنے کی بھی تگ ودو کررہے ہیں۔اگر انھیں کھلی چھوٹ ملی تو ایسے افراد یا گروہ دین کے نام پر دین کے متوالوں کو زہریلی غذادیں گے اس طرح وہ ایک تیر سے دونشانے مارتے ہوئے موجودہ دینی رجحان اور جذبے کو ٹھنڈا کرنے کے علاوہ اپنے منحوس مقاصد کا تحفظ بھی کریں گے۔

ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دین اسلام آخری اور کامل ترین آسمانی شریعت ہے اور یہ دین قیامت تک کے لئے انسانی زندگی کے فردی واجتماعی، تمام پہلوؤں میں اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے۔لہٰذا ہمیں چاہئے کہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مختلف وسائل سے استفادہ کرکے دینی تعلیمات کی اشاعت وتبلیغ میں اس سنہرے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ مکتب اہل بیت علیہم السلام وہی حقیقی واصل اسلام ہے، جو قرآن و پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عترت علیہم السلام کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔اور حقیقت میں اہل بیتؑ کا طریقہ ہی وہ شاہ راہ ہے جو ہمیں کسی آلودہ ہاتھوں کی مداخلت کے بغیر سرچشمہ حقیقت کی طرف لے جاتی ہے۔چونکہ اس مکتب فکر کے اعلیٰ اصول اور خاندان رسالت علیہم السلام سے ان

کی نسبت پوری تاریخ میں ایک خاص کشش اور جذابیت کا باعث بنی ہے، اسی لئے حقیقت کے متوالوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور یہ لوگ اس کی دفاع میں عاشقانہ طور جان کی بازی لگاتے ہیں۔

حقیقت کے طالب، جو دینی حقایق کو خدا کے آخری صاحب شریعت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس مختصر تصنیف کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے اپنے لئے ایک چراغ راہ پائیں گے۔ ایسے لوگ اس اطمینان بخش تصنیف کا مطالعہ کر کے مکتب اہل بیت علیہم السلام کی حقیقت کو پا سکتے ہیں اور مزید آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس سلسلے میں سفارش کی جانیوالی دوسری کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

یہ تصنیف دنیا والوں کے روبرو اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ عقیدہ وعمل کے دائرے میں اہل بیت علیہم السلام سے مربوط عقائد و معارف کے اصول یہی ہیں جو اس کتاب میں ذکر ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی شیعوں سے منسوب کیا جائے اور اس کی اس کتاب میں مندرج ہمارے اصول عقائد سے مطابقت نہ ہو تو ایسی نسبت ہم پر تہمت ہے اور اسکی کوئی وقعت نہیں ہے۔

یہاں پر ہم اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے خدا کے فضل وکرم سے چند اصولوں کے ضمن میں ''مکتب اہل بیت علیہم السلام میں اصول اسلام'' بیان کر رہے ہیں۔ انسان اور کائنات کے بارے میں معرفت وشناخت اور اسلامی بصیرت کے کلیات کا بیان اسلامی اصولِ عقائد کے وسیع منصوبے کو حقیقت کا جامہ پہناتا ہے۔ یہاں پر ہم کلام کے طولانی ہونے سے پرہیز کرتے ہوئے اس کتاب میں اختصار کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ہاں، ہر ایک اصل کا تفصیلی مطالعہ علم کلام کی کتابوں میں کیا جا سکتا ہے۔

جعفر سبحانی

۱۴ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ

پہلا حصّہ

تصوّر کائنات کے کلّیات

اسلام میں معرفت کے طریقے

پہلی اصل:

اسلام، کائنات اور حقائق دینی کی معرفت کیلئے تین قسم کے وسائل سے استفادہ کرتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے خاص دائرے میں معتبر سمجھتا ہے۔ یہ تین وسائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ حس: جس کا سب سے اہم وسیلہ سننے اور دیکھنے کی حس ہے۔

۲۔ عقل وفہم: یہ وسیلہ ایک محدود دائرے میں خاص اصول کی بنیادوں پر یقین کی صورت میں حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔

۳۔ وحی: یہ وسیلہ بلند و بافضیلت انسانوں کا عالم غیب سے رابطہ ہے۔

پہلے دو مرحلوں میں عمومی پہلو پایا جاتا ہے، اور تمام انسان ان دو طریقوں، یعنی حس وعقل سے کائنات کی معرفت حاصل کرسکتے ہیں۔ اسی طرح یہ دو طریقے شریعت کو سمجھنے میں بھی مؤثر و مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔

تیسرا راستہ یعنی وحی، ان افراد سے مخصوص ہے جن پر خداوند تبارک وتعالی کی خاص نظر عنایت ہو اور اس کے واضح اور روشن نمونہ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء علیہم السلام ہیں (۱)

حس کے وسیلہ سے صرف محسوسات میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح عقل وفہم سے

۱۔ اسلامی روایات میں کچھ افراد کو بعنوان محدث یاد کیا گیا ہے اسکی وضاحت اپنی جگہ کی جائے گی۔

ایسے خاص دائرہ کے اندر فائدہ اٹھاسکتے ہیں جو اس سے مربوط ہو۔ جب کہ وحی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور مختلف پس منظر میں عموماً عقائد و شرعی فرائض میں نافذ اور راہ گشا ہے۔

قرآن مجید نے ان وسائل کے بارے میں متعدد آیات میں ذکر کیا ہے جن میں سے ہم دو نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

قرآن کریم حس و عقل کی بارے میں فرماتا ہے: ﴿وَاللهُ أَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُونِ أُمَّهٰتِكُمْ لَاتَعْلَمُونَ شَيْئاً وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَرَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (نحل/۷۸)۔

''اور اللہ ہی نے تمہیں شکم مادر سے اس طرح نکالا ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اسی نے تمہارے لئے کان، آنکھ اور دل قرار دئے ہیں کہ شائد تم شکر گذار بن جاؤ''۔

لغت میں ''افئدہ'' فُواد کی جمع ہے۔ سمع و ابصار کے قرینہ سے اس کا مقصود انسان کی عقل و فہم ہے۔ آیت کے آخر میں شکر گذاری کا حکم دیتے ہوئے یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ انسان کو چاہئے ہر تینوں قوتوں سے استفادہ کرے۔ کیونکہ شکر کا معنی ہر نعمت کو اپنی مناسب جگہ پر استعمال کرنا ہے۔

وحی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِيٓ إِلَيْهِمْ فَسْئَلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (نحل/۴۳)

''اور ہم نے آپ سے پہلے بھی ایسے مردوں کو رسول بنا کر بھیجا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے ہیں، تو ان سے کہئے کہ اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرو''۔

ایک مذہبی انسان کائنات اور مذہب کی شناخت کے لئے حس سے استفادہ کرتا ہے، لیکن حسی ادراکات عقل و فہم کے فیصلہ کے لئے بنیاد بنتے ہیں اور زمین ہموار کرتے ہیں، اسی طرح عقل

سے خدا اور اس کے صفات وافعال کی معرفت کے بارے میں استفادہ کیا جاتا ہے اور ان تینوں راہوں کے نتائج اور کارنامے اپنی جگہ پر نافذ العمل ہیں اور حقائق تک پہنچنے میں قابل اعتبار ہیں۔

دوسری اصل:

پیغمبران الٰہی کی دعوت کا خلاصہ دو چیزوں میں کیا جاتا ہے:

۱۔عقیدہ ۲۔عمل

عقیدہ کا دائرہ وجود خدا، اس کے جمال وجلال کی صفات اور اس کے افعال پر ایمان ہے(۱)۔ اور عمل کا مقصد بھی وہ فرائض واحکام ہیں جن کی روشنی میں انسان کو چاہئے کہ اپنی فردی و اجتماعی زندگی کو خدا کے حکم کے مطابق استوار کرے۔

عقیدہ کے بارے میں جو کچھ مطلوب اور منظور ہے، وہ علم ویقین ہے۔ اور یہ طے ہے کہ فقط وہی چیز اس سلسلے میں حجت ہو سکتی ہے جو اس مقصود (علم ویقین) تک پہنچ سکے۔ اسی لئے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنے عقائد کے سلسلے میں یقین کی منزل تک پہنچے۔ یہاں وہ دوسروں کی تقلید نہیں کر سکتا۔

احکام (عمل) کے بارے میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کو ان احکام کی بنیادوں پر ہماہنگ کرنا ہے۔ یہاں پر انسان کو چاہئے کہ یقین کے علاوہ ان طریقوں کو بروئے کار لائے جنکی شریعت نے تائید وتصدیق کی ہے، اور ایک جامع شرائط مجتہد کی طرف رجوع کرنا ان طریقوں میں سے ایک ہے جس کی صاحب شریعت نے تائید فرمائی ہے۔ اس موضوع پر انشاء اللہ آئندہ گفتگو کریں گے۔

۱۔ انبیاء کی بعثت، جانشینی کا تعین اور انسانوں کو مرنے کے بعد پھر سے زندہ کرنا، سب کے سب فعل الٰہی کے مظہر ہیں۔

تیسری اصل:

ہم عقائداوردینی احکام کے اثبات کے سلسلے میں معرفت کے تمام معتبر طریقوں سے استفادہ کرتے ہیں جن میں عقل ووحی دوخاص طریقے ہیں۔ وحی کا مطلب ہماری آسمانی کتاب قرآن مجیداوروہ احادیث ہیں کہ جنکی سند کا سلسلہ پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرختم ہوتا ہو۔ ائمہ اطہار علیہم السلام سے مربوط احادیث بھی سب کی سب ''سنت'' کے عنوان سے خدا کی حجت ہیں۔اس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔

عقل اوروحی ایک دوسرے کے حجت کی تائید کرتے ہیں۔اگر ہم عقل کے قطعی حکم سے وحی کی حجیت کوثابت کریں تو وحی بھی اسی طرح عقل کی حجیت کوایک خاص دائرہ میں تائید کرتی ہے۔

قرآن مجید بہت سے مواقع پرعقل کے فیصلے کی طرف متوجہ کرتا ہے اورانسان کوعجائباتِ خلقت کے بارے میں غوروفکر کی دعوت دیتا ہے اورخود بھی اپنی اس دعوت کوثابت کرنے کے لئے عقل سے مددلیتا ہے۔کوئی بھی آسمانی کتاب قرآن کے مانند عقلی دلائل پرمبنی معرفت کو اہمیت نہیں دیتی اورقرآن مجید میں معارف وعقائد کے سلسلے میں عقلی برہان ودلیلیں حد سے زیادہ موجود ہیں۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام نے بھی حجیت عقل پر، جن مقامات پرعقل فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو ،تاکید فرمائی ہے۔اورہمارے ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام نے وحی کوحجت ظاہری اورعقل کوحجت باطنی تعبیر کیا ہے(۱)۔

چوتھی اصل:

چونکہ وحی ایک قطعی دلیل ہے اورعقل بھی ایک چراغ ہے جسے خداوندکریم نے ہرانسان کے

۱۔ان اللہ علی الناس حجتین : حجۃظاھرۃ و حجۃ باطنۃ ، فاما الظاھرۃ فالرسل و الانبیاء و الائمۃ، و اما الباطنۃ فالعقول۔کلینی ،کافی ،ج۱/ص۱۶۔

اندر روشن کیا ہے، لہٰذا ان دو حجت الٰہی کے درمیان کسی صورت میں تعارض یا ٹکراو پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ اور اگر اتفاقاً کسی موقع پر ابتدائی مرحلے میں کسی قسم کا ٹکراو نظر آئے تو ہمیں جاننا چاہئے کہ یا اس موقع پر دین کے بارے میں ہمارا ادراک وتصور صحیح نہیں تھا یا دلیل عقلی کے مقدمات میں کوئی خطا سرزد ہوئی ہے۔ کیونکہ خداوند حکیم بشر کو ہرگز دو متعارض ومخالف راستوں کی دعوت نہیں دیتا۔

جس طرح ''عقل'' و ''وحی'' کے درمیان حقیقی معنی میں تعارض وٹکراو نہیں ہے، اس طرح ''علم'' و ''وحی'' کے درمیان بھی ہرگز تعارض نہیں پایا جاتا۔ اور اگر کسی موقع پر ان دو کے درمیان بھی کسی قسم کا تعارض اور اختلاف نظر آئے تو اس صورت میں بھی ہمیں جاننا چاہئے کہ دین کے بارے میں مذکورہ مورد میں ہمارا تصور درست نہیں تھا یا یہ کہ ہمارا علم قطعیت کے مرحلہ تک نہیں پہنچا ہے۔ غالباً تعارض کی علت یہی دوسری شق ہے کہ علمی مفروضہ کو جلد بازی میں قطعی علم تصور کیا جاتا ہے اور اس طرح تعارض کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

پانچویں اصل:

نظام ہستی پر حاکم قوانین، جو ہمارے افکار وتصورات سے جدا اور بالاتر ایک واقعیت ہیں، ایک واضح، ابدی اور لافانی حقیقت ہیں۔ اس اعتبار سے اگر انسان نے شناخت کے کسی ایک وسیلہ کے ذریعہ کسی حقیقت کا بعنوان ''حقیقت'' انکشاف کر لیا، تو کہنا چاہئے کہ وہ حق، ابدی، لافانی اور پائدار ہے۔ اور اگر کسی حقیقت کے انکشاف میں اس کا ایک حصہ حقیقت کے مطابق اور ایک حصہ خطا پر مبنی ہو تو وہ حصہ جو حقیقت کے مطابق ہے ابدی حقیقت ہے اور ماحول اور حالات

کے بدلنے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں عالم نسبیت در حقیقت اس معنی میں کہ ایک ہی معرفت وشناخت ایک وقت میں حقیقت کے عین مطابق ہو اور دوسرے وقت میں وہی غلط ہو، تکوین مسئلہ میں یہ بات قابل تصور نہی ہے۔ اگر ۴=۲+۲ ہیں تو قطعاً ہیں اور اگر نہیں ہیں تو بالکل نہیں ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی معرفت ایک مرحلہ میں عین حقیقت ہو اور دوسرے مرحلہ میں غلط ہو جائے۔

معرفت میں نسبیت صرف ایسے امور میں متصور ہے جن کی حقیقت انسان کے فکر واندیشہ اور اس کی توثیق وتائید تک محدود ہے۔ مثال کے طور پر ایسے معاشرے جو ملک کا نظم ونسق چلانے کے سلسلے میں وحی الٰہی سے الہام نہیں لیتے بلکہ اپنی حکومت کے طریقہ کار کے انتخاب میں مختار اور آزاد ہیں، وہ اگر ایک دن کسی ایک طریقہ کار پر اتفاق کرلیں تو جب تک اس مسئلہ پر اتفاق برقرار ہے، یہ طریقہ ایک حقیقت ہے اور اگر کسی دن اس کے خلاف کسی اور طریقہء کار پر اتفاق ہوا تو دوسرا طریقہ کار حقیقت ہو جائے گا۔ جبکہ ان دو شناختوں میں سے ہر ایک اپنی ظرفیت اور محدودیت میں عین حقیقت ہے۔ لیکن وہ امور جو انسانی ذہن سے باہر اپنے لئے مشخص مقام کے حامل اور حد بندی شدہ ہیں، اگر صحیح ڈھنگ سے فکر وادراک کے افق پر قرار پائیں تو ہمیشہ کے لئے صحیح اور محکم ہوں گے اور اس کے برعکس ہوں تو ہمیشہ کے لئے باطل اور بے بنیاد ہیں۔

اسلام کا نظریۂ وجود

چھٹی اصل:

اللہ کے علاوہ تمام کائنات مخلوقِ خدا ہے۔کائنات ایک لمحہ کے لئے بھی خداوند کریم سے بے نیاز نہ تھی اور نہ کبھی ہوگی۔یہ جو ہم کہتے ہیں کہ کائنات مخلوقِ خدا ہے، اس مفہوم و معنی میں ہے کہ، کائنات اللہ کے ارادہ سے وجود میں آئی ہے اور خالق ومخلوق کی نسبت باپ بیٹے کی جیسی نہیں ہے۔اس سلسلے میں خداوند متعال فرماتا ہے:

﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾ (اخلاص/۳)

''اس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ والد''

ساتویں اصل:

کائنات کا موجودہ نظام لافانی اور ابدی نہیں ہے، بلکہ ایک مدت کے بعد۔جس کے وقت وزمان سے صرف خدا ہی آگاہ ہے۔کائنات کا موجودہ نظام نابود اور ختم ہوگا اور ایک نیا نظام وجود میں آئے گا اور وہی نظام، معاد اور عالم آخرت ہے۔جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ

الْقَهَّارِ﴾ (ابراھیم ۴۸/)

''اس دن جب زمین دوسری زمین میں تبدیل ہوجائے گی اور آسمان بھی بدل دئے جائیں گے اور سب خدائے واحد وقہار کے سامنے پیش ہوں گے''۔

اور یہ فرمان الٰہی کہ:

﴿اِنَّالله وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ (بقرہ ۱۵۶/)

''ہم اللہ ہی کیلئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں''

اسی پوشیدہ حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

آٹھویں اصل:

کائنات کا نظام علت ومعلول کی بنیاد پر قائم ہے،اوراس کے مظاہر کے درمیان علت و معلول کا رابطہ برقرار ہے۔ہر وجود کا دوسرے وجود پر اثر انداز ہونا اذن ومشیت الٰہی پر مشروط ہے۔اور خداوند عالم کا حکیمانہ ارادہ اس امر پر استوار ہے کہ اپنی فیاضی وسخاوت کو زیادہ تر نظام علت ومعلول کے طریقے سے ہی عملی جامہ پہناتا ہے۔قرآن مجید نے ان دونوں مطالب کو بیان فرمایا ہے:

۱۔فطری مظاہر کے درمیان سببیت کا رشتہ قائم ہے۔

۲۔کائنات میں ہر علت ومعلول کا اثر اذن مشیت الٰہی پر استوار ہے۔

مطلب اول کے بارے میں کافی ہے کہ مندرجہ ذیل آیت کی طرف توجہ کی جائے:

﴿وَاَنْزَلْنَامِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَ خْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًالَكُمْ﴾(بقرہ۲۲/)

''اور پھر آسمان پانی برسا کر تمہاری روزی کے لئے زمین سے پھل نکالے''۔

اور مطلب دوم کے بارے میں مندرجہ ذیل آیت کی طرف توجہ کرنا کافی ہے:

﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَا تُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ﴾ (اعراف/۵۸)

''اور پاکیزہ زمین کا سبزہ بھی اس کے پروردگار کے حکم سے نکلتا ہے''۔

اور سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲، ۲۴۹ و ۲۵۱ اور سورہ ٔ آل عمران کی آیت ۴۹ اور ۱۶۶ بھی اسی مضمون کی حامل ہیں(۱)۔

نویں اصل:

وجود کی طبیعت صرف مادی نہیں ہے، بلکہ تخلیق کائنات کا ایک حصہ ماورائے طبیعت پر مشتمل ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اسے ''عالم غیب'' کہتے ہیں۔ جس طرح مادی مظاہر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح کچھ غیبی موجودات بھی عالم فطرت میں خدا کے اذن سے موثر ہیں اور دوسرے الفاظ میں یہ الٰہی فیض و برکات کے وسائل ہیں۔ عالم فطرت کے حوادث میں خدا کے فرشتوں کی اثر اندازی کے بارے میں قرآن مجید یوں ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْراً﴾ (نازعات/۵)

''قسم ہے (خلقت کائنات کے) امور کا انتظام کرنے والوں کی''

﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُم حَفَظَةً﴾ (انعام/۶۱)

''اور وہی خدا ہے جو اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم سب پر محافظ فرشتے بھیجتا ہے''

مذکورہ روشن اور واضح قرآنی آیات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جہان خلقت، طبیعی ہو یا

۱۔ اس سلسلے میں مزید آگاہی کیلئے تفسیر و کلام کی کتابوں من جملہ المیزان ۲/۱،۷، والہیات ۲/ ۵۱۔۵۴ کی طرف رجوع کیا جائے۔

ماورائے طبیعی اپنے اوپر حاکم نظام سببیت کے ساتھ مشیت الٰہی پر قائم اور اسی سے وابستہ ہے۔

دسویں اصل:

کائنات ایک ہدایت شدہ حقیقت ہے۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے رتبہ اور اپنی حالت کی مناسبت سے نور ہدایت سے بہرہ مند ہے۔ اس ہدایت کے مراتب کلی، فطری، جبلی اور تکوینی ہیں۔ قرآن کریم کی مختلف آیات میں ان تکوینی اور عمومی ہدایات کا ذکر آیا ہے۔ ہم یہاں پر ان میں سے ایک آیت کو نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں:

﴿رَبُّنَا الَّذِیٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾ (طٰہٰ/۵۰)

''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شئے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی اور پھر ہدایت بھی دی ہے''۔

گیارھویں اصل:

نظام خلقت، ایک مکمل اور بہترین نظام ہے ہستی کی مشینری کا خاکہ ایسی بہتر صورت میں کھینچا گیا ہے کہ اس سے بہتر و مکمل نظام خلقت کا تصور ممکن نہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿اَلَّذِیٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ﴾ (سجدہ/۷)

''اس نے ہر چیز کو حسن کے ساتھ (سب سے بہترین صورت میں) خلق کیا ہے''۔

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

﴿فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ﴾ (مومنون/۱۴)

''وہ خدا جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے''

مسلّم ہے کہ خالق کے احسن ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ مخلوق بھی احسن ہو۔

برہان عقلی جو اسی اصول پر قائم ہے، یہ ہے کہ ہر فاعل کا فعل کمال وعیب کی حیثیت سے اس کے صفات اور کمالات کے متناسب ہوتا ہے۔ اگر فاعل صفاتِ وجودی کے لحاظ سے بے عیب ہو تو اس کا فعل بھی ہر عیب ونقص سے پاک ومنزّہ ہوگا۔ چونکہ خداوند متعال کامل ترین صورت میں تمام کمالاتِ وجودی کا مالک ہے، لہٰذا فطری طور اس کا فعل بھی کامل ترین اور سب سے بہتر ہوگا۔

اس کے علاوہ خداوند متعال کے حکیم ہونے کا اقتضاء یہ ہے کہ کائنات کی بطور احسن خلقت کے امکان کی صورت میں اس کے برعکس عمل نہ کرے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ عالم فطرت میں جو چیز ''شرور'' کے نام سے ذکر ہوی ہے وہ نظام ہستی کے بہتر اور کامل ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس مطلب کی وضاحت ''خالقیت میں توحید'' کی آئندہ بحث میں آئے گی۔

بارہویں اصل:

چونکہ کائنات، مخلوق اور فعل خدا ہے اور خداوند متعال حقّ مطلق ہے۔ اسلئے اس کا فعل بھی حق، حکمت پر مبنی اور عبث وبیہودگی سے عاری ہے۔ اس مطلب کی طرف قرآن مجید کی کئی آیات میں اشارہ ہوا ہے، نمونہ کے طور پر ایک آیت کا ذکر کیا جاتا ہے:

﴿مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ﴾ (احقاف/۳)

''ہم نے آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی تمام مخلوقات کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے''

انسان اور کائنات کا مقصد اس وقت حقیقت کا لباس پہنے گا اور صحیح ثابت ہوگا جب قیامت برپا ہوگی۔ اس سلسلے میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''فَإِنَّ الغاية القيامة'' (۱)۔

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰۔

انسان، اسلام کی نظر میں

تیرہویں اصل:

انسان، جسم و روح سے مرکب ایک مخلوق ہے، مرنے کے بعد اس کا جسم تو گل سڑ جاتا ہے لیکن اس کی روح زندہ رہتی ہے۔ موت انسان کے لئے فنا و نابودی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے انسان قیامت تک برزخی زندگی گذارتا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف مراحل خصوصاً اسکا آخری مرحلہ کہ جو اس کی روح کو دوبارہ بدن میں پھونک دئے جانے سے شروع ہوتا ہے، کے بارے میں قرآن مجید میں یوں بیان فرماتا ہے:

﴿ثُمَّ أَنشَأْنَـٰهُ خَلْقًا ءَاخَرَ﴾ (مؤمنون/۱۴)

''پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنادیا''

اس کے علاوہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں انسان کی برزخی زندگی کے بارے میں اشارہ ہوا ہے اور من جملہ فرماتا ہے:

﴿وَمِن وَرَآئِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ (مؤمنون/۱۰۰)

''اور ان کے پیچھے ایک عالم برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے''۔

عالم برزخ کی زندگی سے متعلق اتنی آیات بیان ہوئی ہیں کہ یہاں پر اُن سب کا ذکر کرنا

آسان نہیں۔

چودہویں اصل:

ہر انسان توحیدی اور خدا کی پاک فطرت پر خلق کیا جاتا ہے۔اس لحاظ سے اگر وہ اسی حالت میں آگے بڑھے اور بیرونی اسباب اس کو منحرف نہ کریں، تو وہ راہ حق کو طئے کرلے گا۔کوئی بھی انسان پیدائشی طور خطا کار، گنہکار اور بدخواہ نہیں ہوتا بلکہ ناپاکی اور بری خصلتیں عارضی، اتفاقی اور بیرونی اثرات کا سبب ہوتی ہیں۔اس کی موروثی قبیح عادات وذہنیتیں بھی ایسی نہیں ہیں جو انسانی ارادہ وخواہش کے نتیجہ میں تبدیل ہونیوالی نہ ہوں۔لہٰذا آجکل کے عیسائیوں کا یہ اعتقاد کہ ''گناہ، فرزندان آدم کی فطر میں ہے''۔بالکل بے بنیاد ہے۔

قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (روم/۳۰)

''آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں (اور باطل سے کنارہ کش رہیں) یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلے میں فرمایا:

''مامن مولود الّا یولد علیٰ الفطرة'' [۱]

''کوئی مولود ایسا نہیں جو پاک فطرت (خدائے یکتا کی پرستش کرنے والا) پیدا نہ ہو''۔

پندرھویں اصل:

انسان ایک مختار اور قدرت والا اور صاحب انتخاب مخلوق ہے۔یعنی وہ عقل کی طاقت سے

۱۔توحید صدوق،ص ۳۳۱)

کسی کام کو مختلف پہلوؤں سے جانچ پڑتال کے بعد انجام دینے یا ترک کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿إِنَّا هَدَيْنَـٰهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ (انسان/۳)

''یقیناً ہم نے اسے راستہ کی ہدایت دیدی ہے چاہے وہ شکر گذار ہو جائے یا کفران نعمت کرنے والا ہو جائے''۔

اور ایک جگہ یوں فرماتا ہے:

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (کہف/۲۹)۔

''اور کہدو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے''۔

سولہویں اصل:

انسان فطرت سلیم اور عقل کی طاقت کا مالک ہے، اس لئے برے بھلے کی تمیز کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اختیار وانتخاب کا بھی مالک ہے۔ اس لحاظ سے انسان تربیت وتہذیب کو قبول کرنے والی مخلوق ہے۔ اور ہر وقت اس کے لئے نشو ونما، ترقی اور خدا کی طرف لوٹنے یعنی توبہ کرنے کا دروازہ موت کی گھڑی تک کھلا رہتا ہے۔ لیکن موت کا لمحہ آن پہنچنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے پیغمبروں کی دعوت عمومی اور پوری بشریت کے لئے ہوتی تھی، حتیٰ فرعون جیسے افراد تک کے لئے بھی۔ جیسا کہ خداوند کریم فرماتا ہے:

﴿فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ. وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ﴾ (نازعات/۱۹-۱۸)

''(اے موسیٰ) اس (فرعون) سے کہو، کیا ممکن ہے تو پاکیزہ کردار ہو جائے

اور میں تجھے تیرے رب کی طرف ہدایت کروں اور تیرے دل میں خوف پیدا ہو جائے"۔

انسان کو کسی صورت میں رحمت و مغفرت الٰہی سے ناامید اور مایوس نہیں ہونا چاہئے۔اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَاتَقْنَطُوامِن رَّحْمَةِاللهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُالذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾ (زمر/۵۳)

"رحمت خدا سے مأیوس نہ ہونا اللہ تمام گناہوں کا معاف کرنے والا ہے"۔

سترہویں اصل:

انسان چونکہ نورِ عقل اور اختیار کی نعمت کا مالک ہے،اس لئے ایک ذمہ دار اور جوابدہ مخلوق ہے۔وہ خدا کے سامنے،پیغمبروں اور رہبران الٰہی کے سامنے،اپنی انسانیت کے سامنے،دنیا کے دوسرے انسانوں کے سامنے اور کائنات کے سامنے جوابدہ ہے۔قرآن مجید نے بشر کی اس حیثیت کے سلسلے میں بہت سی آیات میں وضاحت فرمائی ہے:

﴿أَوْفُواْ بِالْعَهْدِاِنَّ الْعَهْدَكَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (اسراء/۳۴)

"اپنے عہدوں کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا"۔

اور ایک جگہ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُوْلٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (اسراء/۳۶)

"روز قیامت سماعت،بصارت اور قلب سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا"

مزید فرماتا ہے:

﴿أَيَحْسَبُ الْإِنسَٰنُ أَن يُتْرَكَ سُدًى﴾ (قیامت/۳۶)

''کیا انسان کا خیال ہے کہ اسے اسی طرح آزاد چھوڑ دیا جائیگا؟''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کل کم راعٍ وکل کم مسئولٌ عن رعية

''تم سب حاکم ہو اور اپنی رعایا کے بارے میں بھی مسئول اور جوابدہ ہو''(۱)۔

اٹھارویں اصل:

کوئی بھی انسان دوسرے انسان پر فضیلت وبرتری نہیں رکھتا مگر یہ کہ معنوی کمالات کا مالک ہو۔ زندگی کے ہر شعبے میں فضیلت وبرتری کا واضح اور روشن معیار تقوی اور پرہیزگاری ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿يَٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ﴾ (حجرات/۱۳)

''انسانو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دیئے ہیں تا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے''۔

اس لئے اسلامی نظریہ کے مطابق نسلی اور جغرافیائی اور دوسری خصوصیات، برتری، افتخار اور فضیلت کی بنیاد قرار نہیں دیئے جاسکتے۔

۱۔ مسند احمد: ۲/۵۴، صحیح بخاری: ۲/۲۸۴ (کتاب الجمعہ، باب ۱۱، حدیث ۲)۔

انیسویں اصل:

اخلاقی قدریں، حقیقت میں انسانیت کے اصول ہیں اور فطری بنیادوں کے حامل ہیں، یہ اصول محکم اور ابدی ہیں، زمانہ کا بدلاؤ اور سماجی تغیرات ان میں تبدیلی نہیں لا سکتے۔ مثال کے طور پر عہد و پیمان کی وفاداری یا نیکی کا جواب نیکی سے دینا، ایسے جاودانی امور ہیں کہ جب تک انسان رہے گا ان اخلاقی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اسی طرح خیانت اور وعدہ خلافی جیسے اعمال کا برا ہونا بھی ایسے ہی ابدی اصول میں سے ہے جو تبدیل نہیں ہوں گے۔ اس لحاظ سے نظریہ عقل کے مطابق انسان کی سماجی زندگی میں اصول و قواعد کا ایک سلسلہ موجود ہے جو انسان کی فطرت اور طینت میں ملا ہوا ہے اور محکم و پائدار ہے۔

ان اخلاقی اصولوں کے علاوہ بھی آداب و رسومات کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے کہ زمان و مکان کے شرائط ان پر اثر انداز ہو کر ان کو تغیر و تبدل سے دوچار کرتے ہیں۔ ان کا ابدی اور نا قابل تغیر اصولوں سے کسی قسم کا ربط نہیں ہے۔

قرآن مجید چند محکم و پائدار اخلاقی و عقلی اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَنِ إِلَّا الْإِحْسَنُ﴾ (رحمٰن/۶۰)

''کیا احسان کا بدلہ احسان کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟''

﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِن سَبِيلٍ﴾ (توبہ/۹۱)

''نیک کردار لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہوتا''۔

﴿فَإِنَّ اللهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (یوسف/۹۰)

''اللہ نیک عمل کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے''۔

﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَنِ وَإِيتَآىءِ ذِى الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ﴾ (نحل/۹۰)

''بیشک اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم

دیتا ہے نیز بدکاری، ناشائستہ حرکات اور ظلم سے منع کرتا ہے''۔

بیسویں اصل:

اگر چہ انسان کے اعمال کے عوض اسے دوسری دنیا میں صلہ یا سزا ملیگی، لیکن اس دنیا میں بھی وہ خوب وبد کے نتائج سے دوچار ہوگا۔ نتیجہ کے طور پر دنیوی حوادث کا ایک حصہ انسان کے اعمال کا ردعمل ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے وحی الٰہی نے پردہ اٹھادیا ہے اور انسان کا علم بھی کسی حد تک اس سے آگاہ ہوا ہے۔ قرآن مجید میں اس سلسلے میں بہت سی آیات موجود ہیں، ہم یہاں پر ان میں سے صرف دو آیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

﴿وَلَوْاَنَّ اَهْلَ الْقُرَىٰٓ ءَ امَنُواْوَتَّقَواْ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُواْ فَاَخَذْنَٰهُم بِمَاكَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (اعراف/۹۶)

''اور اگر آبادیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین اور آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے (آیات الٰہی کی) تکذیب کی تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی گرفت میں لے لیا۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی امت کو یاددہانی کراتے ہیں کہ گناہوں سے دوری نیز رحمت الٰہی کے دروازے کھلنے اور خدا کی نعمتوں میں اضافہ ہونے کے درمیان ایک رابطہ ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُواْ رَبَّكُمْ اِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا.يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا.وَيُمْدِدْكُم بِاَمْوَٰلٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّٰتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ اَنْهَٰرًا﴾ (نوح/۱۲-۱۰)

''میں نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اپنے پروردگار سے استغفار کرو وہ بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر موسلادھار پانی برسائے گا، اموال واولاد کے ذریعہ تمہاری مدد کرے گا اور تمارے لئے باغات اور نہریں قرار دے گا''۔

اکیسویں اصل:

چند بیرونی عوامل کو چھوڑ کر، قوموں کی ترقی یا پسماندگی دراصل ایسے اسباب وعلتوں کا نتیجہ ہے کہ جن کی جڑیں خود ان قوموں کے عقائد، اخلاق اور کردار میں پیوست ہیں۔ یہ اصل قضاو قدر الٰہی سے بھی منافات نہیں رکھتی، کیونکہ یہ قاعدہ خود تقدیر الٰہی کے مجموعی مقاصد کا ایک مظہر ہے۔ یعنی مجموعی طور سے مشیت الٰہی کا انحصار اس پر ہے کہ قومیں اپنے عقائد ورفتار وکردار کے ذریعہ اپنی قسمتوں کا تعین کریں۔ مثال کے طور پر اگر ایک معاشرہ اپنے سماجی تعلقات کو عدل وانصاف پر مبنی اصولوں پر قائم کرے تو اسے نیک بختی اور آرام وآسائش والی زندگی میسّر ہوگی۔ اور جو قوم اپنے تعلقات کو اس کے برعکس قائم کرے تو اس کی قسمت میں بدنصیبی اور سختی ہوگی۔ یہ وہی قائدہ ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں ''الٰہی سنتوں'' کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

﴿فَلَمَّا جَآءَ هُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا. اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّءِ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّءُ إِلَّا بِأَهْلِهِ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَبْدِيلًا وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَحْوِيلًا﴾ (فاطر/۴۳-۴۲)

''لیکن جب وہ ڈرانے والا آ گیا تو سوائے نفرت کے کسی شے میں اضافہ نہیں ہوا۔ یہ زمین میں استکبار اور بڑی چالوں کا نتیجہ ہے حالانکہ بڑی

چالیس چالباز ہی کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔تو کیا اب یہ گزشتہ لوگوں کے بارے میں خدا کے طریقہ کار کے علاوہ کسی اور چیز کا انتظار کررہے ہیں؟اور خدا کا طریقہ کار کبھی بدلنے والا نہیں ہے اور نہ اس میں کسی طرح کا تغیر ہوسکتا ہے''۔

﴿وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ...وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران/۱۴۰۔۱۳۹)

''...اگرتم صاحب ایمان ہوتو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے۔اورہم تو (کامیابی اور شکست کو) زمانے کے لوگوں کے درمیان الٹتے پلٹتے رہتے ہیں...''

بائیسویں اصل:

تاریخ بشر کا مستقبل روشن وتابناک ہے۔یہ بات صحیح ہے کہ انسانی زندگی بیشتر ناانصافیوں اور نامنظم حالات سے دوچار رہی ہے،لیکن یہ حالت پائدار نہیں ہے، بلکہ تاریخ بشر ایک روشن مستقبل کی طرف رواں دواں ہے جسمیں عدل وانصاف کی بنیاد پر حکمرانی ہوگی اور قرآن مجید کی تعبیر میں صالح و نیک بندے زمین پر حکمرانی کریں گے۔جیسے کہ فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ﴾ (انبیاء/۱۰۵)

''اورہم نے ذکر (شاید مقصد تورات ہو) کے بعد زبور میں بھی لکھ دیا ہے کہ ہماری زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے''۔

مزید فرماتا ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم

﴿فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (نور/۵۵)

''اللہ نے تم میں سے صاحبان ایمان اور عمل صالح کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں روئے زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے والوں کو بنایا ہے''۔

اس لحاظ سے تاریخ کے مستقبل میں حق و باطل کی مسلسل جنگ بالاخر حق کی فتحیابی پر تمام ہوگی، جس قدر بھی یہ جنگ طولانی ہو۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبٰطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ (انبیا/۱۸)

''ہم تو حق کو باطل کے سر پر دے ماریں گے اور اس کے دماغ کو کچل دیں گے اور وہ تباہ و برباد ہو جائے گا''۔

تیئسویں اصل:

قرآن مجید کی روشنی میں، انسان خصوصی عظمت کا مالک ہے، اس حد تک کہ فرشتوں کو اسے سجدہ کرنے کا حکم ہوا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا﴾ (اسرا/۷۰)

''اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی اور انھیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے، اور انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے''

چونکہ انسانی زندگی کی اساس عظمت اور عزت نفس کی حفاظت پر مبنی ہے، اس لئے ہر وہ کام جس سے یہ نعمت الٰہی داغدار ہوتی ہو، اسلام کی نظر میں منع ہے۔ اس کا واضح الفاظ میں یہ

مقصد ہے کہ ہر قسم کا ناجائز تسلط جمانا یا یہ تسلط قبول کرنا سخت منع ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

ولاتکن عبدغیرک وقدجعلک اللہ حرّا(۱)۔

''کسی دوسرے کا غلام نہ بن جاؤ، کیونکہ خدا نے تمہیں آزاد خلق کیا ہے''۔

مولائی کائنات علیہ السلام ایک اور جگہ پر یوں فرماتے ہیں:

انّ اللہ تبارک وتعالی فوّض الی المؤمن کلّ شیءٍ الّا اذلال نفسہ(۲)۔

''خدا نے مؤمن کے تمام کام بجز اس کے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے خود اسی کے سپرد کردئے ہیں۔ (یعنی اسے ان کے انجام دینے یا ترک کرنے میں مختار بنایا ہے)''

یہ امر واضح ہے کہ شرعی اور الٰہی حکومتیں اس قانون کے ساتھ ٹکراؤ نہیں رکھتیں اس کی وضاحت اگلی بحث میں آئے گی۔

چوبیسویں اصل:

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کی عقلی حیات خصوصی مقام ومنزلت کی حامل ہے۔ کیونکہ انسان کا دیگر حیوانات سے فضیلت وامتیاز کا معیار اس کی عقل اور قوت فکر ہے۔ اسی وجہ سے بہت سی قرآنی آیات میں انسان کو غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے اور مظاہر خلقت میں غور وفکر کے پروان چڑھانے کو عقلمندوں کی خصوصیات میں شمار کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

۱۔ نہج البلاغہ، خط نمبر ۳۸۔

۲۔ رسائل الشیعہ :۱۱/۴۲۴، کتاب امر بہ معروف باب۱۲ ج۴۔

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بٰطِلًا﴾ (آل عمران/۱۹۱)

''جولوگ اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں کہ خدایا تونے یہ سب بیکار نہیں پیدا کیا ہے''۔

مظاہر خلقت اور آیات الٰہی کے بارہ میں غور وفکر کرنے سے مربوط آیتیں بہت سی ہیں۔ یہاں پر ان سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ ایسے ہی نظریات کی بناء پر قرآن مجید انسانوں کو اپنے اسلاف کی اندھی تقلید کرنے سے منع کرتا ہے۔

پچیسویں اصل:

اسلام میں اقتصادی، سیاسی اور اس طرح کے دیگر مسائل کی قلمرو میں انفرادی آزادیاں اس امر پر مشروط ہیں کہ یہ اخلاقی ومعنوی عظمتوں اور قدروں سے ٹکراؤ نہ رکھتی ہوں اور عمومی مصلحتوں کو پائمال نہ کریں۔ حقیقت میں اسلام میں ''فریضہ'' کا فلسفہ یہی ہے کہ انسان کو (قوانین کا) پابند کر کے اسکی انفرادی عظمت کی حفاظت کی جائے اور عمومی مصلحتوں کی ضمانت فراہم ہو۔ اسلام میں بت پرستی، شراب نوشی اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی ممانعت انسان کی عظمت اور اس کے تقدس کی حفاظت کے لئے ہے، اسی سے اسلام کے تعزیراتی قوانین کا فلسفہ بھی واضح ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے قانونِ قصاص کے نفاذ کو انسان کی حیات کے اسباب سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰاُولِي الْاَلْبٰبِ﴾ (بقرہ/۱۷۹)

''صاحبانِ عقل! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے''۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انّ المعصیة اذا عمل بها العبد سرًّا لم یضرّ الّا عاملها فاذا عمل بها علانیة ولم یغیّر اضرّت بالعامة.

''اگر کوئی شخص مخفی طور پر کسی گناہ کا مرتکب ہوجائے تو اس کا نقصان اس کی ذات تک محدود ہے، لیکن اگر اسے کھلم کھلا انجام دے اور کوئی اس پر اعتراض نہ کرے تو اس کا نقصان عوام الناس کو پہنچتا ہے''۔

اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

ذٰلک انه یذلّ بعمله دین الله ویقتدی به اهل عداوة الله

''اس امر کی علت یہ ہے کہ گناہ کو کھلم کھلا اور لوگوں کے سامنے انجام دینے والا اپنے اس طرز عمل سے دین خدا کے تقدس کو پائمال کرتا ہے اور خدا کے دشمن اس کی اطاعت کرتے ہیں''۔(۱)

چھبیسویں اصل:

اسلام میں انفرادی آزادی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ دین کو قبول کرنے میں کسی طرح کا جبر و اکراہ نہیں ہے، جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّینِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ﴾ (بقرہ/۲۵۶)

''دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہوچکی ہے''۔

کیونکہ اسلام میں دین سے مراد ایمان اور یقین قلب ہے، اور یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ تشدد اور زور و زبردستی سے انسان کے دل میں ڈال دی جائے۔ بلکہ اس کا دارومدار مقدمات کے

۱۔ وسائل الشیعہ: ۱۱/ ۴۰۷ کتاب الامر بالمعروف باب ۴، حدیث ۱۔

طور پر چند سلسلہ وار شرائط کے حاصل ہونے پر منحصر ہے کہ ان میں سے اہم ترین حق و باطل کا واضح ہونا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ عام حالات میں انسان حق کا انتخاب کرتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ''جہاد'' ایک اہم اسلامی فریضہ ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسروں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، بلکہ ''جہاد'' کا مقصد یہ ہے کہ پیغام الٰہی کو دنیا والوں تک پہنچانے کی راہ میں موجود رکاوٹوں کو دور کیا جائے تا کہ ''تبیّن الرشد'' کی حقانیت واضح ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ زر و زور کے سوداگر اپنے مادی اور شیطانی اغراض و مقاصد کی بناء پر دین کے آزادی بخش پیغام کو دنیا والوں تک پہنچانے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ فلسفہ نبوت یعنی بشر کے لئے ہدائت و راہنمائی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جہاد کرنے والے ہر قسم کی رکاوٹوں کو راستے سے ہٹائیں تا کہ پیغام حق کو لوگوں تک پہنچانے کے شرائط فراہم ہو جائیں۔

گذشتہ بحثوں میں انسان اور کائنات کے بارے میں اسلام کا نظریہ واضح ہوا اس سلسلے میں چند اور اصول و نکات ہیں جن کا ذکر بھی مناسب جگہ پر ہوگا۔ اب ہم اسلام کی نظر میں عقائد و احکام کی بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

دوسرا حصہ

عقائد کے کلّیات

(۱)

توحید اور اس کے مراتب

۲۷ویں اصل:

خدا کے وجود پر اعتقاد، تمام آسمانی ادیان کا مشترک اصول ہے۔حقیقت میں الٰہی انسان (جس دین کا بھی پیرو ہو) اور مادی شخص کے درمیان امتیازی فرق اسی امر میں پوشیدہ ہے۔قرآن مجید وجود خدا کو ایک ایسا واضح و روشن امر سمجھتا ہے، جو کسی دلیل و ثبوت کا محتاج نہیں۔اور قرآن اس سلسلے میں ہر قسم کے شک وشبہہ کو بے جا سمجھتا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

﴿أَفِي اللهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ﴾ (ابراھیم/۱۰)

''کیا تمہیں اللہ کے بارے میں بھی شک ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے؟''

خدا کا وجود واضح اور روشن ہوتے ہوئے بھی قرآن مجید نے ایسے افراد کے لئے راستے کھلے رکھے ہیں جو فکر و اندیشہ اور دلیل کے ذریعہ خدا کو پہچاننا چاہتے ہیں، تاکہ اپنے ذہنوں سے ممکنہ شک وشبہہ کو دور کرسکیں۔ان میں سب سے اہم طریقہ ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں:

۱۔غیر معمولی حالات میں انسان کا اپنے سے بالاتر کسی ہستی کے وجود سے تعلّق اور ضرورت کا احساس کرنا، یہ فطرت کی وہی آواز ہے کہ جو اسے ابتدائے تخلیق کی طرف دعوت دیتی ہے۔اس سلسلے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّینِ حَنِیفًا فِطْرَتَ اللهِ الَّتِی فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا﴾ (روم/۳۰)

''آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے''۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاِذَا رَکِبُوا فِی الْفُلْکِ دَعَوُا اللهَ مُخْلِصِینَ لَهُ الدِّینَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَی الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِکُونَ﴾ (عنکبوت/۶۵)

''پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور جب کشتی سمندری طوفان میں غرق ہونے کو ہوتی ہے) تو ایمان وعقیدہ کی پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو فوراً شرک اختیار کر لیتے ہیں''۔

۲۔ عالم فطرت کے مطالعہ کی دعوت اور اس کے عجائبات کے بارے میں غور وفکر کرنا، وجود خدا کی روشن اور واضح نشانیاں ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کائنات کی تخلیق میں ایک حکیمانہ علم وقدرت وتدبیر والے خالق کا عمل دخل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلٰفِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبٰبِ﴾ (آل عمران/۱۹۰)

''بیشک زمین وآسمان کی خلقت اور رات، دن کی آمد ورفت میں صاحبان عقل کے لئے قدرتِ خدا کی نشانیاں ہیں''۔

اس موضوع سے قرآن مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں، لیکن ہم یہاں پر بطور نمونہ اسی ایک آیت کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

مسلّم طور سے ہمارے بیان کا مطلب یہ نہیں کہ خدا شناسی کے سلسلے میں فقط یہی دو طریقے

ہیں، جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، بلکہ وجود خدا کے ثبوت کے سلسلے میں بہت سے دلائل و براہان موجود ہیں جن کا مفصل ذکر اسلامی متکلمین نے اپنی کلامی کتابوں میں کیا ہے۔

توحید کے مراتب:

تمام آسمانی ادیان کی بنیاد توحید اور ایک خدا کی پرستش پر قائم ہے اور ان کے درمیان واضح ترین مشترک اصول خدا کی وحدانیت پر اعتقاد ہے، اگرچہ بعض ادیان کے پیروؤں کے درمیان اس مشترکہ اصول میں بھی کچھ انحرافات پائے جاتے ہیں۔

ذیل میں ہم قرآن و اسلامی احادیث اور عقلی براہان کی مدد سے توحید کے مراتب بیان کرتے ہیں۔

۲۸ ویں اصل:

توحید کا پہلا مرتبہ، ''توحید ذاتی'' ہے۔ توحید ذاتی کی دو تفسیریں ہیں:

الف: خدا کی ذات یکتا ہے۔ اس کے مانند کوئی نہیں اور اُس جیسا اور اس کا ہم مرتبہ کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ب: خداوند کریم کی ذات ''بسیط'' ہے اس میں کسی قسم کی کثرت اور ترکیب ممکن نہیں۔

مولائے کائنات امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام مذکورہ دو معنی کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

۱۔ھو واحدٌ لیس له فی الاشیاء.

''وہ یکتا ہے اور موجودات میں اس کا کوئی مانند و نظیر نہیں''۔

۲۔وانّه عزّوجل احدیّ المعنی لاینقسم فی وجودٍ ولاوهمٍ

ولاعقل(۱).

''وہ ''احدی المعنیٰ'' ہے۔یعنی نہ خارج میں اور نہ وہم وعقل میں اس کا وجود کسی بھی طرح تقسیم نہیں ہوسکتا''۔

سورہ توحید جو توحید کے بارے میں مسلمانوں کے عقیدہ کا ترجمان ہے میں مذکورہ دومرحلوں کی طرف اشارہ ملتا ہے:

پہلے مرحلہ میں اس آیت میں:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (اور اس کا کوئی کفو، ہمسر نہیں ہے۔)

اور دوسرے مرحلہ میں اس آیت میں.

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ (اے رسول کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے۔)

مذکورہ بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلامی منطق کے مطابق مسیحیت کی تثلیث (باپ، بیٹا اور روح القدس) کا عقیدہ باطل ہے اور قرآن مجید کی کئی آیات میں اس عقیدہ کے صحیح نہ ہونے کی دلائل بیان کی جاچکی ہیں۔کلامی کتابوں میں بھی اس سلسلے میں مفصل بحث ہوئی ہے اس لئے ہم یہاں پر صرف ایک وضاحت پر اکتفا کرتے ہیں:

''تثلیث''یعنی تین خداؤں کا عقیدہ، دو حالت سے خالی نہیں ہے: یا یہ تینوں خدا مستقل وجود و شخصیت کے مالک ہیں، یعنی ہر ایک خدا الوہیت کے تمام شرائط کا حامل ہے۔اس صورت میں توحید ذاتی (اس جیسا کوئی نہیں ہے) سے تضاد پیدا ہوتا ہے۔یا یہ تینوں خدا ایک ہی شخصیت ہیں اور ہر ایک اس شخصیت کا جزء ہے۔اس صورت میں لازم آتا ہے کہ اس شخصیتِ واحد کو مرکب سمجھا جائے اور اس طرح ''توحید ذاتی'' کے دوسرے مفہوم یعنی (بسیط) سے تضاد اور ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔

۱۔توحید،صدوق،ص۸۴،باب ۳،حدیث ۳۔

۲۹ ویں اصل:

توحید کا دوسرا مرتبہ، خدا کے ذاتی صفات میں توحید ہے۔ ہم خداوند متعال کو تمام صفات کمالی کا مالک سمجھتے ہیں اور ذات باری تعالیٰ میں ان کمالات کے وجود پر عقل اور وحی دلالت کرتے ہیں۔ اس بنا پر خداوند متعال، عالم، قادر، حی، سمیع، بصیر و... ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے یہ صفات ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ جو کچھ ہم کلمۂ ''عالم'' سے سمجھتے ہیں، اس سے مختلف ہے جو کلمۂ ''قادر'' سے سمجھتے ہیں لیکن قابل ذکر مطلب کچھ اور ہے اور جس طرح یہ صفات مفہوم و معنی میں ایک دوسرے سے تضاد رکھتے ہیں، کیا حقیقت خارجی میں، یعنی وجود باری تعالیٰ میں بھی یہ صفات اختلاف رکھتے ہیں یا متحد ہیں؟

جواب میں کہنا چاہئے کہ چونکہ مذکورہ صفات میں تضاد، ذات باری تعالیٰ میں کثرت و ترکیب کے لازمہ کا باعث بن سکتے ہیں، اس لئے قطعی طور پر ایسا ہے کہ مذکورہ صفات مفہوم میں تضاد رکھنے کے باوجود مقامِ حقیقت میں وحدت کے حامل ہیں۔ دوسرے الفاظ میں خدا کی ذات بسیط ہونے کے باوجود ان تمام کمالات کی مالک ہے اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی ذات کا ایک حصہ علم، دوسرا حصہ قدرت اور تیسرا حصہ حیات کو تشکیل دیتا ہو۔ محققین کی نظر میں:

بل هو علمٌ وقدرة كلّه وحياةٌ كله...(۱)

''ذات باری تعالیٰ کمالِ علم، کمال قدرت اور کمال حیات کی مالک ہے''۔

اس لئے خداوند متعال کے صفاتِ ذاتی، قدیمی و ازلی ہونے کے باوجود، عین ذات الٰہی ہیں۔ اور جو لوگ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ حق تعالیٰ کے صفات ازلی و قدیمی ہیں لیکن ذات باری تعالیٰ سے زائد ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ حقیقت میں اس نظریہ کا سرچشمہ صفات خدا کی انسان سے تشبیہ کا نتیجہ ہے۔ چونکہ انسان کے صفات اس کی ذات پر زائد ہیں اسلئے تصوّر کیا گیا ہے کہ خدا میں بھی ایسا ہی ہے۔

۱۔ صدر المتألّہین، اسفار اربعہ ج ۶، ص ۱۳۵۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لم یزل اللّٰہ جلّ وعزّ ربنا والعلم ذاته ولامعلوم، والسمع ذاته و لامسموع ، و البصر ذاته و لامبصر، و القدرته ذاته ولامقدور

''خداوندمتعال ازل سے ہمارا پروردگار تھااور قبل اس کے معلوم، مسموع، مبصر اور مقدور وجود میں آئیں، علم، سمع، بصر اور قدرت اس کی عین ذات تھے''۔(۱)

امیر المؤمنین علی علیہ السلام خداوندمتعال کے صفات اوراس کی ذات میں وحدت کے سلسلے میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:

وکمال الاخلاص له نفی الصفات عنه، لشهادة کل صفة انّها غیر الموصوف وشهادة کل موصوف انّه غیر الصفة (۲)

توحید میں کمالِ اخلاص یہ ہے کہ (زائد برذات) صفات کی نفی کریں۔ کیونکہ ہرایک صفت اپنے موصوف سے اختلاف اور ہرایک موصوف، صفت سے جدائی کی گواہی دیتا ہے۔(۳)

۱۔ توحید صدوق، ص۱۳۹، باب ۱۱، حدیث ۱۔

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۔

۳۔ بعض اشخاص نے ناآگاہی کی بناء پر اس نظریہ کو ''معطلہ'' کا نظریہ قرار دیا ہے، جبکہ حقیقت میں ''معطلہ'' ان لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ جو صفات جمال کو ذات خدا سے لاینفک ودائی نہیں جانتے ہیں۔ نتیجہ میں ذات خدا کو کمالات وجودی سے عاری سمجھتے ہیں۔ اس عقیدہ ناصحیح کا ''نظریہ عینیت'' یعنی ذات کے ساتھ صفات کی عینیت سے کوئی ربط نہیں ہے۔ بلکہ ''نظریہ عینیت'' (یعنی صفات خدا عین ذات ہیں) اس قول سے منزّہ ومبرّا ہے کہ صفاتِ خدا پر زائد ہیں۔

۳۰ویں اصل:

توحید کا تیسرا مرتبہ، خالقیت میں ''توحید'' ہے۔ یعنی خداوند متعال کے بغیر کسی اور خالق کا وجود نہیں ہے۔ جو بھی شئے وجود میں آتی ہے، مخلوق ہے اور خدا ہی اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ قرآن مجید توحید کے اس رتبہ پر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

۱۔﴿قُلِ اللهُ خَلِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (رعد/۱۶)

''کہد یجئے کہ اللہ ہی ہر شئے کا خالق ہے اور وہی یکتا اور سب پر غالب ہے''۔

۲۔﴿ذَلِكُمُ اللهُ رَبُّكُمْ خَلِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَّا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ (غافر/۶۲)

''وہی تمہارا پروردگار ہے جو ہر شے کا خالق ہے اور اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے''۔

وحی کے علاوہ عقل بھی ''خالقیت'' میں توحید کی گواہی دیتی ہے، کیونکہ ماسوا اللہ (خدا کے بغیر) کائنات کی ہر شے ممکن اور محتاج ہے، اور فطری طور ہر شے کی حاجت روائی اور اس کے وجود کی نیازمندیوں کو پورا کرنا خدا کی طرف سے ہے۔

خالقیت میں ''توحید''، نظام ہستی میں اصول سببیت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ امکانی مظاہر کا ایک دوسرے میں اثر انداز ہونا، اذن الٰہی پر منحصر ہے اور سبب کا وجود اور اشیاء کی سببیّت۔ دونوں۔ ارادہ الٰہی کے مظاہر ہیں۔ یہ خدا کی ہی ذات ہے کہ جس نے سورج اور چاند کو گرمی اور چمک عطا کی ہے اور اگر وہ چاہے تو یہ اثرات ان سے سلب کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ یکتا اور بے مثال خالق ہے۔

جس طرح اس کتاب کی آٹھویں اصل میں اشارہ ہوا، قرآن مجید نے بھی سببیت کے نظام کی تائید فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اللهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ (روم/۴۸)

''اللہ ہی وہ ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے تو وہ بادلوں کو اڑاتی ہیں پھر وہ ان بادلوں کو جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے''۔

مذکورہ آیت میں بادلوں کو حرکت دینے اور ادھر اُدھر پھیلا دینے میں ہواؤں کے اثر کا واضح طور پر ذکر ہوا ہے۔

تمام مظاہر کا خدا کی خالقیت کے دائرے میں شامل ہونا ہرگز یہ معنی نہیں رکھتا کہ خدا کے بندوں سے انجام پانے والے برے کام کو بھی خدا کی طرف نسبت دی جائے۔ ہر مظہر، اس لحاظ سے کہ ایک ممکنہ موجود ہے، خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ مطلق کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ لیکن انسان کے بارے میں اس بات کا بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ چونکہ وہ ایک مختار (اختیار انسان کے سلسلے میں عدل کی بحث میں وضاحت کریں گے) اور صاحب ارادہ وجود ہے اور اپنے کام میں تقدیر الٰہی کے ساتھ ذاتی طور پر فیصلہ کی قوت بھی رکھتا ہے، اسلئے اطاعت ومعصیت (نافرمانی) کے لحاظ سے کسی کام کی انجام دہی اس کے اپنے فیصلہ اور ارادہ پر منحصر ہے۔

دوسرے لفظوں میں، خداوند متعال ہستی بخش ہے، ہستی، مطلق صورت میں اس سے مربوط ہے اور اُسی سے استناد ہوتی ہے، اس لحاظ سے کوئی قباحت درکار نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿أَلَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ﴾ (سجدہ/۷)

''اس نے ہر چیز کو حسن کے ساتھ (سب سے بہتر صورت میں) خلق کیا ہے''۔

لیکن یہ انسان کے اختیار وارادہ پر منحصر ہے کہ کسی کام کی انجام دہی کا فیصلہ عقل وشرع کے معیاروں کے مطابق انجام دے یا اُن کے خلاف۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے مثال کے طور پر انسان کے دو کام ''کھانا'' اور ''پینا'' تصور میں لائے جاسکتے ہیں۔ دونوں کام اس لحاظ سے کہ ہستی کا حصہ ہیں، خدا سے ربط رکھتے ہیں، لیکن اس جہت سے کہ ان دونوں کاموں کا وجود و ہستی

''کھانے'' اور ''پینے'' کے سانچے میں ڈھل گیا ہے، اور انسان اپنے اعضاء کی اختیاری نقل وحرکت سے اس عمل کو وجود میں لاتا ہے، لہٰذا یہ کام فاعل سے مربوط ہوتے ہیں، کیونکہ ان دو کاموں کی نسبت کسی بھی صورت میں خدا سے نہیں دی جاسکتی۔ اس بنا پر (اس مثال میں) خدا وجود عطا کرنے والا ہے اور انسان فاعل یعنی ''کھانے''، ''پینے'' کا فعل انجام دینے والا ہے۔

۳۱ویں اصل:

توحید کا چوتھا مرتبہ، الوہیت اور کائنات وانسان کے امور میں اس کی تدبیر کے بارے میں ہے۔ توحید ربوبی کی دو قلمرو ہیں:

۱۔ تکوینی تدبیر

۲۔ تشریعی تدبیر

تشریعی تدبیر کے بارے میں ہم ایک مستقل اور الگ اصل کے تحت بحث کریں گے۔ فی الحال تکوینی تدبیر کی قلمرو کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں۔

تکوینی تدبیر سے مراد، خلقتِ کائنات کی ہدایت ہے، اس معنی میں کہ کائناتِ ہستی کا انتظام چلانا یعنی اس کی تشکیل اور تخلیق خدائے واحد ویکتا کا کام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانی کاموں میں انتظامی امور، تخلیق سے الگ اور قابل تفکیک ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آدمی ایک کارخانہ کی تعمیر کرتا ہے اور دوسرا اس کا انتظام چلاتا ہے۔ لیکن عالم تخلیق میں خالق اور اس کا مدبر ایک ہی ہے۔ لیکن اس میں خاص بات یہ ہے کہ کائنات کی تدبیر اس کی تخلیق سے جدا نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی تاریخ گواہ ہے کہ اُن کی امتوں میں ''خالقیت میں توحید'' کے مسئلہ پر نزاع اور جھگڑا نہیں تھا اور اگر کسی قسم کا شرک پایا جاتا تھا تو وہ عمومی طور پر کائنات کا نظم وانتظام چلانے اور اس کی تدبیر وہدایت اور اس کے ضمن میں عبودیت اور پرستش سے مربوط تھا۔ عہد حضرت ابراھیم علیہ السلام کے مشرک ایک خدا پر اعتقاد رکھتے تھے لیکن غلطی سے تصور کرتے تھے کہ ستارے، چاند

اور سورج کائنات کے ارباب اور نظام ہستی کو گردش دینے والے ہیں۔ان کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ بھی اسی مسئلہ پر تھا۔(انعام/۷۸۔۷۶)

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کا زمانہ تھا شرک ،مسئلہ ربوبیت سے مربوط تھا۔

''تم لوگ کہتے ہو کہ خدا نے کائنات کو خلق کرنے کے بعد اس کا نظم ونسق اوروں کے سپرد کیا ہے''

یہ مطلب حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنے قید خانے کے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو سے حاصل ہوتا ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام وہاں پر ان سے فرماتے ہیں:

﴿ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللهُ الْوَٰحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (یوسف/۳۹)

''ذرا یہ تو بتاؤ کہ متفرق قسم کے خدا بہتر ہوتے ہیں یا ایک خدائے واحد وقہار؟''

اسی طرح قرآن مجید کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے مشرکین بھی اپنی قسمت وتقدیر کے ایک حصہ کو اپنے خداؤں کے ہاتھ میں جانتے تھے۔جیسے قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَاتَّخَذُواْ مِن دُونِ اللهِ ءَالِهَةً لِّيَكُونُواْ لَهُمْ عِزًّا﴾ (مریم/۸۱)

''اور ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے خدا اختیار کر لئے ہیں تا کہ وہ ان کے لئے باعث عزت بنیں''۔

اور فرماتا ہے:

﴿وَاتَّخَذُواْمِن دُونِ اللهِ ءَالِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ.لَايَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ﴾ (یٰس/۷۵۔۷۴)

''اوران لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا لئے ہیں کہ شاید ان کی مدد کی جائے گی۔ حالانکہ وہ مدد کی طاقت نہیں رکھتے ہیں اور یہ ان کے ایسے لشکر ہیں جنھیں خود بھی خدا کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا''۔

قرآن مجید کئی آیتوں میں مشرکوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ تم لوگ ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ اپنے لئے اور نہ پرستش کرنے والوں کے لئے کوئی نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں اس طرح کی آیات اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ عہدِ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشرکین اس بات کے معتقد تھے کہ ان کے خدا انھیں نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں (یونس/۱۸،فرقان/۵۵)۔اور یہ عقیدہ ان کی بت پرستی کا محرّک تھا۔ یہ اوران جیسی دوسری آیات،عہد رسالت مآب کے مشرکوں کے عقائد سے پردہ اٹھاتی ہیں اوراس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ ''توحید خالقیت'' کے قائل ہوتے ہوئے ربوبیت الٰہی سے مربوط حصہ میں مشرک تھے اوراپنے خداؤں کوان امور میں دخیل اور مؤثر جانتے تھے۔قرآن مجیدان کو بت پرستی سے منع کرتے ہوئے مذکورہ محرّک کو باطل وبیہودہ قرار دیتا ہے۔اور فرماتا ہے:

''تمہارے خدا ایسے نہیں ہیں کہ یہ کردار ادا کرسکیں''۔

قرآن مجید بعض آیات میں مشرکوں کی مذمت کرتا ہے کہ وہ اللہ کے لئے دوسری چیزوں کو شریک اورمثل قرار دیکران سے خدا کی جیسی محبت کرتے ہیں:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُمِن دُونِ اللهِ أَندَاداً يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللهِ﴾ (بقرہ/۱۶۵)

''لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو اللہ کے علاوہ دوسروں کواس کا مثل قرار دیتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت بھی کرتے ہیں''۔

خدا کا شریک قرار دینے کے سلسلے میں دوسری آیات میں بھی مذمت اورملامت کی گئی ہے۔مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کے بارے میں خدا کی طرح

شان وحیثیت کے قائل تھے، اس کے بعد ایسے ہی مقام ومنزلت کے مالک ہونے کے تصور سے ان سے محبت کرتے ہوئے ان کی پرستش کرتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں، چونکہ ان (خودساختہ معبودوں) کو بعض جہتوں سے خدا کے شریک، ہمسر ومثل تصور کرتے تھے، اسلئے ان کی پرستش و پوجا کرتے تھے۔

قرآن مجید مشرکین کی زبان سے نقل فرماتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنی اور اپنے بتوں کی یوں ملامت کریں گے:

﴿تاللهِ إن كُنَّالَفِي ضَلَلٍ مُّبِينٍ.إذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَلَمِينَ﴾

(شعراء/۹۸_۹۷)

''خدا کی قسم ہم سب کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ جب ہم،تم (بتوں) کو رب العالمین کے برابر قرار دے رہے تھے''۔

حق تعالیٰ کی ربوبیت کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس جہت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے مشرکین رزق، موت وحیات جیسے موارد اور کائنات کے عمومی امور کا نظام چلانے کے بارے میں موحد تھے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَرَوَمَن يُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَىِّ وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللهُ أَفَلا تَتَّقُونَ﴾ (یونس/۳۱)

''پیغمبر ذرا ان سے پوچھئے کہ تمھیں زمین وآسمان سے کون رزق دیتا ہے اور کون تمہاری سماعت وبصارت کا مالک ہے اور کون مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور کون سارے امور کی تدبیر کرتا ہے تو یہ سب یہی کہیں گے کہ اللہ، تو آپ کہئے کہ پھر اس سے کیوں نہیں ڈرتے ہو''۔

﴿قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَآ إِنْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ. قُلْ مَن رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ. سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ﴾ (مؤمنون/۸۴۔۸۶۔۸۷)

''توذرا آپ پوچھیئے کہ یہ زمین اوراس کی مخلوقات کس کے لئے ہے اگر تمہارے پاس کچھ بھی علم ہے؟ وہ فوراً کہیں گے اللہ کے لئے ہے۔ تو کہیئے پھر سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ پھر مزید کہیئے کہ ساتوں آسمان اور عرش اعظم کا مالک کون ہے۔ تو وہ پھر کہیں گے اللہ ہی ہے تو کہیئے کہ آخر اس سے ڈرتے کیوں نہیں ہو؟''

لیکن یہی افراد، سورہ مریم اور سورہ یاسین کی آیات کے بموجب جس کا ذکر پہلے آچکا ہے جنگ میں کامیابی اور سفر میں خطرات سے بچنے جیسے مسائل میں اپنے معبودوں کو کائنات کی تقدیر میں دخیل اور موثر جانتے تھے اوراس سے واضح تر یہ کہ شفاعت کوان کا حق جانتے تھے اوراس امر کے معتقد تھے کہ وہ خدا کی اجازت کے بغیر شفاعت کرسکتے ہیں اوران کی شفاعت مؤثر ہوگی۔

اس لحاظ سے (ان کے خیال میں) اس میں کوئی خرابی نہیں ہے کہ کچھ لوگ بعض مسائل میں امور کا انتظام چلانے کو خدا سے مربوط جانیں اور موحد ہوں لیکن دوسرے مسائل جیسے شفاعت، نفع ونقصان، عزت ومغفرت، تدبیر اور بعض امور کی حاکمیت کو متعدد خداؤں کے اختیار میں ہونے کے قائل ہوں اوران کے مؤثر ہونے کے معتقد ہوں۔

بعض اوقات مشرکین اپنی بت پرستی اور شرک کی توجیہ وتشریح میں کہتے ہیں:

''ہم اسلئے ان (بتوں) کی پرستش کرتے ہیں تاکہ اس طرح خدا کے نزدیک تر ہوجائیں۔ (یعنی ہم ان کو اپنی زندگی میں مؤثر نہیں جانتے ہیں)'' قرآن مجید ان کی اس توجیہ کو اس طرح نقل فرماتا ہے:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفَىٰ﴾ (زمر/۳)

''ہم ان (بتوں) کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کردیں گے''۔

لیکن اسی آیت کے ذیل میں قرآن مجید یاددہانی فرماتا ہے کہ یہ لوگ اس دعوے میں جھوٹے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَٰذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (زمر/۳)

''اللہ کسی بھی جھوٹے اور ناشکری کرنے والے کو ہدایت نہیں کرتا ہے''۔

''ربوبیت میں توحید'' یعنی انسان اور کائنات کے بارے میں اذن خدا سے عاری اور غیر خدا کے ذریعہ ہر قسم کی کلی یا جزئی تدبیر کے تصور و خیال کو منسوخ اور باطل قرار دینا ہے۔ قرآن مجید کی توحیدی منطق یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی مستقل تدبیر جو غیر خدا کی عبادت کا باعث بنتی ہو کو کفر و باطل قرار دیتی ہے۔

''ربوبیت توحیدی'' کی دلیل واضح و روشن ہے۔ کائنات اور انسان کے بارے میں ''کارخانہ خلقت کا انتظام چلانا'' اس کی ''آفرینش'' سے جدا نہیں ہے۔ جب کائنات اور انسان کا خالق ایک ہے تو اس کے امور کا انتظام چلانے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ کائنات کی ''خالقیت'' اور ''تدبیر'' کے درمیان اس واضح اور روشن ربط ورشتہ کی ہی وجہ سے خداوند متعال قرآن مجید میں جہاں آسمانوں کی پیدائش و آفرینش کا ذکر کرتا ہے وہیں خود کو بعنوان مدبّر کائنات بھی پہچانواتا ہے اور فرماتا ہے:

﴿اللّٰهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ﴾ (رعد/۲)

''اللہ ہی وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر کسی ستون کے بلند کردیا ہے، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، اس کے بعد اس نے عرش پر اقتدار قائم کیا اور آفتاب

وماہتاب کومسخر بنایا کہ سب ایک معینہ مدت تک چلتے رہیں گے وہی تمام امور کی تدبیر کرنیوالا ہے''۔

خداوندعالم، خلقت پر حاکم نظام کو کائنات کا واحد و یکتا مدبّر ہونے کی دلیل قرار دیتے ہوئے ایک دوسری آیات میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿لَوْكَانَ فِيهِمَآءَ الِهَةٌ إِلَّااللهُ لَفَسَدَتَا﴾ (انبیاء/۲۲)

''یادرکھواگرزمین وآسمان میں اللہ کے علاوہ اور خدا بھی ہوتے تو زمین وآسمان دونوں برباد ہوجاتے''۔

''تدبیر میں توحید'' اس اعتقاد کے ساتھ کہ خدا کے اذن سے اور بھی کئی مدبّر فریضہ انجام دیتے ہیں، حقیقت میں مظاہر ربوبیت کی ایک نمائش ہے اور یہ ''تدبیر میں توحید'' کے منافی نہیں ہے۔اس لئے قرآن مجید ربوبیت میں توحید کی تاکید کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے امور کا انتظام کرنے والوں کے وجود کی وضاحت بھی فرماتا ہے:

﴿فَالْمُدَبِّرَٰتِ أَمْرًا﴾ (نازعات/۵)

''پھر امور کا انتظام کرنے والے ہیں''۔

۳۲ویں اصل:

تدبیر کا مقصد کائنات اور انسان کے تمام امور کا دنیا وآخرت کے تمام شعبوں میں تکوینی وتشریعی لحاظ سے انتظام چلانا ہے۔اس بنا پر بشر کے امور کا تمام جہات میں انتظام چلانا قدرت الٰہی سے مخصوص اور اسی پر منحصر ہے۔اب توحید ربوبی کی دوسری قلمرو (شریعت میں تدبیر) ملاحظہ فرمائیں:

تشریعی تدبیر:

جس طرح عالم کون ومکان میں خدائے واحد، مدبّر ہے اور کائنات کی خلقت اور انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تدبیر اسی کی قدرت میں ہے، اسی طرح شریعت سے مربوط ہر قسم کے امور بھی جیسے حکومت وفرمانروائی، قانون سازی، اطاعت وفرمانبرداری، شفاعت اور مغفرتِ گناہ وغیرہ سب کے سب اسی کے اختیار میں ہیں اور کوئی بھی اس کی اجازت کے بغیر ان امور میں دخل اندازی کا حق نہیں رکھتا۔ اس لحاظ سے حاکمیت، تشریع، اطاعت... میں توحید، تدبیر میں توحید کے زمرے میں آتے ہیں۔

اسی لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسلمانوں کے حاکم کی حیثیت سے انتخاب، خدا کے حکم سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت خدا کی اطاعت شمار ہوتی ہے بلکہ یہ عین خدا کی اطاعت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ﴾ (نساء/۸۰)

''جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرے گا اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللهِ﴾ (نساء/۶۴)

''ہم نے کسی رسول کو بھی نہیں بھیجا ہے مگر صرف اس لئے کہ حکم خدا سے اسکی اطاعت کی جائے''۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر اذن وحکم الٰہی نہ ہوتا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ حاکم تھے اور نہ قابل اطاعت، حقیقت میں اس کی حکومت اور اطاعت خدا کی حکومت واطاعت کی جلوہ گاہ ہے۔ اور چونکہ فریضہ معیّن کرنا شانِ ربوبیت ہے، اس لئے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ فرمان الٰہی کے خلاف کسی قسم کا فیصلہ کرے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنزَلَ اللهُ فَأُوْلَٰئِكَ هُمُ

الْكٰفِرُوْنَ﴾ (مائدہ/۴۴)

''اور جو بھی ہمارے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا وہ سب کافر شمار ہوں گے''۔

اسی طرح شفاعت اور گناہوں کی بخشش، خدا کے مخصوص اختیارات میں سے ہے اور کوئی بھی اس کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں کر سکتا ہے، اسی سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَن ذَاالَّذِي يَشفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذنِهِ﴾ (بقرہ/۲۵۵)

''کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے''۔

﴿لايَشفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارتَضىٰ﴾ (انبیاء/۲۸)

''(فرشتے) کسی کی سفارش نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا اس کو پسند کرے''۔

اس بنا پر اسلامی نقطہ نظر سے مغفرت کے سارٹیفکٹوں کی خرید و فروش، اس تصوّر سے کہ خداوند متعال کے علاوہ بھی کوئی کسی کو بہشت بھیج سکتا ہے یا کسی کو آخرت کے عذاب سے بچا سکتا ہے، جیسے کہ مسیحیت میں رائج تھا، ایک بے بنیاد تصور ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿فاستَغفَرُوالِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغفِرُالذُّنُوبَ إِلَّا اللهُ﴾ (آل عمران/۱۳۵)

''پس وہ اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور خدا کے علاوہ کون گناہوں کا معاف کرنے والا ہے''۔

مذکورہ بیان کے مطابق، ایک موحد کو چاہئے کہ شریعت کے امور میں فقط خدا کو مرجع و مدبر جانے، مگر یہ کہ خود خداوند متعال نے کسی کو حکم نافذ کرنے اور دینی فرائض بیان کرنے کے لئے انتخاب کیا ہو اور اسے اجازت دی ہو۔

۳۳ویں اصل:

عبادت میں توحید، تمام آسمانی ادیان کا مشترک اصول ہے۔ اور ایک لحاظ سے خدا کے

پیغمبروں کی بعثت کا مقصد بھی اسی اصول کی یاددہانی تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ﴾ (نحل/۳۶)

''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو''۔

تمام مسلمان نماز ادا کرتے ہوئے ''عبادت میں توحید'' کی گواہی دیتے ہیں کہ:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ (فاتحہ/۵)

''(پروردگارا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں''۔

چنانچہ اس مسئلہ، کہ صرف خدا کی ہی عبادت و پرستش کی جانی چاہئے، کوئی اختلاف نہیں ہے اور ایک فرد بھی اس کلی قاعدہ کا مخالف و منکر نہیں ہے۔ درحقیقت اختلاف چند دوسرے امور میں ہے کہ ان امور کا انجام دینا غیر خدا کی عبادت شمار ہوتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کے قطعی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے عبادت کی منطقی واستدلالی تشریح کی جائے اور وہ کام جو عبادت و پرستش کے طور پر انجام پاتے ہیں، ان کاموں سے الگ کئے جائیں، جو تعظیم وتکریم کی صورت میں انجام پاتے ہیں۔

اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ ماں باپ اور انبیاء واولیاء اللہ کی پرستش قطعی طور حرام اور شرک ہے لیکن ان کی تعظیم وتکریم ضروری اور عین توحید ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (اسراء/۲۳)

''اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا''۔

یہاں پر یہ بات غور طلب ہے کہ، وہ کونسا اصول ہے جو ''عبادت'' کو ''تکریم'' سے جدا کرتا ہے؟ کس طرح ایک کام ایک وقت (جیسے آدم کو ملائکہ کا سجدہ اور یعقوب علیہ السلام کے

بیٹوں کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ) عین توحید تھا لیکن یہی فعل دوسری جگہ (جیسے بتوں کے سامنے سجدہ) عین شرک و بت پرستی ہے؟ اس سوال کا جواب "تدبیر میں توحید" کی گزشتہ بحث میں روشن اور واضح طور پر بیان کیا جاچکا ہے۔

عبادت اور پرستش (جو خدا کے بغیر کسی اور کی کرنا منع ہوئی ہے) کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایک موجود کے مقابلے میں، اس اعتقاد کے ساتھ خضوع وخشوع کرے کہ وہ موجود مستقل طور کائنات یا انسان یا ان دو کے ایک حصے کی تقدیر وقسمت کا مالک ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس موجود کو کائنات وانسان کا رب و مالک جانتے ہوئے خضوع وخشوع کرے۔ لیکن اگر یہی خضوع وخشوع ایک ایسے وجود کے لئے ہو جو خدا کا ایک صالح بندہ یا صاحب فضیلت و کرامت ہو یا دوسرے انسانوں کے لئے منشاء نیکی واحسان ہو تو یہ فعل "تکریم وتعظیم" ہوگا، نہ عبادت و پرستش اگر فرشتوں کا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا اور یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کا حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا شرک و پرستش اور غیر خدا کی عبادت شمار نہ ہوا تو یہ اس لئے تھا کہ مذکورہ خضوع وخشوع خداوند تبارک وتعالیٰ کی عبودیت و بندگی کا اپنی جگہ پر اعتقاد رکھتے ہوئے آدم علیہ السلام و یوسف علیہ السلام کی کرامت وتعظیم کے طور پر تھا نہ کہ انھیں رب اور خدا ماننے کے اعتبار سے۔

اس ضابطے کے مطابق مسلمانوں کے اُس احترام وتعظیم کے بارے میں استدلال کیا جاسکتا ہے جو وہ اولیاء اللہ کی زیارت گاہوں کی نسبت انجام دیتے ہیں واضح اور روشن ہے کہ زیارت گاہوں کی ضریحوں کو چومنا یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت یا بعثت کے دن خوشی کا اظہار کرنے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتکریم اور محبت کا پہلو ہے اور اس میں ہرگز ان کی ربوبیت کے اعتقاد کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مسائل جیسے اولیائے الٰہی کے مناقب میں مدح سرائی اور مرثیہ خوانی، آثار رسالت مآب کا تحفظ اور بزرگان دین کی قبروں پر روضوں کا بنانا نہ شرک ہے اور نہ بدعت۔ شرک اس لئے نہیں ہے کہ اس عمل

کا سر چشمہ اولیائے خدا سے محبت واحترام ہے (نہ ان کی ربوبیت کا اعتقاد)، بدعت، اسلئے نہیں ہے کہ مذکورہ اعمال کی بنیاد قرآن و احادیث پر مبنی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کی محبت ومودت ضروری ہے۔ اور ولادت اور مبعث کے دن تکریم وتعظیم کے سلسلے میں ہمارے اعمال اسی محبت ومودت کی نشانیاں ہیں۔ (اس کی مزید تشریح بدعت سے مربوط آنیوالی بحث میں کی جائے گی)

اس کے مقابلے میں بتوں کے سامنے مشرکوں کے سجدے اس لحاظ سے منع تھے کہ وہ ان کے بارے میں اعتقاد ربوبیت رکھتے تھے اور ان (بتوں) کو لوگوں کی قسمت وتقدیر کے ایک حصے میں دخیل اور صاحب قدرت سمجھتے تھے۔ مشرکین کم از کم عزت و ذلت، مغفرت اور شفاعت کو ان ہی بتوں کی قدرت میں ہونے کا اعتقاد تو رکھتے تھے۔

تیسرا حصہ

عقائد کے کلیّات

(۲)

خدا کے صفات

۳۴ ویں اصل:

چونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات ایک لامتناہی حقیقت ہے اور یہ ذات بے مثل و بے نظیر ہے، اسلئے انسان خدا کی ذات کی اصلیت اور اس کی حقیقت کو درک نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود خدا کو اس کے صفاتِ جمال اور صفاتِ جلال سے پہچانا جا سکتا ہے۔

صفات جمال کا مقصد ایسے صفات ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے کمالِ وجودی کے مظہر ہیں، جیسے علم، قدرت، حیات اور اختیار وغیرہ۔

صفات جلال کا مقصد ایسے صفات ہیں کہ خداوند متعال کی ذات اس سے بلند ہے کہ ان صفات سے اس کی توصیف کی جائے۔ یہ صفات موصوف کے عیب و نقص، عجز و ناتوانی کی علامت ہیں اور خداوند کریم بے نیاز و غنی مطلق اور ہر عیب و نقص سے پاک و منزہ ہے۔ بعض اوقات ان دو قسم کے صفات کو صفات ثبوتیہ و صفات سلبیہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے کہ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔

۳۵ویں اصل:

شناختِ خدا کی بحث میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ تلاش حق کے اصل راستے، حس، عقل اور وحی ہیں۔خداوند تبارک وتعالیٰ کے صفات جلال وصفاتِ جمال کی پہچان کے لئے بھی ان ہی طریقوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے:

ا۔راہ عقل

خلقت کائنات اوراس میں پوشیدہ اسرار ورموز پر غوروفکر، جو سب کے سب مخلوق خدا ہیں، ہمیں خدا کے کمالات وجودی خدا کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ خلقت کے اس عظیم محل کی تعمیر علم، قدرت اوراختیار کے بغیر ممکن ہے؟ قرآن مجید اس سلسلے میں حکمِ عقل کی تائید کے لئے قلمرو آفاق وانفس میں تکوینی آیات کے مطالعے کی دعوت دیتاہے، اورارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلِ انظُروامَاذَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ (یونس/۱۰۱)

''(پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ) کہد یجئے کہ ذرا آسمان وزمین میں غور کرو(کہ کیا حقیقتیں موجود ہیں)''

البتہ فطرتِ کائنات کے مطالعے کے سلسلے میں، عقل اس راستے کو حس کی مدد سے طے کرتی ہے، اسطرح کہ پہلے حس موضوع کو تعجب وحیرت کی صورت میں درک کرتی ہے پھر عقل مخلوق کے تعجب کو عظمت وجمالِ خداوندی کی علامت کے طور پر حاصل کرتی ہے۔

۲۔راہ وحی

جب ناقابل تنسیخ اور قطعی دلائل و برہان نے نبوت ووحی کو ثابت کردیااور واضح ہوا کہ کتاب(قرآن)اورارشادات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (سنت) سب خدا کی جانب سے ہیں تو فطری طور پر جو کچھ کتاب وسنت میں آیاہے، بشر کے لئے خدا کے صفات پہچاننے

میں ممد و مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ان دو منابع میں خداوند متعال کی ذات کے اعلیٰ صفات کی توصیف ہوئی ہے۔اس سلسلے میں بس اتنا جاننا کافی ہے کہ قرآن مجید میں خدا کے لئے ۱۳۵ نام وصفتیں بیاں ہوئی ہیں۔ہم یہاں پر ان میں سے صرف ایک اہم مورد کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

﴿هُوَاللهُ الَّذِی لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَعٰلِمُ الْغَیبِ وَالشَّهٰدَةِ هُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِیمُ.هُوَاللهُ الَّذِی لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیمِنُ الْعَزِیزُالْجَبَّارُالْمتَکَبِّرُ سُبْحٰنَ اللهِ عَمَّا یُشْرِکُونَ﴾ (حشر/۲۴۔۲۲)

''وہ خداوہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدانہیں ہے اوروہ حاضر وغائب سب کا جاننے والاعظیم اور دائمی رحمتوں کا مالک ہے۔وہ اللہ وہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدانہیں ہے۔وہ بادشاہ، پاکیزہ صفات، بے عیب، امان دینے والا،نگرانی کرنے والا،صاحب عزت،زبردست اور کبریائی کا مالک ہے۔وہ ان تمام باتوں سے پاک وپاکیزہ ہے جو مشرکین کہا کرتے ہیں۔وہ ایسا خدا ہے جو پیدا کرنے والا،ایجادکرنے والا اور صورتیں بنانے والا ہے۔اس کے لئے بہترین نام ہیں۔زمین وآسمان کا ہرذرّہ اس کے لئے محوتسبیح ہے اوروہ صاحب عزت وحکمت ہے''۔

یہاں پر اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ، جولوگ خدا کے صفات کی معرفت حاصل کرنے کے مخالف ہیں،وہ حقیقت میں فرقہ''معطلہ''سے تعلق رکھتے ہیں،کیونکہ یہ لوگ انسان کوعقل ووحی کے ذریعہ معلوم ہونے والے عالی معارف سے محروم کرتے ہیں۔اگرحقیقت میں اس قسم کے معارف کے بارے میں بحث وگفتگو کرنا ممنوع ہوتا،تو قرآن مجید میں ان تمام صفات کاذکراوران کے بارے میں فکروتدبر کرنے کا حکم بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

۳۶ ویں اصل:

ایک دوسرے زوائے سے صفاتِ خدا کی دو قسمیں ہیں:

الف: صفاتِ ذات

ب: صفاتِ فعل

صفات ذات سے مراد وہ صفات ہیں، جن سے خدا کی توصیف کرنا اس کی ذات کے تصوّر کیلئے کافی ہے۔ اصطلاح میں یہ صفات ذات باری تعالیٰ سے ظاہر ہوتے ہیں، جیسے علم، قدرت وحیات۔

خدا کے صفاتِ فعل کا مقصد وہ صفات ہیں کہ خداوند متعال کی ذات کی توصیف فعل صادر ہونے کے لحاظ سے ہوتی ہے، جیسے، پیدا کرنا یا رزق دینا، بخشنا وغیرہ یہ سب کے سب خدا سے فعل صادر ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

دوسرے معنی میں، جب تک خداوند متعال سے کوئی فعل جیسے خلقت و رزق وغیرہ صادر نہ ہوا سے بالفعل خالق یا رزّاق نہیں کہا جاسکتا، اگر چہ خلقت، رزق، رحمت ومغفرت... پر خدا ذاتی طور قدرت رکھتا ہے۔

آخر میں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ خداوند متعال کے تمام صفات فعلی کا سرچشمہ خدا کی ذات اور اس کے ذاتی کمالات ہیں۔ یعنی خداوند متعال ایسے کمال مطلق کا مالک ہے جو تمام کمالات فعلی کی بنیاد ہے۔

ذات خدا کی صفات:

خدا کی صفات کی تقسیم، جیسے، صفات ثبوتیہ، صفات سلبیہ، صفات ذاتی وصفات فعلی سے آگاہی ہونے کے بعد بہتر ہے ان صفات سے مربوط اہم مسائل بھی بیان کئے جائیں۔

۳۷ویں اصل:

الف: ازلی ولامتناہی علم:

علم خدا، اس اعتبار سے کہ عینِ ذاتِ خدا ہے، ازلی اور لامتناہی ہے۔ خداوند متعال علم ذاتی کے علاوہ ماسوائے ذات سے بھی کلّی وجزئی، طور پر قبل از وقوع اور بعد از وقوع آگاہ ہے۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کی بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔﴿إِنَّ اللهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (عنکبوت/۶۲)

''وہ ہر شئے کا خوب جاننے والا ہے''۔

۲۔﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (ملک/۱۴)

''اور کیا پیدا کرنے والا نہیں جانتا ہے جب کہ وہ لطیف بھی ہے اور خبیر بھی ہے''۔

اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں بھی علم خدا کے ازلی اور لامتناہی ہونے کے بارے میں مکرّر تاکید ہوئی ہے۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لم يزل عالمًا بالمكان قبل تكوينه كعلمه به بعد ما كونه وكذلك علمه بجميع الاشياء (توحید صدوق، ص ۱۳۷ باب ۱۰ حدیث ۹)

''کسی شئے کے بارے میں اس کی پیدائش سے قبل خداوند متعال کا علم ویسا ہی ہے جیسے اس شئے کی تخلیق کے بعد۔ اور تمام اشیاء ومخلوقات کے بارے میں بھی اس کا علم اسی صورت میں ہے''۔

ب. لامحدود قدرت:

خداوند متعال کی قدرت اس کے علم کی طرح ازلی اور لامحدود ہے اور اس لحاظ سے خدا کی قدرت اس کی عین ذات ہے۔ اس کے علم کی طرح اسکی قدرت بھی لامتناہی ہے۔ قرآن مجید

نے خدا کی قدرت کے لامتناہی اور وسیع ہونے کو صراحت سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا﴾ (احزاب/۲۷)

''اور بے شک اللہ ہر شئے پر قادر ہے''۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾ (کہف/۴۵)

''اور اللہ ہر شئے پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاشياء له سواء علمًاوقدرة وسلطانًا و ملكًا و احاطة (۱)

''تمام اشیاء۔ خدا کے علم، قدرت، تسلط، مالکیت اور ان پر اس کے احاطہ کے لحاظ سے مساوی ہیں''۔

اس ضمن میں اگر ممتنع اور محال چیزوں کا وجود میں آنا ذاتاً قدرت الٰہی کے قلمرو سے خارج ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا اس پر قادر نہیں ہے بلکہ یہ ممتنع ومحال کی عدم کفایت کی وجہ سے ہے کہ اس میں متحقق ہونے اور وجود میں آنے کی قابلیت نہیں ہے (دوسرے الفاظ میں خود قابل میں ناتوانی اور نقص ہے)۔

امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے جب ممتنعات کے وجود میں آنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

انّ الله تبارک وتعالیٰ لاینسب الی العجزوالذی سألتنی لا یکون (۲)

''خداوند متعال عجز ناتوانی سے منزہ ہے اور جس چیز کے بارے میں تم نے سوال کیا ہے وہ ہونیوالی چیز نہیں ہے''۔

۱۔ توحید صدوق باب ۹، حدیث ۱۵۔

۲۔ توحید صدوق، ص ۱۳۳، باب ۹، حدیث ۹۔

ج۔ حیات:

خدائے عالم و قادر، بے شک حی و زندہ بھی ہے، چونکہ مذکورہ دو صفتیں زندہ وجود کی خصوصیات میں سے ہیں اور اسی سے خدا کے حی و زندہ ہونے کے دلائل روشن ہوتی ہیں۔ بلاشبہ خدا میں حیات کی صفت دوسرے تمام صفات کے مانند ہر قسم کے عیب و نقص سے عاری ہے۔ اور وہ انسان میں اس صفت کی خصوصیت (جیسے موت کے طاری ہونے) سے منزّہ ہے۔

چونکہ خداوند متعال ذاتاً حی ہے، اس لئے اس کی ذات تک موت کی رسائی نہیں ہے۔ دوسرے معنی میں چونکہ خدا کا وجود کمال مطلق ہے اور موت بے شک ایک قسم کا عیب و نقص ہے اس لئے اس کی ذات سے وابستہ نہیں ہوسکتی۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَتَوَکَّلْ عَلَی الْحَیِّ الَّذِی لَایَمُوتُ﴾ (فرقان/۵۸)

''اور آپ اس خدائے حی وقیوم پر اعتماد کریں جسے موت آنیوالی نہیں ہے''۔

د۔ ارادہ و اختیار:

یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنے فعل سے آگاہ فاعل، ناآگاہ فاعل سے کامل تر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک ایسا فاعل جو اپنے کام میں صاحب ارادہ و مختار ہو (یعنی اگر چاہے تو کام کو انجام دے اور اگر نہ چاہے تو اسے انجام نہ دے) مضطر و مجبور فاعل (جو فعل کے صرف ایک پہلو یعنی انجام دینے یا نہ دینے پر ہی قادر ہو) سے کامل تر ہوتا ہے۔ مذکورہ نکتہ پر غور کرنے اور اس لحاظ سے کہ قلمرو ھستی میں خداوند متعال کامل ترین فاعل ہے، فطری طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ فاعلِ مختار ہے، نہ کہ غیر کی جانب سے مجبور یا ذاتی طور سے مضطر۔ اور اس طرح خدا کا مرید، یعنی صاحب ارادہ ہونا اس کا مختار ہونا ہے۔

ارادہ، عام معنیٰ میں، انسان کے اندر ایک تدریجی، حادث اور (غیر ازلی) امر ہے۔ لیکن اس

قسم کا ارادہ ذات خداوند سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ اسی لئے احادیث اہل بیت علیہم السلام میں اس سلسلہ میں اشخاص کو خطا و انحراف سے محفوظ رکھنے کے لئے ارادہ حق تعالیٰ کو عین (انجام عمل و تحقق) فعل جانا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

''انسان سے مربوط ارادہ ایک داخلی حالت ہے کہ اس کے نتیجہ میں فعل انجام پاتا ہے، لیکن ارادہ خدا خود ایجاد فعل ہے، بغیر اس کے کہ انسان کے جیسی حالت خدا میں ایجاد ہو''۔ (کافی ۱/۱۰۹)

اس بیان سے واضح ہوا کہ ارادہ، اختیار کے معنی میں، صفات ذات میں سے ہے، لیکن ایجاد اور ہستی عطا کرنے کے معنی میں، صفات فعل میں سے ہے۔

صفات فعل خدا

اب جب کہ ہم خدا کے صفاتِ ذات سے مربوط اہم مسائل کے بارے میں آگاہ ہو گئے تو مناسب ہے کہ بعض صفاتِ فعل کے بارے میں بھی آگاہی حاصل کریں۔ یہاں ہم صرف تین صفات کے بارے میں بحث کریں گے۔

۱۔ تکلّم

۲۔ صدق

۳۔ حکمت

۳۸ ویں اصل:

قرآن مجید نے خداوند متعال کی ''تکلّم'' کی صفت سے توصیف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

۱۔﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾ (نساء/۱۶۴)

''اور اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے باقاعدہ گفتگو کی''۔

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَآءِ حِجَابٍ

أَوْيُرْسِلَ رَسُوْلاً﴾ (شوریٰ/۵۱)

''اور کسی انسان کے لئے یہ بات (ممکن) نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر یہ کہ وحی کرے یا پس پردہ سے بات کرے یا کوئی نمائندہ (فرشتہ) بھیجدے''۔

اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ ''تکلّم'' خدا کے صفات میں سے ایک صفت ہو۔ بحث اس امر میں ہے کہ یہ صفت خداوند متعال کے صفاتِ ذات میں شمار ہوتی ہے یا صفات فعل میں؟ واضح ہے کہ ''تکلّم'' کا مفہوم جس صورت سے انسان میں پایا جاتا ہے، خدا کے لئے قابل تصور نہیں ہے۔

چونکہ صفت ''تکلّم'' کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اسلئے ضروری ہے کہ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے قرآن ہی کی طرف رجوع کیا جائے۔ جیسا کہ ہم نے مشاہدہ کیا کہ قرآن مجید کے مطابق خدا اپنے بندوں سے تین صورتوں میں تکلّم کرتا ہے اور فرماتا ہے:

﴿وَمَاكَانَ لِبَشَرٍاَن يُكَلِّمَهُ اللهُ اِلَّاوَحْياًاَوْمِن وَرَآىءِ حِجَابٍ أَوْيُرْسِلَ رَسُوْلاًفَيُوحِيَ بِاِذْنِهِ مَايَشَآءُ اِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ﴾ (شوریٰ/۵۱)

''اور کسی انسان کے لئے یہ بات (ممکن) نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر یہ کہ وحی کردے یا پس پردہ سے بات کرے یا کوئی نمائندہ، فرشتہ بھیجدے، اور پھر وہ اس کی اجازت سے جو وہ چاہتا ہے پیغام پہنچاتا ہے۔ یقیناً وہ بلند و بالا اور صاحب حکمت ہے''۔

انسان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ خداوند متعال مندرجہ ذیل تین طریقوں کے علاوہ کسی اور طریقے سے اس کے گفتگو کرے:

۱۔ ''الّا وحیاً'' وحی والہام کے ذریعہ۔

۲۔ ''اومن وراء حجاب'' پردے کے پیچھے سے۔ اس طرح کہ انسان خدا

کے کلام کو سن لے لیکن اسے دیکھ نہ پائے خدا نے اسی صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی تھی۔

۳۔"اویرسل رسولاً" نمائندہ (فرشتے) کو بھیجتا ہے۔تاکہ خدا کی اجازت سے اسے وحی پہنچا دے۔

اس آیہ کریمہ میں خدا کا "تکلّم" اس صورت میں بیان ہوا ہے کہ وہ کلام کو تخلیق کرتا ہے، بعض اوقات بلا واسطہ اور بعض اوقات فرشتے کے ذریعہ سے۔پہلی صورت میں کبھی کبھی کلام خدا قلب پیغمبر میں براہ راست الہام ہوتا ہے اور کبھی کبھی کان کے ذریعہ اس کے قلب تک پہنچتا ہے۔اور تینوں صورتوں میں "تکلّم" کلام کی تخلیق کے معنی میں ہے اور یہ خدا کے صفاتِ فعل میں سے ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں یہ تکلّم خدا کی ایک تفسیر تھی۔اس کی دوسری تفسیر، یہ ہے کہ خداوند متعال کائنات کی موجودات کو اپنے "کلمات" شمار کرتا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَٰتِ رَبِّى لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَٰتُ رَبِّى وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِۦ مَدَدًا﴾ (کہف/۱۰۹)

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے پروردگار کے کلمات کے لئے سمندر بھی روشنائی بن جائے تو کلماتِ رب کے ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا، چاہے اس کی مدد کے لئے ہم ویسا ہی سمندر اور بھی لے آئیں"۔

اس آیت میں "کلمات" کا مقصد خدا کی مخلوقات ہیں کہ خداوند متعال کی ذات کے علاوہ کسی کی طاقت نہیں کہ ان کا شمار کر سکے۔مثال کے طور پر خداوند متعال ایک آیہ کریمہ میں حضرت مسیح کو "کلمۃ اللہ" کہہ کے پکارتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَكَلِمَتُهُۥٓ أَلْقَىٰهَآ إِلَىٰ مَرْيَمَ﴾ (نساء/۱۷۱)

''(حضرت عیسیٰ) اس کا کلمہ ہے جسے مریم کی طرف القاء کیا گیا ہے''۔
امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اپنے ایک بیان میں کلام خدا کو تخلیقِ خدا اور اس کے فعل کے طور پر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يقول لمن اراد كونه "كُن" فيكون، لابصوتٍ يُقرع ولا بنداءٍ يسمع، وانّما كلامه سبحانه فعل منه انشاه ومثله (۱)

''خداوند متعال جس چیز کو خلق کرنا چاہتا ہے، اسے کہتا ہے ''ہوجا'' اور وہ چیز وجود میں آجاتی ہے، لیکن اس کا کہنا اونچی آواز میں اور کان سے سنی جانیوالی ندا کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ خدا کا کلام اس کا فعل ہے، کہ موجود کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور اسے تحقق بخشتا ہے''۔

۳۹ ویں اصل:

گذشتہ بحث میں کلام خدا کی حقیقت دو تفسیروں کے ذریعہ واضح ہوئی جس میں دوسری تفسیر پہلی کی نسبت اعم تھی۔ ساتھ ہی اس بحث میں ثابت ہوا کہ کلام خدا ''حادث'' ہے اور قدیم نہیں ہے۔ چونکہ اس کا کلام فعل ہے اور فعلِ خدا ''حادث'' ہوتا ہے۔ اس لئے ''تکلّم'' بھی امر ''حادث'' ہے۔

اس کے باوجود کہ کلام خدا ''حادث'' ہے، پھر بھی احترام وادب کو مدنظر رکھتے ہوئے اور غلط فہمی سے بچنے کے لئے، کلامِ خدا کو ''مخلوق'' نہیں کہتے تا کہ اسے جعل اور خودساختہ نہ کہا جائے۔ ورنہ اگر اس امر کو نظر انداز کردیں، تو فطری طور خداوند متعال کے علاوہ ہر چیز مخلوقِ خدا اور اس کی پیدا کردہ ہے۔ سلیمان ابن جعفر جعفری کہتے ہیں کہ، میں نے ساتویں امام حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے سوال کیا:

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۴۔

''کیا قرآن مخلوق ہے؟''

حضرت علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

''میں کہتا ہوں کہ قرآن خدا کا کلام ہے''(۱)۔

یہاں پر ہم ایک تاریخی واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔تیسری صدی ہجری کے اوائل میں،یعنی ۲۱۲ھ میں قرآن کے ''قدیم'' یا ''حادث'' ہونے پر مسلمانوں کے درمیان زبردست اختلافات رونما ہوئے جبکہ قرآن کو 'قدیم' جاننے والوں کے پاس اپنے دعویٰ کے حق میں کوئی خاص اور صحیح دلیل موجود نہ تھی،کیونکہ اس سلسلے میں متعدد احتمالات پائے جاتے ہیں کہ ان میں سے بعض کے مطابق قرآن ''حادث'' ہے اور بعض دوسرے احتمالات کے مطابق قرآن ''قدیم'' ہے۔

اگر قرآن سے مقصود کتاب اور کلماتِ قرآن ہے جسکی تلاوت ہوتی ہے یا وہ ''کلمات'' ہیں جنھیں جبرئیل امین نے خدا سے حاصل کرکے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پر نازل کیا ہے تو یہ بے شک ''حادث'' ہے۔اور اگر مقصد آیات قرآن کے معنی ومفاہیم ہیں جن کا ایک حصہ پیغمبروں کی داستانوں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غزوات سے مربوط ہے،تو انھیں بھی 'قدیم' نہیں مانا جا سکتا۔

لیکن اگر مقصود،لفظ ومعنی کے لحاظ سے قرآن کی شکل میں خدا کا علم ہے تو یقیناً علمِ خدا ''قدیم'' ہے اور یہ اس کے صفاتِ ذات میں سے ہے۔لیکن علم،کلام نہیں ہوتا۔

۴۰ ویں اصل:

صفات خدا میں ایک صفت ''صدق'' ہے۔یعنی خداوند متعال اپنی باتوں میں صادق ہے اور اس کی گفتار میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔اس کی دلیل بھی واضح ہے،چونکہ جھوٹ،

۱۔توحید صدوق،ص۲۲۳،باب قرآن ما ھو،حدیث۲۔

جاہلوں، محتاجوں، عاجزوں اور ڈرپوکوں کا شیوہ ہے اور خداوند متعال ان تمام چیزوں سے پاک ومنزّہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں جھوٹ بولنا قبیح ہے اور خدا قبیح فعل کی انجام دہی سے پاک ومنزّہ ہے۔

۱۴ ویں اصل:

خدا کے صفاتِ کمال میں سے ایک ''حکمت'' ہے، جیسا کہ حکیم اس کے ناموں میں سے ایک ہے۔ خدا کے حکیم ہونے کا مقصد یہ ہے کہ:

۱۔ خدا کے افعال انتہائی محکم اور کمال سے مزیّن ہیں۔

۲۔ خداوند متعال ناشایستہ، عبث اور فضول کاموں کی انجام دہی سے منزّہ ہے۔

پہلے امر کی دلیل یہ ہے کہ خداوند متعال نے کائنات کے حیرت انگیز عظیم محل کو بہترین طریقے پر خلق فرمایا ہے، اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

﴿صُنْعَ اللهِ الَّذِیۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (نمل/۸۸)

''یہ اس کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو محکم بنادیا ہے''۔

دوسرے امر کی دلیل یہ آیت ہے کہ فرماتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بٰطِلًا﴾ (ص/۲۷)

''اور ہم نے آسمان اور زمین اور اس کے درمیان کی مخلوقات کو بیکار نہیں پیدا کیا ہے''۔

اس کے علاوہ خداوند متعال کمال مطلق ہے اور اس کا فعل بھی باکمال ہے اسلئے اسے عبث وبیہودگی سے منزّہ وپاک ہونا چاہئے

خدا کے صفات سلبیہ

۴۲ ویں اصل:

اقسام صفات کے سلسلے میں بیان ہو چکا کہ صفات الٰہی دو قسم کی ہیں: صفاتِ جمال اور صفاتِ جلال۔ وہ صفات جو کمال کی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، انہیں صفات جمال یا صفات ثبوتیہ کہا جاتا ہے اور وہ صفات جو نقص وعیب کی قسم سے تعلق رکھتی ہیں انہیں صفات جلال یا صفات سلبیہ کہا جاتا ہے۔

صفات سلبیہ کا مقصد یہ ہے کہ خداوند متعال کی ذاتِ مقدس ہر قسم کے عیب و نقص اور احتیاج سے پاک ومنزّہ ہے۔ ذاتِ خدا چونکہ بے نیاز اور کمال مطلق ہے لہٰذا ہر اس وصف سے پاک و منزّہ ہے جس میں نقص، عیب واحتیاج پائی جاتی ہو۔ اس لئے اسلام کے متکلمین کا قول ہے کہ:

''خدا جسم نہیں ہے، وہ کسی چیز کے لئے مکان نہیں ہے اور کسی چیز میں حلول نہیں کرتا، کیونکہ یہ سب خصوصیات موجودات کے عیب واحتیاج سے تعلق رکھتی ہیں''۔ اس کے علاوہ خدا کے لئے معیوب صفات میں ایک اور اس کا ''مرئی'' ہونا ہے۔ چونکہ مرئی ہونے کی صورت میں ضروری ہے کہ اس میں دیکھے جانے کے شرائط وحالات پائے جائیں، جیسے:

الف۔ ایک جگہ اور خاص جہت میں ہو۔

ب۔اندھیرے میں نہ ہو یعنی اس پر روشنی پڑرہی ہو۔

ج۔اس کے اوردیکھنے والے کے درمیان ایک معین فاصلہ ہو۔

واضح ہے کہ یہ شرائط ایک مجسم اور مادی وجود کے آثار ہیں نہ کہ خدائے متعال کے۔

اس کے علاوہ خدا کا مرئی ہونا دو حالت سے خارج نہیں: یا اس کا پورا وجود مرئی ہے یا اس کے وجود کا کچھ حصہ مرئی ہے۔پہلی صورت میں خداوندمتعال محیط ومحدود ہوگا اوردوسری صورت میں اجزاء پر مشتمل ہوگا۔اوریہ دونوں صورتیں خدائے بے نیاز کی شان کے خلاف ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا، وہ رویتِ حسی وبصری سے مربوط تھا،لیکن رویت قلبی اور باطنی مشاہدہ، جو ایمان کامل کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے،اس بحث سے خارج ہے اور اولیائے الٰہی کے لئے اس کا امکان بلکہ واقع ہونا بلاشک ممکن ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے ایک دوستدار،دعلب یمانی نے امام علیہ السلام سے عرض کی: کیا آپ(علیہ السلام)نے اپنے خدا کو دیکھا ہے؟

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: میں دیکھے بغیرکسی کی پرستش نہیں کرتا ہوں۔

اس پر سائل نے سوال کیا: آپ اس کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

لاتدرکه العیون بمشاهدة العیان ولکن تدرکه القلوب بحقائق الایمان(۱)۔

''ظاہری آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتی ہیں،لیکن حقیقتِ ایمان کی شعاعوں کے ذریعہ دل اسے دیکھ سکتے ہیں''۔

۱۔نہج البلاغہ،خطبہ۱۷۹۔

ظاہری آنکھوں سے خدا کو دیکھنا عقلی طور پر ممتنع اور ناممکن ہے۔اورقرآن مجید بھی خدا کو اس طرح دیکھے جانے سے انکار کرتا ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام (بنی اسرائیل کی اصرار پر) خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنا جلوہ دکھادے تو انھیں منفی جواب ملتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

﴿رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرۡ إِلَيۡكَۚ قَالَ لَن تَرَىٰنِي﴾ (اعراف/۱۴۳)

''انہوں نے کہا: پروردگار مجھے اپنا جلوہ دکھادے۔ارشاد ہوا: تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے''۔

ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ اگر خدا کو دیکھنا ممکن نہیں تو قرآن کیوں فرماتا ہے کہ قیامت کے دن نیک بندے اس کو دیکھ سکیں گے۔جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

﴿وُجُوهٌ يَوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ. إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (قیامت/۲۲_۲۳)

''اس دن بعض شاداب چہرے اپنے خدا کی طرف دیکھیں گے''۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کریمہ میں دیکھنے کا مقصد رحمت خداوندی کی امید وانتظار ہے۔کیونکہ ان آیات میں اس مطلب سے مربوط دو دلیلیں موجود ہیں:

۱۔دیکھنے کو چہرے کی طرف نسبت دی گئی ہے اور فرماتا ہے: ''شاداب چہرے اس کو دیکھیں گے''۔اگر مقصد، خدا کو دیکھنا ہوتا تو ضروری تھا کہ دیکھنے کو آنکھوں کی طرف نسبت دی جاتی، نہ چہرے کی طرف۔

۲۔اس سورہ مبارکہ میں دو گروہوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے: ایک وہ گروہ ہے جن کے چہرے درخشان اور شاداب ہیں۔ان کی جزاء جملۂ ''الیٰ ربها ناظرة'' سے بیان کیا گیا ہے۔دوسرا گروہ وہ ہے جن کے چہرے افسردہ وغمناک ہیں۔اوران کا صلہ جملۂ ''تظن ان یفعل بها فاقرة''(۱) سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۔جنھیں یہ فکر ہوگی کہ کب کمر توڑ مصیبت وارد ہونے والی ہے'' (قیامت/۲۵)

دوسرے جملہ کا مقصد واضح ہے اور یہ کہ یہ گروہ آگاہ ہے کہ ایک کمر توڑ عذاب سے دوچار ہونے والا ہے۔اس لئے فطری طور یہ گروہ ایسے ہی عذاب کا متوقع ہوگا۔

ان دو گروہوں کے درمیان مقابلہ کے قرینہ سے پہلی آیت کے مفہوم ومقصد کو آسانی سے پایا جاسکتا ہے،اور وہ یہ کہ شاداب چہرے والے رحمت خدا کے منتظر ہوں گے۔اور یہ جو کہا گیا ہے کہ خدا کی طرف دیکھتے ہیں،اس سے انتظار رحمت کی طرف اشارہ وکنایہ ہے۔اس سلسلے میں عربی اور فارسی میں بہت سی ضرب المثل موجود ہیں۔فارسی میں کہا جاتا ہے:"فلانی چشمش به دست دیگری است"(فلان شخص کی آنکھیں دوسرے کے ہاتھ پر ہیں)یعنی اس سے مدد کی توقع ہے۔

اس کے علاوہ اصولی طور پر قرآن مجید کی آیات کی تفسیر میں ایک ہی آیت پر اکتفانہیں کرنا چاہئے۔بلکہ اس موضوع پر نازل شدہ تمام مشابہ آیات کو ایک جگہ پر جمع کیا جانا چاہئے تاکہ مجموعی طور آیت کا حقیقی مفہوم حاصل کیا جاسکے۔رویت کے سلسلے میں بھی اگراس موضوع سے مربوط تمام آیات و روایات کو قرآن وسنت سے جمع کیا جائے تو اسلام کی روسے رویت کا ممتنع وناممکن ہونا واضح ہوجائے گا۔

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ موسیٰ کی طرف سے رویت کی درخواست دراصل بنی اسرائیل کے اصرار پر تھی کہ وہ ان سے کہتے تھے:"جس طرح آپ خدا کی آواز سنتے ہیں اور ہم سے بیان کرتے ہیں،اسی طرح خدا کو بھی دیکھ کراس کی توصیف ہم سے بیان کیجئے"

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً﴾(بقرہ/۵۵)

"جب تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو علانیہ نہ دیکھ لیں"

اس لئے حضرت موسیٰؑ نے خداوند متعال سے رؤیت کی درخواست کی اور جواب منفی ملا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿وَلَمَّا جَآءَ مُوسىٰ لِمِيقٰتِنَا وَ كَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ لَن تَرٰنِي﴾ (اعراف/۱۴۳)

''تو اس کے بعد جب موسیٰ ہمارا وعدہ پورا کرنے کے لئے اور ان کے رب نے ان سے کلام کیا تو انہوں نے کہا کہ پروردگارا مجھے اپنا جلوہ دکھادے، ارشاد ہوا، تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے....

صفاتِ خبری

۴۳ ویں اصل:

صفات الٰہی کے بارے میں جو کچھ اب تک بیان ہوا، "تکلّم" کے علاوہ سب کے سب صفات، ایسے تھے جن کے خدا سے متعلق ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں عقل فیصلہ دیتی تھی۔ لیکن قرآن واحادیث میں صفات کا ایک اور سلسلہ پایا جاتا ہے کہ نقل کے علاوہ کوئی اور سند ان کے باری میں دستیاب نہیں ہے۔ جیسے:

۱۔ یداللہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللهَ يَدُ اللهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ (فتح/۱۰)

"بیشک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ کی بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ ہی کا ہاتھ ہے۔"

۲۔ وجہ اللہ:

﴿وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ إِنَّ اللهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (بقرہ/۱۱۵)

"اور اللہ کے لئے مشرق بھی ہے اور مغرب بھی لہٰذا تم جس جگہ بھی قبلہ کا رخ کرلوگے سمجھو وہیں خدا موجود ہے۔ وہ صاحب وسعت بھی ہے اور صاحب علم بھی ہے"۔

۳۔عین اللہ:

﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا﴾ (ہود/۳۷)

''اور ہماری نگاہوں کے سامنے ہماری وحی کی نگرانی میں کشتی تیار کرو۔''

۴۔علی العرش استویٰ:

﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ﴾ (طٰہٰ/۵)

''وہ رحمان،عرش پر اختیار و اقتدار رکھنے والا ہے۔''

اوراسی طرح دوسرے نمونے۔

اس طرح کے صفات کو''صفات خبری'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ صرف آیات وروایات ان کے بارے میں خبر دیتی ہیں۔یہ امر قابل توجہ ہے کہ عقل وفہم ان صفات کو ان کے عرفی اور دنیاوی معنی میں تفسیر نہیں کرسکتی،کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ تجسم وتشبیہ ہوتا ہے کہ عقل ونقل سے ثابت ہے کہ ان چیزوں کا خدا سے نسبت دینا درست نہیں ہے۔اس لئے ان صفات کی حقیقی تفسیر کو پانے کیلئے قرآن مجید میں موجود اس قسم کی تمام آیات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔اس کے علاوہ ہمیں جاننا چاہئے کہ عربی زبان بھی دوسری زبانوں کی طرح مجاز وکنایہ سے مالا مال ہے اور قرآن مجید چونکہ قوم عرب سے گفتگو کرتا ہے اس لئے اس شیوہ سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔اب ہم ان صفات کے بارے میں قدرے تشریح کرتے ہیں:

الف: خدائے متعال مذکورہ پہلی آیت میں فرماتا ہے:''جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ کی بیعت کرتے ہیں'' اس کے بعد فرماتا ہے:''خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے۔''یعنی خدا کی قدرت ان کی قدرت سے بالاتر ہے،نہ یہ کہ خدا کے جسمانی ہاتھ ہیں اور اس کے ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر قرار پائے ہیں۔اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت کے اگلے حصے میں بیان ہوتا ہے:

﴿فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ اوفىٰ بِمَاعَاهَدَعليه

اللہ فَسَیوتیہ اجرًا عظیمًا﴾

''اب اس کے بعد جو بیعت کو توڑ دیتا ہے وہ اپنے ہی خلاف اقدام کرتا ہے اور جو عہد الٰہی کو پورا کرتا ہے خدا عنقریب اس کو اجر عظیم عطا کرے گا۔''

اس قسم کی گفتگو جس میں عہد شکنوں کو دھمکی دی گئی ہو اور ایفائے عہد کرنے والوں کو مژدہ دیا گیا ہو، اس امر کی دلیل ہے کہ ''یداللہ'' کا مقصد قدرت و حاکمیتِ خدا ہے۔ دراصل کلمہ ''ید'' بعض اوقات مختلف زبانوں میں قدرت کے معنی میں کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے فارسی میں ضرب المثل ہے: ''دست بالای دست بسیار است۔''

ب: خداوندمتعال کے بارے میں ''وجہ'' کا مقصد خدا کی ذاتِ اقدس ہے، نہ کہ انسان کا جیسا کوئی خاص عضو۔ قرآن مجید انسانوں کی نابودی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿کُلّ مَن عَلَیهَافان﴾

''جو بھی روئے زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والا ہے۔''

اور اس کے ساتھ خداوندمتعال کی پائداری و بقاء کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ کہ اس میں فنا نہیں ہے فرماتا ہے:

﴿وَیَبقَیٰ وَجهُ رَبّکَ ذُوالجَلَلِ وَالِاکرَامِ﴾ (رحمٰن/۲۷)

''صرف تمارے رب کی ذات جو صاحب جلال واکرام ہے وہی باقی رہنے والی ہے۔''

اس بیان کے زیر بحث آیہ کریمہ کا معنی واضح ہو جاتا ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوندمتعال ایک خاص جگہ پر نہیں ہے، بلکہ اس کا وجود تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور جس طرف بھی ہم رخ کریں، اسی کی ہی طرف رخ کیا ہے۔ اس مطلب کو ثابت کرنے کی لئے ہم دو صفتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ واسع: خدا کا وجود لامتناہی ہے۔ ۲۔ علیم: وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ج: تیسری آیت میں اس امر کا ذکر ہے کہ حضرت نوح خداوند متعال کی طرف سے کشتی بنانے پر مامور ہوئے تھے۔اس لحاظ سے کہ کشتی سمندر سے دور ایک جگہ پر بنانا کچھ ناآگاہ افراد کی طرف سے تمسخر اور اذیت و آزار کا باعث بن رہا تھا،لہٰذا ایسے حالات میں خداوند متعال حضرت نوح سے فرماتا ہے کہ:"تم کشتی کو بناؤ،تم ہماری نگرانی میں ہو،اور اس کام کے بارے میں ہم نے تمہیں وحی کی ہے۔"مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے خدا کے حکم کے مطابق عمل کیا ہے اور قدرتی طور پر اسی کی طرف سے آپ کی حفاظت وحمایت ہوگی اور تمسخر کرنے والے انھیں کسی قسم کا ضرر ونقصان نہیں پہنچا سکتے۔د:عربی لغت میں"عرش"تخت کو کہتے ہیں۔اور کلمہ"استواء"جب کلمہ"علیٰ"کے ساتھ آئے تو اس کے معنی،قرار،استحکام اور تسلط کے ہوتے ہیں۔چونکہ بادشاہ وحکام عمومی طور پر تخت پر بیٹھ کر مملکت کے امور چلاتے تھے،لہٰذا اس قسم کی تعبیر،حکومت کی قلمرو پر تسلط،قدرت وتدبیر کی طرف کنایہ ہے۔چونکہ دلائل عقلی ونقلی سے خدا کا لامکان ہونا ثابت ہے،اس لئے اس قسم کی تعبیرات کا مطلب یہ نہیں کہ خداوند متعال کسی مادی تخت پر بیٹھا ہوگا۔بلکہ یہ کائنات کی پیدائش کے سلسلے میں تدابیر پر تسلط کی طرف کنایہ ہے اور اس سلسلے میں واضح دلیل کے طور پر دو چیزوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے:ا۔قرآن مجید کی متعدد آیات میں کلمہ"استوائی"سے پہلے زمین و آسمان کی پیدائش اور یہ کہ خداوند متعال نے خلقت کے محل کو نامرئی ستونوں پر کھڑا کیا ہے،ذکر ہوا ہے۔
۲۔متعدد آیات میں کلمہ"استویٰ"کے بعد کائنات کے امور کی تدبیر کا ذکر آیا ہے۔چونکہ یہ جملہ دو مطلب یعنی کائنات کی پیدائش اور امور کی تدبیر کے درمیان واقع ہوا ہے۔اسلئے عرش پر مستقر ہونے کے لفظ سے اس معنیٰ کو پایا جاسکتا ہے جو قرآن بیان کرنا چاہتا ہے کہ ہستی کی پیدائش وہ بھی اس پوری عظمت کے ساتھ اس امر کا موجب نہیں بنی ہے کہ امور کی زمام خدا کے ہاتھ سے خارج ہوجائے بلکہ وہ خلقت کے علاوہ تدبیر کائنات

کی باگ ڈور بھی اپنے ہی دستِ قدرت میں رکھتا ہے اور ہم اس قسم کی آیات میں سے صرف ایک کا یہاں پر نمونے کے طور پر ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں:

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ...﴾ (یونس/۳)

''بیشک تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے زمین وآسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے پھراس کے بعد عرش پر اپنا اقتدار قائم کیا ہے وہ تمام امور کی تدبیر کرنے والا ہے اور کوئی اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔''(۱)

۱۔اس سلسلے میں سورہ رعد کی آیات ۲، سورہ سجدہ کی آیات ۴، اور سورہ اعراف کی آیات ۵۴ کا بھی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

چوتھا حصّہ

کلیات عقائد

(۳)

عدل الٰہی

۴۴ویں اصل:

تمام مسلمان خدا کو عادل جانتے ہیں اور عدل، خداوند متعال کے صفاتِ جمال میں سے ایک ہے۔اس عقیدے کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن مجید میں خدا سے ہر قسم کے ظلم کا سرزد ہونے کی نفی ہوئی ہے۔اور اسے اس عنوان سے یاد کیا گیا ہے کہ وہ ''عدل قائم کرنے والا'' ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔﴿إِنَّ اللهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾(نساء/۴۰)

''خدا کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا''

۲۔﴿إِنَّ اللهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا﴾ (یونس/۴۴)

''اللہ انسانوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔''

۳۔﴿شَهِدَ اللهُ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ أُولُو الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ (آل عمران/۱۸)

''اللہ خود گواہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، ملائکہ اور صاحبان علم گواہ ہیں کہ وہ عدل کے ساتھ قائم ہے۔''

مذکورہ آیات کے علاوہ عقل بھی واضح طور پر عدلِ الٰہی کے بارے میں فیصلہ

دیتی ہے۔ چونکہ عدل، صفتِ کمال ہے اور ظلم صفت نقص، اسلئے عقلِ انسانی فیصلہ دیتی ہے کہ خداوند متعال تمام کمالات کا مالک ہے اور اپنی ذات وفعل کی منزل پر ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک ومنزّہ ہے۔

اصولی طور پر ظلم وستم ہمیشہ مندرجہ ذیل عوامل میں سے کسی ایک کا معلول ہوتا ہے:

۱۔ ناآگاہی: یعنی فاعل، ظلم کے بد اور ناشایستہ ہونے سے آگاہ نہیں۔

۲۔ عجز ومجبوری: یعنی فاعل، ظلم کے برے ہونے سے آگاہ ہے لیکن عدل کو انجام دینے سے عاجز وناتوان ہے یا اس ظلم کو انجام دینے کے لئے مجبور ہے۔

۳۔ جہل وبیوقوفی: فاعل ظلم کے بد اور ناشائستہ ہونے سے واقف وآگاہ ہے اور عدل کو انجام دینے کی توانائی بھی رکھتا ہے، لیکن چونکہ عقلمند نہیں ہے لہٰذا ناشائستہ اور برا کام انجام دینے میں کوئی پروانہیں کرتا۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ عوامل میں سے کوئی ایک بھی ذاتِ خداندی کے شایان شان نہیں ہے، اسی لئے تمام افعالِ الٰہی عادلانہ وعاقلانہ ہیں۔

اس استدلال وبرہان کا ذکر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں بھی ہوا ہے(۱)۔

شیخ صدوقؒ ایک روایت میں لکھتے ہیں کہ ایک یہودی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چند سوالات کئے۔ ان میں ایک سوال عدلِ الٰہی کے بارے میں تھا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ وجہ بیان کرتے ہوئے کہ خداوند ظلم نہیں کرتا، فرمایا:

لعلمه بقبحه و استغنائه عنه(۲)۔

"چونکہ خداوند متعال ظلم کی بدی سے آگاہ ہے اور ظلم کرنے کا محتاج بھی نہیں ہے، لہٰذا ظلم نہیں کرتا۔"

۱۔ توحید صدوق، باب الاطفال، حدیث ۱۳، ص ۳۹۷، ۳۹۸)

۲۔ دعائے روز جمعہ میں آیا ہے: "وإنّما یعجل من یخاف الفوت وإنما یحتاج إلی الظلم الضعیف."

عدل کے قائل متکلمین نے بھی عدل الٰہی کی بحث میں اس برہان واستدلال سے استفادہ کیا ہے(۱)۔ ان آیات کی روشنی میں مسلمان عدل الٰہی پر اتفاق نظر رکھتے ہیں، لیکن اس کی تفسیر میں اختلاف سے دوچار ہوئے ہیں اور مندرجہ ذیل دو نظریوں میں سے ایک کو انتخاب کیا ہے: **الف**: انسان کی عقل افعال کے حسن و قبح کو محسوس کرتی ہے اور اچھے کام کو فاعل کے کمال کی علامت جانتی ہے اور برے کام کو اس کے نقص کی علامت جانتی ہے۔ خداوند متعال چونکہ ذاتاً تمام کمالات وجودی کا مالک ہے اسلئے اس کا ہر فعل کامل و پسندیدہ ہے اور اس کی ذات مقدس ہر قسم کے قبیح اور برے فعل سے منزّہ و پاک ہے۔ اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ عقل ہرگز خدا کے بارے میں کوئی حکم صادر نہیں کرتی اور کبھی نہیں کہتی کہ ''خدا کو عادل ہونا چاہئے'' بلکہ یہاں پر عقل کا کام خداوند متعال کے فعل کی حقیقت کا انکشاف کرنا ہے۔ یعنی چونکہ ذات باری تعالیٰ کمال مطلق اور ہر گونہ عیب و نقص سے منزّہ و پاک ہے۔ نتیجہ کے طور پر خداوند متعال اپنے بندوں سے عدل و انصاف کے ساتھ پیش آتا ہے۔ حقیقت میں مذکورہ قرآنی آیات بھی اسی چیز کی تائید و تاکید کرتی ہیں جیسے **عقل محسوس** کرتی ہے، اور یہ وہی مسئلہ ہے جو اسلامی علمِ کلام میں ''حسن قبح و عقلی'' کے نام سے مشہور ہے اور اس نظریہ کے حامیوں کو ''عدلیہ'' کہتے ہیں جن میں سرفہرست ''امامیہ'' ہیں۔ ب: اس نظریئے کے مقابلے میں ایک دوسرا نظریہ بھی ہے اور اس نظریہ کے مطابق انسان کی عقل و فہم ''افعالِ حسن وقبح'' کا ادراک۔ حتیٰ عمومی طور پر بھی۔ کرنے سے عاجز و ناتواں ہے اور ''حسن وقبح'' کو جاننے کا تنہا راستہ وحی الٰہی ہے، جس کام کے انجام دینے کا خدا حکم فرمائے وہ ''حسن'' ہے اور جس سے وہ نہی کرے وہ ''قبیح'' ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد پر اگر خداوند متعال حکم دے گا کہ ایک بے گناہ کو جہنم میں ڈالدیا جائے اور ایک

۱۔ کشف المراد، ص ۳۰۵۔

گناہ گار کو بہشت میں بھیجد یا جائے، تو یہ عین حسن وعدل ہوگا۔اس گروہ کا اعتقاد یہ ہے کہ اگر ہم خدا کو عادل جانتے ہیں تو صرف اس لئے کہ کتاب آسمانی (قرآن مجید) میں یہ وصف بیان ہوا ہے۔

۴۵ ویں اصل:

چونکہ مسئلہ ''حسن وقبح عقلی'' ہم شیعوں کے بہت سے عقائد کی بنیاد ہے، اس لئے ہم اس سلسلے میں موجود متعدد دلائل میں سے مختصر اور نمونے کے طور پر مندرجہ ذیل دو دلیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف: یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہر مسلک و مذہب سے تعلق رکھنے والا انسان دنیا کے جس کسی گوشے میں رہتا ہو، عدل وانصاف کی خوبی، ظلم وستم کی بدی، عہد و پیمان پر پابند رہنے کی اچھائی، عہد شکنی کی برائی اور حُسن (نیکی کا جواب نیکی سے دینے) وقبح (نیکی کا جواب بدی سے دینے) کو درک کرتا ہے۔تاریخ بشریت کا مطالعہ بھی اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے اور اس کے علاوہ آج تک اس امر کا مشاہدہ نہیں ہوا ہے کہ کسی عاقل انسان نے اس حقیقت کا انکار کیا ہو۔

ب: اگر ہم فرض کریں کہ عقل، افعال کے ''حسن وقبح'' کو درک کرنے میں کلی طور ناتواں اور عاجز ہے اور انسانوں کو تمام افعال کے حسن وقبح جاننے کے لئے شرع کی طرف رجوع کرنا چاہئے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ حسن وقبح شرعی بھی قابل اثبات نہیں۔اس کے علاوہ قرآنی آیات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انسانی عقل بعض افعال کے بارے

۱۔تجرید الاعتقاد میں محقق طوسی کی یہ عبارت اس برہان کی گواہ ہے جہاں انہوں نے کہا ہے: ''اگر حسن وقبح کو ثابت کرنے کا راستہ شرع تک محدود ہے تو افعال کا حسن وقبح کلی طور منتفی ہوگا اور شرع وعقل دونوں سے ثابت نہیں ہوگا۔

میں ''حسن وقبح'' کو درک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس بناء پر خداوند کریم، انسانی عقل وضمیر کو فیصلہ کی دعوت دیتا ہے۔جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ. مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾

(قلم/۳۶_۳۵)

''کیا ہم اطاعت گزاروں کو مجرموں جیسا بنادیں؟ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیسا فیصلہ کر رہے ہو؟''

﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ (الرحمن/۶۰)

''کیا احسان کا بدلہ احسان کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟''

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور ضروری ہے کہ اس سوال کا جواب دیا جائے۔خداوند عالم قرآن میں فرماتا ہے:

﴿لَايُسْئَلُ عَمَّايَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ﴾ (انبیا/۲۳)

''اس سے باز پرس کرنی والا کوئی نہیں ہے اور وہ ہر ایک کا حساب لینے والا ہے۔''

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند متعال اپنے آپ کو اس سے بالاتر جانتا ہے کہ اس سے باز پرس ہو۔لہٰذا اس سے جو بھی فعل سرزد ہو اس سے باز پرس نہ کی جائے گی، جبکہ حسن وقبح عقلی کی رو سے اگر فرض کرلیں کہ خدا کوئی قبح فعل انجام دیتا ہے تو اس سے سؤال کیا جائے گا، کہ کیوں ایسا کیا؟

جواب:

اس کی علت۔کہ خدا سے سؤال نہیں کیا جاسکتا۔یہ ہے کہ وہ حکیم ہے اور ایک فاعلِ حکیم سے ہرگز ناشائستہ فعل سرزد نہیں ہوتا اور حکیم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر وقت اس سے اچھے کام انجام پاتے ہیں۔اب چونکہ خدا سے باز پرس کرنے کا موضوع ہی باقی نہیں رہتا، اسلئے

اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس سے باز پرس کی جائے۔

۴۶ ویں اصل:

عدل الٰہی، تکوین، شرع اور جزا کے سلسلے میں مختلف مظاہر کا حامل ہے۔ان میں سے ہر ایک کے بارے میں ہم ذیل میں وضاحت کرتے ہیں:

الف: عدل تکوینی:

خداوند متعال ہر مخلوق کو اس کی صلاحیت اور لیاقت کے مطابق عطا فرماتا ہے۔اور اپنی عطا اور تفضل کے وقت استعداد و صلاحیتوں سے ہرگز چشم پوشی نہیں کرتا۔اس سلسلے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿رَبُّنَا الَّذِیٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾ (طٰہٰ/۵۰)

''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کے مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے۔''

ب: عدل تشریعی:

خداوند متعال پیغمبروں اور دینی قوانین پر مشتمل شریعت کو بھیج کر معنوی کمالات کے حصول کی صلاحیت رکھنے والے انسان کی ہدایت کرتا ہے۔اور اس پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (نحل/۹۰)

''بیشک اللہ، عدل، احسان اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور بدکاری، ناشائستہ حرکات اور ظلم سے منع کرتا ہے کہ شاید تم اسی

طرح نصیحت حاصل کرو۔"

چونکہ عدل، نیکی اور قرابت داروں کی مدد کرنا انسان کے کمال کا باعث ہے اسلئے خداوند متعال نے ان تین کاموں کو واجب قرار دیا ہے۔ اور چونکہ مؤخر الذکر تین کام، انسان کے زوال کا باعث بنتے ہیں اسلئے ان سے منع کیا ہے۔

اس طرح فریضہ الٰہی کے طاقت سے زیادہ نہ ہونے کے سلسلے میں ارشاد ہے:

﴿لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (مؤمنون/۶۲)

"اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

ج: عدل جزائی:

خداوند متعال مؤمن و کافر اور نیک و بد انسان کے ساتھ ہرگز یکساں برتاؤ نہیں کرتا بلکہ ہر انسان کو اس کی کارکردگی کے مطابق جزا و سزا دیتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق خداوند متعال جب تک پیغمبروں کے ذریعہ اپنا فریضہ لوگوں تک نہ پہنچائے اور اتمام حجت نہ کرلے ان کو ہرگز مؤاخذہ نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ (اسراء/۱۵)

"اور ہم تم پر اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کہ کوئی رسول نہ بھیج دیں۔"

مزید ارشاد ہے:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا﴾ (انبیاء/۴۷)

"اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو قائم کریں گے اور کسی نفس پر ادنیٰ ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

۴۷ ویں اصل:

خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کی خلقت کا ایک مقصد ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد وہی کمال مطلوب تک پہنچنا ہے، جو خدا کی عبادت و بندگی کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ اگر انسان کو اس مقصد تک پہنچنے کے لئے خدا کی طرف سے بعض مقدمات کا فراہم کیا جانا مشروط ہو تو خدا ان مقدمات کو فراہم کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان کی تخلیق بے مقصد ہو جائیگی۔ اس لئے خداوند متعال نے انسان کی ہدایت کیلئے پیغمبروں کو بھیجا اور واضح دلائل و معجزات ان کے اختیار میں دیئے اسی طرح خدا نے اپنے بندوں کو اطاعت کی ترغیب دینے اور معصیت سے بچانے کے لئے اپنے پیغاموں کے درمیان وعدہ و وعید دیئے ہیں۔
جو کچھ بیان ہوا وہ ''عدلیہ'' کے علم کلام میں ''قاعدہ لطف'' کا خلاصہ ہے کہ خود یہ قاعدہ ''حسن و قبح'' کے فروعات میں شمار ہوتا ہے، جو بہت سے اعتقادی مسائل کی بنیاد ہے۔

۴۸ ویں اصل:

قضا و قدر، اسلام کے قطعی اور نا قابل تنسیخ عقائد میں سے ہے جس کا ذکر قرآن و حدیث میں آیا ہے اور عقلی دلائل بھی اس کی تائید کرتی ہیں:
قدر کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَـٰهُ بِقَدَرٍ﴾ (قمر/۴۹)

''بیشک ہم نے ہر شے کو ایک اندازہ کے مطابق پیدا کیا ہے۔''

مزید ارشاد ہے:

﴿وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَآئِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ﴾ (حجر/۲۱)

''اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کے ہمارے پاس خزانے نہ
ہوں اور ہم ہر شے کو ایک معین مقدار میں ہی نازل کرتے ہیں۔''

قضا کے بارے میں یوں ارشاد ہے:

﴿وَاِذَاقَضیٰ اَمْرًافَاِنَّمَایَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (بقرہ/۱۱۷)

''اور جب (خدا) کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو صرف ''کن''
(ہوجاؤ) کہتا ہے اور وہ چیز ہوجاتی ہے۔''

مزید فرماتا ہے:

﴿هُوَالَّذِی خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰٓ اَجَلًا﴾ (انعام/۲)

''وہ، وہ خدا ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر ایک مدت
کا فیصلہ کیا ہے۔''

ان آیات اور اس بارے میں موجود متعدد روایات کے پیش نظر کوئی بھی مسلمان قضا وقدر سے انکار نہیں کرسکتا ہے۔ اس مسئلے کی جزئیات کی وضاحت ضروری نہیں ہے۔ خاصکر ان افراد کے لئے جو ایسے مسائل کو درک کرنے یا سمجھنے کی صلاحیت وقدرت نہیں رکھتے، کیونکہ ممکن ہے ایسے افراد اپنے عقیدہ کے بارے میں غلط فہمی اور شک وتردید سے دوچار ہوجائیں۔

اسی وجہ سے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام ایسے طبقے سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:

طريقٌ مظلمٌ فلاتسلكوه، وبحرٌ عميقٌ فلاتلجوه وسرُّ
اللهِ فلاتتكلّفوه (نہج البلاغہ کلمات قصار/۲۸۷)

''یہ ایک تاریک راستہ ہے اس پر نہ چلئے، یہ ایک عمیق سمندر ہے
اس میں نہ کودیئے، یہ ایک سرّ الٰہی ہے اس کو کشف کرنے کے لئے

اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالئے۔"

لیکن امام علیہ السلام کا یہ انتباہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اس قسم کے باریک معارف کو سمجھنے اور درک کرنے کی طاقت اور صلاحیت نہیں رکھتے ہیں تا کہ اس قسم کی بحث ایسے لوگوں کے لئے گمراہی کا باعث نہ بنے۔اس مطلب کی دلیل یہ ہے کہ کئی دوسرے موقع پر خود امیرالمؤمنین علیہ السلام نے قضاوقدر کے بارے میں تفصیلاً وضاحت فرمائی ہے(۱)

لہٰذا ہم بھی اپنی معرفت کی حدود میں قرآن مجیداور روایات سے استفادہ کر کے عقل کی مدد سے اس سلسلے میں چند توضیحات بیان کرتے ہیں۔

۴۹ ویں اصل:

لغت میں "قدر" اندازہ ومقدار کے معنی میں ہے،اور "قضا" حتمیت وقطعیت کے معنی میں ہے(۲)۔

آٹھویں امام حضرت علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام "قضاوقدر" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قدر کے معنی کسی چیز کا بقاء وفنا کے لحاظ سے اندازہ کرنا ہے اور قضا کسی چیز کی قطعیت وحقیقت حاصل ہونا ہے۔(۳)

اب جبکہ ان دوکلمات کے معنی معلوم ہوئے اور ہم نے جان لیا کہ چیزوں کا اندازہ کرنا "قدر" ہے اوراس کی قطعیت یاواقع ہونے کو "قضا" کہتے ہیں۔اب ہم ان دوکلموں کے اصطلاحی معنی کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

۱۔توحید صدوق،باب ۶۰،حدیث ۲۸،نہج البلاغہ،کلمات قصار ۸۸۔

۲۔مقائیس اللغۃ،ج ۵ص ۶۳،۹۳،مفردات راغب،مادہ قدر وقضا۔

۳۔کافی،۱/۱۵۸۔

الف: ''قدر'' کی تفسیر

مخلوقات میں سے ہر ایک شئے، اس لحاظ سے کہ ممکن الوجود ہے، اپنے وجود کی ایک خاص حد اور خاص اندازہ رکھتی ہے، مثلاً جمادات کی ایک طریقے سے اندازہ گیری ہوتی ہے اور نباتات وحیوانات کی دوسرے طریقے سے اس کے علاوہ چونکہ ہر اندازہ شدہ شئے، مخلوق خدا ہے، اس لئے قدرتی طور یہ ''تقدیر'' یا اندازہ گیری بھی تقدیر الٰہی ہوگی۔ ساتھ ہی یہ مقدار اور اندازہ چونکہ فعل خداوند متعال ہے اس لئے اسے ''تقدیر وقدر فعلی'' کہا جاتا ہے اور اس لحاظ سے کہ خداوند اس کی تخلیق سے پہلے اس سے آگاہ رہا ہے، اس لئے یہ ''تقدیر وقدر فعلی'' ہوگی۔ حقیقت میں، قدر کا عقیدہ اشیاء کی خصوصیت کے لحاظ سے خداوند متعال کی خالقیت کا عقیدہ ہے اور اس ''تقدیر فعلی'' کی بنیاد خداوند عالم کا علم ازلی ہے، نتیجہ کے طور پر قدر علمی کا عقیدہ در حقیقت اس کے علم ازلی کا عقیدہ ہے۔

ب: قضا کی تفسیر:

جیسا کہ ہم نے بیان کیا، قضا کے معنی کسی شئے کے وجود کی قطعیت ہے۔ بیشک ہر شے کے وجود کی قطعیت، نظام علت ومعلول کی بنیاد پر اس شے کی علت تام کے متحقق ہونے کا سبب ہے۔ اور چونکہ نظام علت ومعلول خداوند متعال پر تمام ہوتا ہے اسلئے حقیقت میں ہر شئے کی قطعیت خدا کی قدرت اور مشیت پر مبنی ہے۔ یہ قضائے الٰہی فعل وتخلیق کے مقام پر ہے، اور اس حتمیت کے سلسلے میں خدا کا علمِ ازلی، دراصل اس کی قضا ذاتی ہے۔
جو کچھ بیان ہوا وہ خدا کی تکوینی قضاوقدر سے مربوط ہے چاہے وہ ذاتی ہو یا فعلی۔ لیکن بعض اوقات قضاو قدر عالم شریعت سے مربوط ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ دراصل شریعت اور فریضہ الٰہی قضائے الٰہی ہے اسلئے اس کی حالت و خصوصیت جیسے واجب وحرام وغیرہ بھی تقدیر شرعی الٰہی ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک شخص نے حقیقت قضاو قدر کے بارے میں سوال کیا۔ مولا علیہ السلام نے اس کے جواب میں قضاوقدر

کے مذکورہ مرحلہ کی وضاحت یوں فرمائی:

''قضاوقدر کا مقصد اطاعتِ امر اور معصیت سے نہی، نیک کام انجام دینے اور ناشائستہ وناپسند کام کو ترک کرنے کے لئے انسان کی تقویت کرنا اور اسے ترغیب کرنا، انسان کو قرب الٰہی حاصل کرنے کی توفیق بخشنا اور گناہکار کو اپنے حال پر چھوڑنا اور وعدوعید ہے۔ یہ ہمارے افعال میں خداوندمتعال کی قضاوقدر ہے۔''(۱)۔

یہاں پر امیر المؤمنین علیہ السلام نے سائل کے جواب میں فقط شرعی قضاوقدر کی وضاحت پر اکتفا کی ہے۔ شاید اس کی علت یہ ہو کہ مولا علیہ السلام نے سائل یا حضار مجلس کی سطح فکری کی رعایت فرمائی ہو۔ کیونکہ اس زمانے میں قضاوقدر تکوینی اور نتیجہ میں انسان کے افعال قضاوقدر کی قلمرو میں قرار پانے کو جبر اور سلب اختیار سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس امر کی دلیل حضرت علیہ السلام کی اس حدیث کا آخری حصہ ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں:

واما غیر ذلک فلاتظنّه فانّ الظن له محبط الاعمال

''اس کے علاوہ کسی اور قسم کا گمان نہ کرنا، کیونکہ اس قسم کا گمان اعمال کے ضائع ہونے کا باعث بن جاتا ہے۔''

مقصد یہ ہے کہ انسان کے اعمال کی قدروقیمت اس پر ہے کہ اس کے اعمال کی بنیاد اس کے مختار ہونے پر ہے۔ اگر اعمال میں جبر فرض کرلیں تو یہ قدروقیمت ختم ہوجاتی ہے۔

نتیجہ کے طور پر قضاوقدر بعض اوقات تکوینی ہے اور بعض اوقات شرعی اور یہ دونوں قسم بھی دو مرحلوں پر مشتمل ہیں:

۱۔ ذاتی (علمی)

۲۔ فعلی

۱۔ توحید صدوق/۳۸۰۔

۵۰ویں اصل:

انسان کے افعال میں اختیار وآزادی سے قضاوقدر کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ کیونکہ انسان کے بارے میں تقدیر الٰہی، اس کی وہی مخصوص فاعلیّت ہے۔ یعنی وہ ایک فاعلِ مختار وصاحب ارادہ ہے اور ہر کام کا انجام دینا یا اسے ترک کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ انسان کے فعل کے بارے میں قضائے الٰہی انسان کے اختیار وارادے کے بعد اسکے فعل کی قطعیت و حتمیت ہے۔

دوسری تعبیر یہ ہے کہ: انسان کی تخلیق اختیار وآزادی کے ساتھ ملی جلی اور اندازہ شدہ ہے اور قضائے الٰہی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اگر انسان اپنے اختیار کے ساتھ کسی فعل کو انجام دینے کے اسباب فراہم کرے خدا کی طرف سے اس فعل کی تنفیذ اسی طریقے سے انجام پاتی۔

بعض افراد اپنے گناہوں کو تقدیر الٰہی کی پیداوار سمجھتے ہیں اور تصوّر کرتے ہیں کہ جس راہ پر وہ چلے ہیں اسکے علاوہ کوئی اور طریقہ ان کے اختیار میں نہ تھا، جبکہ عقل ووحی کی رو سے اس طرح کے تصوّر کی مذمت کی گئی ہے۔ کیونکہ عقل کی رو سے انسان اپنے ارادے سے اپنی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے اور شرع کی نظر میں بھی وہ ایک شکر گزار اور نیک کردار یا کافر وبدکردار ہوسکتا ہے، جیسکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا هَدَيْنَٰهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ (انسان/۳)

”یقیناً ہم نے اسے راستہ کی ہدایت دیدی ہے، چاہے وہ شکر گزار ہوجائے یا کفران نعمت کرنے والا ہوجائے۔“

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بت پرستوں کا ایک گروہ اپنی گمراہی کا بعد مشیت الٰہی کو سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر مشیت الٰہی نہ ہوتی تو ہم بت پرست نہ ہوتے۔ قرآن مجید ان کے اس تصور کے بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

﴿سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْشَآءَ اللهُ مَآ أَشْرَكْنَا وَلَآ ءَابَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَامِن شَيْءٍ﴾ (انعام/۱۴۸)

''عنقریب یہ مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم مشرک ہوتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے''

اس کے بعد ان کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا﴾

(انعام/۱۴۸)

''اسی طرح ان سے پہلے والوں نے بھی جھوٹ کہا تھا یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا''

آخر میں اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ تخلیق کائنات میں، بعض اوقات سنت الٰہی انسان کی سعادت وخوشبختی اور بعض اوقات زیان وبدبختی کا باعث بنتی ہے۔ یہ قضاوقدر الٰہی کے مظاہر ہیں اور یہ خود انسان ہے کہ اپنے اختیار وارادہ سے ان دوراہوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس سے پہلے بھی ہم ''انسان اسلام کی نظر میں'' موضوع کے تحت کچھ مطالب بیان کرچکے ہیں۔

انسان واختیار

۵۱ ویں اصل:

انسان کی آزادی واختیار ایک مسلم اور واضح حقیقت ہے اور اسے مختلف طریقوں سے درک کیا جاسکتا ہے کہ ذیل میں، ہم ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف: ہر انسان کا ضمیر ووجدان اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ وہ کسی بھی فعل کوانجام دینے یا ترک کرنے میں سے کسی ایک کوانتخاب کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس واضح ومسلم ادراک کے بارے میں شک وشبہہ کرے تو اسے کسی بھی بدیہی اور واضح حقیقت کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔

ب: انسانی معاشرے میں مختلف افراد کے سلسلے میں کی جانے والی تعریف وتمجید یا ملامت و مذمت۔ دینی یا غیر دینی۔ اس بات کی دلیل ہے کہ تعریف یا مذمت کرنے والا شخص فاعل کو اس کے افعال میں مختار جانتا ہے۔

ج: اگر انسان کی آزادی واختیار کی حقیقت کونظر انداز کیا جائے تو شریعت کا نظام بھی بیہودہ وبے ثمر ہوگا۔ کیونکہ اگر انسان اس امر پر ناچار ہو کہ اسی راہ پر چلے جو اس کے لئے قبل از وقت معین ہوچکی ہے اور اس سے ذرہ برابر تجاوز اور خلاف ورزی نہیں کرسکتا تو اس صورت میں، امر ونہی، وعدو وعید اور جزاوسزا سب بے معنی ہوکردہ جائیں گے اور ان کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔

د: پوری تاریخ میں ہمیں ایسے انسان ملتے ہیں جنہوں نے انفرادی اور اجتماعی طور انسانی معاشرے کی اصلاح کے لئے جدوجہد کی ہے، اور اس کے نتائج بھی حاصل کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ امر انسان کے مجبور ہونے کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا، کیونکہ جبر کے مفروضہ سے یہ ساری جدوجہد بیہودہ و بیکار ہوں گی۔

مذکورہ چار دلیلیں اختیار کے اصول کو ایک مستحکم اور ناقابل تردید حقیقت ثابت کرتی ہیں۔

لیکن آزادی واختیار کے اس اصول سے ہمیں یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ انسان کو بالکل اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کے فعل میں خداوندمتعال کا کوئی عمل دخل اور اثر نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کا عقیدہ جسے "تفویض" کہا جاتا ہے، انسان کے خدا کی طرف ہمیشہ نیازمند و حاجتمند ہونے کے اصول سے ٹکراتا ہے اور خداوندمتعال کی قدرت وخالقیت کے دائرے کو محدود کرتا ہے۔ دراصل حقیقت کچھ اور ہے۔ آنیوالی اصل میں اسکی وضاحت کی جائے گی۔

۵۲ ویں اصل:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جو مسائل مسلمانوں کے درمیان زیر بحث آئے، ان میں انسان سے صادر ہونے والے افعال کی حالت وحقائق کا مسئلہ بھی تھا۔ ایک گروہ نے جبر کے عقیدہ کو انتخاب کر کے انسان کو ایک مجبور فاعل سمجھا تھا۔ اور دوسرا گروہ اس کے برعکس عقیدہ رکھتا تھا اور تصور کیا گیا تھا کہ انسان اپنے افعال کی انجام دہی میں بالکل آزاد و مختار ہے اور اس کے کام میں خداوندمتعال کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ دونوں گروہ یہ تصور کرتے تھے کہ فعل یا فقط انسان سے مربوط ہونا چاہئے یا خدا سے۔ یعنی یا انسان کی قدرت، فعل میں مؤثر ہوگی یا خدا کی قدرت۔

جبکہ یہاں پر ایک تیسرا راستہ بھی موجود ہے جس کی طرف ہمارے معصوم اماموں علیہم السلام نے راہنمائی فرمائی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

لا جبر ولا تفویض ولکن امر بین الامرین.

''نہ جبر ہے اور نہ 'تفویض' بلکہ ان دو امور کے درمیان ایک تیسری چیز ہے۔''

یعنی فعل، انسان سے مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ خدا سے بھی وابستہ ہے۔ کیونکہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے ساتھ ہی فاعل اور اس کی طاقت، مخلوقِ خدا بھی ہے تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا کہ فعل کو خدا سے جدا کیا جائے؟

انسان کے فعل کی حقیقت بیان کرنے میں اہل بیت علیہم السلام کا شیوہ وہی ہے جو قرآن مجید میں بیان ہو چکا ہے۔ یہ کتابِ الٰہی ایک فعل کو انسان سے نسبت دینے کے ساتھ ساتھ اسے خدا سے بھی منسوب کرتی ہے۔ یعنی دونوں صورتوں کو ایک ساتھ قبول کرتی ہے۔ جیسا ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی﴾ (انفال/۱۷)

''اور (پیغمبر) جس وقت آپ نے سنگریزے پھینکے، آپ نے سنگریزے نہیں پھینکے ہیں بلکہ خدا نے پھینکے ہیں''

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی کام انجام دیا تو اپنی مستقل طاقت سے انجام نہیں دیا۔ بلکہ خدا کی طاقت سے اسے انجام دیا ہے۔ اسلئے یہ دونوں نسبتیں صحیح اور درست ہیں۔

۱۔ توحید صدوق، باب ۵۹، حدیث ۸۔

دوسرے الفاظ میں ہر مخلوق میں خدا کی قدرت ویسے ہی دخیل ہے جیسے بجلی کے تار میں بجلی کا کرنٹ، جس کا سرچشمہ بجلی گھر ہوتا ہے،لیکن بٹن ہم دباتے ہیں تب بجلی کا بلب روشن ہوتا ہے۔پس اگر ہم یہ کہیں کہ بجلی کے بلب کو ہم نے روشن کیا ہے تو صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے اگر کہا جائے کہ بجلی کے بلب کی روشنی برقی رو سے وجود میں آئی ہے۔

۵۳ویں اصل:

ہم انسان کے اختیار و آزادی کا عقیدہ رکھنے کے ساتھ ساتھ، اس امر کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ خداوند متعال ازل سے ہمارے افعال سے آگاہ تھا اور یہ دو عقائد آپس میں کسی صورت بھی ٹکراؤ نہیں رکھتے۔

دوسرے الفاظ میں علم الٰہی، جس طرح انسان سے فعل صادر ہونے کے اصول سے مربوط ہے، اسی طرح اس سے فعل صادر ہونے کی کیفیت (اختیار و انتخاب) سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ایسا علم ازلی، نہ فقط انسان کے اختیار و آزادی سے منافات نہیں رکھتا ہے بلکہ اسے استحکام و پائداری بخشتا ہے، کیونکہ اگر انسان سے فعل، اختیاری طور صادر نہ ہو، تو اس صورت میں علمِ خدا کا مظاہرہ نہیں ہوگا۔علم کی حقیقت نمائی یہی ہے کہ جس چیز سے وہ تعلق رکھتا ہے وہی واقع ہوجائے۔لہٰذا اگر علم الٰہی کا تعلق اس سے ہو کہ انسان کا فعل اختیاری صورت میں اس سے صادر ہوجائے، یعنی انسان آزادی کے ساتھ اس عمل کو انجام دے، تو اس صورت میں فعل اسی خصوصیت کے ساتھ وقوع پذیر ہونا چاہئے نہ کہ اضطرار و جبر کے ساتھ۔

پانچواں حصہ

کلیات عقائد

(۴)

نبوت عامہ

ضرورت نبوت کے دلائل

۵۴ ویں اصل:

خداوند حکیم نے بلند مرتبہ شخصیتوں کو بشر کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے اپنے پیغام کے ساتھ بھیجا ہے۔ یہ وہی پیغمبر اور رسول ہیں، جو خدا کی طرف سے بندوں کیلئے فیض و ہدایت کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ انسان میں اس فیض و برکت سے استفادہ کی لیاقت پیدا ہونے کے ابتدائی ایام سے ہی خدا کی طرف سے یہ فضل و کرم نازل ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ ختمی مرتبت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک جاری رہا۔ یہ امر مسلم ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اس کے زمانہ وامت کے مطابق مکمل ترین دین تھا اور اگر فیض الٰہی کا یہ سلسلہ جاری نہ رہتا تو انسان ہرگز اپنی ارتقائی منازل تک نہیں پہنچ سکتا۔

چونکہ انسان کی خلقت، خدائے حکیم کا فعل ہے، اس لئے فطری طور انسان کی تخلیق ایک ھدف اور مقصد کی حامل ہے۔ اور انسان کے وجود میں خواہشات، جن میں وہ حیوانات کے ساتھ مشترک ہے، کے علاوہ عقل و فہم بھی ہے اس لئے اس کی خلقت کا ایک عاقلانہ مقصد ہونا ضروری ہے۔

دوسری طرف انسان کی عقل وفہم اس کے ارتقائی منازل طے کرنے میں موثر اور ضروری ہے، لیکن کافی نہیں ہے، اور اگر انسان کی ہدایت کے سلسلے میں صرف عقل وفہم پر اکتفا کی جائے تو وہ ہرگز مکمل طور پر راہ کمال کو نہیں پہچان سکتا۔ مثال کے طور پر انسان کے اہم ترین فکری مسائل میں اس کا اپنے مبدأ ومعاد کو جاننے کا مسئلہ ہے۔ انسان جاننا چاہتا ہے کہ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اور کہاں جائے گا؟ لیکن ان سوالات کا خاطر خواہ جواب صرف عقل وفہم سے ممکن نہیں ہے۔ اس امر کی واضح دلیل یہ ہے کہ عصر جدید کے انسان کی علم وسائنس کے میدانوں میں نمایاں ترقی کے باوجود انسانوں کی ایک بڑی تعداد ابھی بھی بت پرست ہے۔

انسانی عقل وفہم کا نقص صرف مبدأ ومعاد کے موضوع تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انسان اپنی زندگی کے بہت سے دیگر اہم مسائل مین بھی کوئی صحیح اور مستحکم طریقہ انتخاب نہ کر سکا۔ اقتصادی، اخلاقی اور خاندانی مسائل میں مختلف انسانوں کے درمیان اختلاف اور تناقض اس بات کی دلیل ہے کہ انسان ان مسائل کو صحیح درک نہیں کر سکا ہے، اور اسی وجہ سے مختلف اور ضد ونقیض مکاتب فکر وجود میں آئے ہیں۔

مذکورہ بالا نکات کے تناظر میں عقل فیصلہ دیتی ہے کہ حکمت الٰہی کے پیش نظر خدا کی طرف سے مربّی و رہبر مبعوث ہونا ضروری ہے تا کہ بشر کو زندگی کی صحیح راہ کی طرف ہدایت وراہنمائی کریں۔

جو یہ تصور کرتے ہیں کہ عقل کی راہنمائی آسمانی ہدایت وراہنمائی کی نعم البدل بن سکتی ہے، ان کو چاہئے کہ ذیل میں درج دو نکات کی طرف توجہ کریں:

۱۔ بشر کی عقل وفہم، انسان، اسرار ہستی اور اس کے وجود کے ماضی وحال کو مکمل طور پہچاننے میں ناقص ونارسا ہے، جبکہ انسان کو پیدا کرنے والا (خالق) اس اصول کے تحت، کہ ہر صانع اپنے مصنوع کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ انسان اور اس کے وجودی پہلوؤں کے بارے میں

آ گاہ ہے۔اس دلیل کی طرف اشرہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (ملک/۱۴)

''اور کیا پیدا کرنے والا (اپنی مخلوق کو) نہیں جانتا ہے جبکہ وہ لطیف بھی ہے اور خبیر بھی ہے؟''

۲۔انسان فطری طور اپنی ذات سے محبت کے ناطے دانستہ یا نادانستہ طور پر ہمیشہ اپنے ذاتی منافع کی فکر میں رہتا ہے اور اپنی منصوبہ بندی میں اپنے ذاتی و گروہی منفعت سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔لہٰذا فطری طور پر بشر کی منصوبہ بندی ہر لحاظ سے کامل نہیں ہوسکتی۔لیکن پیغمبروں کا منصوبہ اور پروگرام، چونکہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے،اسلئے وہ نقص سے پاک ومنزّہ ہوتا ہے۔

ان دونکات کے پیش نظر یہ امر مسلم ہے کہ انسان کبھی بھی خدا کی ہدایت اور پیغمبروں کے منصوبوں سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

قرآن اور نبوت کے مقاصد

۵۵ویں اصل:

گذشتہ اصل میں ہم عقل کے فیصلہ کی روشنی میں انبیاء کی بعثت کی ضرورت سے آگاہ ہوئے۔اب ہم نبوّت کی ضرورت کو اس کی اہمیت کے پیش نظر آیات وروایات کی روشنی میں بیان کرتے ہیں،اگر چہ اس مسئلے میں قرآن مجید کا نقطہ نظر بھی ایک عقلی تجزیہ ہے۔

قرآن مجید نے انبیاء کی بعثت کے مقصد کے سلسلے میں مندرج ذیل امور بیان کئے ہیں:

۱۔توحید کی بنیادوں کا استحکام اور اس سلسلے میں ہر قسم کے انحرافات کا مقابلہ کرنا۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّٰغُوتَ﴾(نحل/۳۶)

''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔''

اس لحاظ سے انبیاء الٰہی مشرکین سے مسلسل برسر پیکار رہے ہیں اوراس راہ میں انہوں نے سخت مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کی ہیں۔

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام بعثت انبیاء کے مقصد کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

ولیعقل العبادُعن ربّهم ماجهلوه،فیعرفوه بربوبیته بعدماانکروا، و یوحدوه بالالوهیة بعد ماعندوا.(۱)

''اس نے پیغمبروں کو بھیجا تا کہ اس کے بندے توحیداورصفاتِ خدا کے بارے میں جوکچھ نہیں جانتے سیکھ لیں اور انکاروعناد سے اجتناب کے بعد خداکی وحدانیت،ربوبیت اور خالقیت پرایمان لائیں۔''

۲۔لوگوں کومعارف وفرمان الٰہی،پیغام الٰہی اورتزکیۂ نفس کے طریقہ کار سے آگاہ کرنا۔

اس سلسلے میں ارشادہوتا ہے:

﴿هُوَالَّذِی بَعَثَ فِی الْأُمِّیّنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ یَتْلُواعَلَیْهِمْ آیَٰتِهِ وَیُزَکِّیهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَٰبَ وَالْحِکْمَةَ﴾ (جمعہ/۲)

''اس خدانے مکہ والوں میں سے ایک رسول بھیجاہے جوانہی میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے،ان کے نفوس کوپاکیزہ بنائے اورانہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔''

۳۔انسانی معاشرے میں عدل وانصاف نافذکرنا۔

اس سلسلے میں ارشادہوتا ہے:

﴿لَقَدْأَرْسَلْنَارُسُلَنَا بِالْبَیِّنَٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتَٰبَ وَالْمِیزَانَ لِیَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (حدید/۲۵)

''بیشک ہم نے اپنے رسولوں کوواضح دلائل کے ساتھ بھیجاہے اوران

۱۔نہج البلاغہ،خطبہ ۱۴۳۔

کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تا کہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔''

بے شک عدل وانصاف کا قیام اس امر پر مشروط ہے کہ لوگ پہلے انصاف کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے جانکاری حاصل کریں اور حکومت الٰہی کے ذریعہ اس کو عملی جامہ پہنائیں۔

۴۔اختلافات کا فیصلہ کرنا۔

اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾

(بقرہ/۲۱۳)

''(فطری اعتبار سی) سارے انسان ایک قوم تھے۔پھر اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرنے والے انبیاء بھیجے اوران کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تا کہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں۔''

ظاہر ہے کہ لوگوں کے اختلافات صرف عقائد تک محدود نہیں ہوتے، بلکہ اس کے اثرات زندگی کے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوتے ہیں

۵۔بندوں پر اتمام حجت۔

ارشاد ہوتا ہے:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ (نساء/۱۶۵)

''یہ سارے رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اس لئے بھیجے

گئے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد انسان خدا کی بارگاہ میں کوئی
عذر یا حجت نہ پیش کر سکیں اور خدا سب پر غالب اور صاحب حکمت
ہے۔"

بیشک خداوندمتعال انسان کی تخلیق میں ایک خاص مقصد اور ھدف رکھتا ہے۔یہ مقصد صحیح وکامل منصوبہ بندی کے ذریعہ انسان کی زندگی کے تمام شعبوں میں عملی جامہ پہن سکتا ہے۔اور یہ منصوبہ خدا کی طرف سے انسان تک اس طرح پہنچنا چاہئے کہ اس پر حجت تمام ہو جائے اور اس کے بعد انسان کیلئے اس بہانے کی گنجائش باقی نہ رہے کہ "میں زندگی کی صحیح راہ ورسم کو نہیں جانتا تھا۔"

انبیاء کو پہچاننے کے طریقے

۵۶ ویں اصل:

انسانی طبیعت کا تقاضا ہے کہ کسی بھی ادعا کو دلیل وثبوت کے بغیر قبول نہ کیا جائے اور دلیل وبرہان کے بغیر کسی بھی ادعا کو قبول کرنا انسانی فطرت کے خلاف عمل ہے۔انسان کے لئے سب سے عظیم ادعا، نبوت کا ادعا ہے۔قدرتی طور اس قسم کے عظیم ادعا کے ثبوت میں مستحکم اور پائیدار دلیل ہونی چاہئے۔یہ دلیل درج ذیل امور میں سے ایک ہوسکتی ہے:

الف: گزشتہ پیغمبر، جس کی نبوت مستحکم دلائل سے ثابت ہوچکی ہو، آنیوالے پیغمبر کے بارے میں صراحت سے پیشگوئی کرے۔جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے میں صراحت سے پیشگوئی کرتے ہوئے ان کی تشریف آوری کی بشارت دی تھی(۱)۔

ب: نبوت کا ادعا کرنے والے کی صداقت کے سلسلے میں گونا گون قرائن وشواہد پائے جائیں۔ان دلائل کو مدعی کی سیرت، دعوت کی حقیقت، پیروی کرنے والوں کی شخصیت اور دعوت کے طریقہ کار سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔آج دنیا بھر کی عدالتوں میں حق وباطل اور مجرم وبے

۱۔ سورہ صف/ ۶

گناہ کی پہچان کے لئے اسی طریقہء کار سے استفادہ کیا جاتا ہے اور صدر اسلام میں بھی اسی طریقہ کار سے پیغمبر اسلامؐ کی حق گوئی کو سمجھتے تھے۔(۱)

ج: معجزہ۔یعنی نبی اپنی نبوت کے ادعا کے ساتھ ساتھ کوئی غیر معمولی کام انجام دے اورلوگوں کواپنی دعوت کے سلسلے میں چلینج کرے اور یہ غیر معمولی کام اس کی دعوت کے متناسب ہو۔

پہلے دوطریقے عام نہیں ہیں،جبکہ تیسرا طریقہ عمومی ہے اور انبیاء کی پوری تاریخ میں،بشرنے انبیاء کوپہچاننے میں اسی طریقہ سے استفادہ کیاہے اور خود انبیاء نے بھی اپنی نبوت کے ثبوت میں اسی دلیل سے استفادہ کیاہے۔

۵۷ ویں اصل:

معجزہ اور نبوت کے ادعا کے درمیان ایک منطقی رابطہ ہے۔کیونکہ اگر معجزہ پیش کرنے والا اپنے دعویٰ میں سچا ہوتو قدرتی طور پر مطلب ثابت ہوجائے گااور اگر بالفرض وہ اپنے دعوی میں جھوٹا ہو،تو خداوند حکیم۔جواپنے بندوں کی ہدایت کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔کے یہ شایان شائن نہیں ہے کہ ایسے فردکو ایسی طاقت عطا کرے۔کیونکہ لوگ اس غیر معمولی طاقت کا مشاہدہ کرکے اس پر ایمان لاتے ہیں اوراس کی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔اسلئے اگر وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہوتو،لوگوں کو گمراہ کرے گااور یہ امر عدل وحکمت الٰہی کے منافی ہے۔یہ مسئلہ قاعدہ ''حسن وقبح عقلی'' کے فروعات میں سے ہے جس پر پہلے بحث ہوچکی ہے۔

۱۔ اس راہ کی تلاش کرنے والا قیصر روم کا بادشاہ تھا تاریخ طبری ۳ ر ۲۴۰ حوادث سال ششم ہجری)

۵۸ویں اصل:

دعوائے نبوت کے ساتھ اس کے متناسب انجام پانے والا غیر معمولی عمل ''معجزہ'' کہلاتا ہے لیکن اگر کوئی غیر معمولی عمل، نبوت کا دعویٰ نہ کرنیوالے خدا کے کسی صالح بندہ سے انجام پائے تو اُسے ''کرامت'' کہتے ہیں۔ اس امر کی دلیل کے طور پر کہ (انبیاء کے علاوہ) خدا کے صالح بندے بھی غیر معمولی عمل انجام دے سکتے ہیں، حضرت مریم علیھا السلام پر آسمانی رزق کا نازل ہونا اور حضرت سلیمان کے ایک نامور صحابی (آصف برخیا) کے ذریعہ ملکہء سبا کا تخت ایک لحہ کے اندر یمن سے فلسطین منتقل ہونا، نمونہ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں واقعات کے بارے میں قرآن مجید میں ذکر موجود ہے۔

حضرت مریم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِاللهِ﴾ (آل عمران/۳۷)

''جب ذکریا محراب عبادت میں داخل ہوتے تو مریم کے پاس رزق دیکھتے اور پوچھتے کہ یہ کہاں سے آیا؟ اور مریم جواب دیتیں کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔''

اور تخت بلقیس کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتٰبِ أَنَا ءَاتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ (نمل/۴۰)

''اور ایک شخص نے، جس کے پاس کتاب کا ایک حصہ علم تھا، اس نے کہا کہ میں اتنی جلدی لے آؤں گا کہ آپ کی پلک بھی نہ جھپکنے پائے۔''

۵۹ ویں اصل:

معجزہ اور دیگر غیر معمولی اعمال کے درمیاں فرق کا خلاصہ مندرجہ ذیل صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے:

الف: عدم تربیت

معجزہ پیش کرنے والا شخص کسی قسم کی سابقہ تربیت وتعلیم کے بغیر معجزہ دکھاتا ہے، جبکہ دیگر غیر معمولی کام ایک مسلسل تربیت اور مشق کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ابن عمران جوانی کے دن گزارنے کے بعد عازم مصر ہوئے۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد نبوت ورسالت پر مبعوث ہوئے، اور ان سے خطاب ہوا: ''اے موسیٰ اپنے عصا کو زمین پر مارو'' جوں ہی حضرت موسیٰ نے عصا کو زمین پر مارا، ایک دم عصا ایک بڑے اژدھا میں تبدیل ہوگیا حتیٰ خود حضرت موسیٰ بھی اسے دیکھ کر ڈر گئے۔ اس کے بعد موسیٰ سے خطاب ہوا کہ: ''اپنے ہاتھ کو اپنی بغل سے باہر لاؤ'' جوں ہی موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کیا تو اس کے ہاتھ سے ایک نور چمکا جس سے آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوگئی۔ (قصص/۳۲۔۳۱)

لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کے جادوگروں کے بارے میں بیان ہوتا ہے:

﴿یُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ...فَیَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَایُفَرِّقُونَ بِهِ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهِ﴾ (بقرہ/۱۰۲)

''جو لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے۔۔۔لوگ ان سے وہ باتیں سیکھتے تھے جس سے میاں بیوی کے درمیان جھگڑا کرادیں۔''

ب: ناقابل تردید۔

چونکہ معجزہ کا سرچشمہ خدا کی لامحدود قدرت ہوتی ہے اس لئے یہ ایک ناقابل تردید اور بے مثل

کام ہوتا ہے، جبکہ جادو اور سحر جیسے کام جنھیں جوگی وغیرہ انجام دیتے ہیں، چونکہ انسان کی محدود قدرت سے مربوط ہوتے ہیں اسلئے قابل تردید اور قابل مثال ہوتے ہیں۔

ج: لامحدودیت۔

انبیاء کے معجزہ محدود قسم کے نہیں ہوتے، یہ اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ ان کے درمیان قدر مشترک نہیں پائی جاتی۔ مثال کے طور پر عصا کو زمین پر ڈالنا اور اژدھے میں تبدیل ہونا کہاں اور بغل سے ہاتھ نکالنا اور اس کا چمکنا کہاں؟ یہ دونوں معجزہ کہاں اور عصا کو پتھر پر مار کر پانی کے چشموں کا جاری کرنا کہاں[۱] اسی طرح یہ تینوں معجزہ کہاں اور عصا کو دریا پر مار کر پانی کا سینہ چاک کرنا اور اس میں سے راستہ نکالنا کہاں[۳]؟

ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ وہ گیلی مٹی سے پرندے بنا کر ان میں پھونکتے تھے اور وہ پرندے خدا کے اذن سے زندگی پاتے تھے۔ اس کے علاوہ نابینا اور برص کے مریضوں پر ہاتھ ملتے تھے اور وہ شفا پاجاتے تھے[۲]۔ اسی طرح مردوں کو زندہ کرتے تھے اور گھر کے اندر مخفی چیزوں کی خبر دیتے تھے۔

د: اصولی طور پر معجزہ یا کرامت دکھانے والے، مقصد اور تقدس کے لحاظ سے جادوگروں اور دیگر غیر معمولی عمل انجام دینے والوں کی نسبت ممتاز اور معزز ہوتے ہیں۔ پہلے گروہ کے مقاصد عالی ہوتے ہیں جبکہ دوسرے گروہ کے لوگ دنیوی مقاصد رکھتے ہیں۔ اس لئے فطری طور پر ان دونوں کے درمیان واضح معنوی فرق ہوتا ہے۔

۱۔ بقرہ/۶۰۔

۲۔ آل عمران/۴۲۔

۳۔ شعراء/۶۳۔

وحی اور نبوت

۶۰ ویں اصل:

گزشتہ اصل میں سچے اور حقیقی انبیاء نیز پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے افراد کی پہچان کے طریقے بیان ہوئے۔

انبیاء کے عالم غیب سے رابطے کا اہم ترین طریقہ ''وحی'' ہے، اور یہ جبلّت انسانی یا عقل بشری نہیں ہے، بلکہ ایک خصوصی اطلاع وآ گاہی ہے کہ خداوند متعال نے اسے انبیاء کے اختیار میں دیا ہے تا کہ وہ الٰہی پیغامات کو بندوں تک پہنچائیں۔قرآن مجید ''وحی'' کے بارے میں یوں بیان فرماتا ہے:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الأَمِينُ. عَلَىٰ قَلْبِكَ﴾ (شعراء، ۱۹۳۔۱۹۴)

''اس (قرآن کریم) کو جبرئیل امین (فرشتہ وحی) لے کر آپ کے قلب پر نازل ہوا ہے۔''

اس آیت سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ الٰہی پیغامات سے پیغمبر کا مطلع ہونا، ظاہری حواس وغیرہ سے استفادہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وحی کا فرشتہ اسے پیغمبر کے قلب پر نازل کرتا ہے(۱)۔

۱۔لیکن پیغمبروں پر وحی الٰہی کا نزول صرف فرشتہ وحی کے ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اور بھی طریقے ہیں جن کا سورہ، شوریٰ کی آیات ۵۱ میں ذکر ہوا ہے اور اس کی تفسیر ۳۸ ویں اصل میں آچکی ہے۔

لہٰذا ''وحی'' کی پیچیدہ حقیقت کو عادی اور عمومی پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکتا ہے۔حقیقت میں وحی کا نازل ہونا غیب کے مظاہر میں سے ہے کہ اس کی حقیقت واضح نہ ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانا لازمی ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ (بقرہ/۳)

''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔''

۶۱ ویں اصل:

ہر چیز کو مادی پیمانے سے ناپنے اور حس کی ترازو میں تول کر غیبی حقائق کو حواس کے سانچوں میں محصور کرنے والوں نے وحی الٰہی کی مختلف صورتوں میں توجیہ وتشریح کی ہے کہ ہماری نظر میں یہ سب باطل ہے۔ہم ذیل میں اس قسم کی توجیہات کو بیان کرکے ان پر تنقید کرتے ہیں:

الف: مصنفین کی ایک جماعت نے انبیاء کو غیر معمولی ذہن رکھنے والے انسانوں کے طور پر جانا ہے اور وحی کو ان کے تفکر اور باطنی حواس کا ماحصل تصور کیا ہے۔ان قلمکاروں کے تصور کے مطابق، روح الامین کی حقیقت، اس قسم کے عظیم دماغ رکھنے والوں کی روح ونفس کی پاکیزگی ہے اور آسمانی کتاب بھی ان کے اپنے افکار کا نتیجہ ہے۔

''وحی'' کے بارے میں اس قسم کی تشریح، جدید تجربی علم، جو فقط حسّی طریقوں پر اعتماد کرتا ہے، کے سامنے مرعوب ہوکر دھوکہ کھانا ہے۔یہ نظریہ انبیاء کی فرمایشات سے مطابقت نہیں رکھتا اور یہی اس نظریہ کی اہم اور اساسی مشکل ہے۔کیونکہ انبیاء مسلسل اعلان کرتے تھے کہ وہ جو کچھ انسان کے لئے لے آئے ہیں، وحی الٰہی کے علاوہ کچھ نہیں۔اس لحاظ سے مذکورہ تشریح وتفسیر کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انبیاء (نعوذ باللہ) جھوٹے تھے اور یہ بات ان کی بلند شخصیت، حق گوئی اور صحیح ہونے۔ جس کی تاریخ نے بھی گواہی دی ہے، سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اس کے علاوہ مصلح دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو اپنے منصوبوں کو خداوند متعال سے نسبت دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو اپنے منصوبوں کو اپنے ذاتی افکار کی تخلیق کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ ممکن ہے دونوں گروہ ہمدرد اور خیر خواہ ہوں۔ لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے مصلحین کے ان گروہوں کو ایک ہی ترازو میں تولا نہیں جا سکتا۔

ب: ایک اور جماعت، اسی مذکورہ نظریہ کی مطابق، وحی کو انبیاء کے معنوی حالات کا مظہر اور جلوہ سمجھتی ہے۔ ایسے افراد کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی خدا کے بارے میں اپنے مستحکم اور واضح اعتقاد کی بناء پر، اپنی شدید عبادت و ریاضت کے نتیجہ میں ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے، جہاں وہ اپنے اندر کچھ عالی حقائق کو محسوس کرتا ہے، اور تصور کرتا ہے کہ غیب کی دنیا سے اس پر الہام ہوا ہے، جب کہ حقیقت میں مذکورہ حالت کا سرچشمہ اس کے اپنے نفس کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ اس نظریہ کو ماننے والے یہ اظہار کرتے ہیں کہ ہم انبیاء کی حق گوئی اور سچائی پر شک نہیں کرتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ کچھ حقائق کا مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن مسئلہ ان عالی حقائق کے منبع کا ہے، انبیاء تصور کرتے ہیں کہ یہ عالی حقائق باہر سے یعنی عالم غیب سے انہیں الہام ہوتے ہیں، جبکہ ان کا سرچشمہ خود ان کا نفس ہوتا ہے(۱)۔

یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ ''وحی'' کے بارے میں عصر جہالت میں پیش کیا گیا ایک نظریہ ہے، جسے نئے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ وحی، انبیاء کے تخیل اور ان کے اپنے نفس میں غرق ہونے کا نتیجہ ہے، اور وہ خدا کے بارے میں تفکر، عبادت، ریاضت اور بشر کی اصلاح کے سلسلہ میں غور و فکر کی کثرت کے نتیجہ میں اچانک کچھ حقائق کو اپنے سامنے مجسم پاتے ہیں اور تصور کرتے ہیں کہ عالم غیب سے ان پر الہام ہو رہا ہے۔ اور یہ ایک طرح سے وحی کے بارے میں عرب جاہلوں کا وہی تصور ہے جیسے وہ کہتے ہیں:

﴿أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ﴾ (انبیا، ۵)

۱۔ سید محمد رشید رضا، وحی محمدی، ص ۶۶۔

''یہ تو سب خواب پریشان کا مجموعہ ہے۔''

قرآن مجید دوسرے آیات میں اس نظریہ کو شدت کے ساتھ رد کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، فرشتہء وحی کو دیکھنے کا مدعی ہے سچا ہے، نہ اس کے دل نے خطا کی ہے اور نہ آنکھوں نے دھوکہ کھایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ﴾ (نجم/۱۱)

''دل نے اس بات کو جھٹلایا نہیں جس کو آنکھوں نے دیکھا۔''

مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغَىٰ﴾ (نجم/۱۷)

''اس وقت اس کی آنکھ نہ بہکی اور نہ حد سے آگے بڑھی''

یعنی حقیقت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظاہری اور باطنی دونوں صورتوں میں فرشتہء وحی کو دیکھا ہے۔

انبیاء کی عصمت

۶۲ ویں اصل:

عصمت کے معنیٰ شبہہ وغلطی سے محفوظ رہنے کے ہیں اور نبوت کے سلسلے میں اس کے حسب ذیل مراتب ہیں:

الف: وحی کو حاصل کرنے، حفظ کرنے اور پہنچانے میں عصمت

ب: معصیت وگناہ کے مقابلے میں عصمت

ج: انفرادی اور اجتماعی امور میں خطا اور غلطی کے مقابلے میں عصمت

انبیاء کی عصمت کی پہلے مرحلے پر سبوں کا اتفاق نظر ہے، کیونکہ اس مرحلہ میں کسی بھی قسم کی لغزش وخطا کا امکان، لوگوں کے اطمینان ووثوق کو متزلزل اور مخدوش کرسکتا ہے اس طرح انبیاء کے پیغام کے بارے میں اعتماد اور بھروسہ سلب ہوسکتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر انبیاء کا مقصد ہی فوت ہوسکتا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید یاد دلاتا ہے کہ خداوند متعال نے پیغبر کو مکمل طور پر اپنی نگرانی اور حفاظت میں رکھا ہے تاکہ وحی الہٰی صحیح صورت میں انسان تک پہنچ سکے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿عَلِمُ الْغَيْبِ فَلا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا. إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن

رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا. لِّيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾ (جن/۲۸_۲۶)

"وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا۔ مگر جس رسول کو منتخب کرے تو اس کے آگے پیچھے نگہبان فرشتے مقرر کر دیتا ہے۔ تا کہ وہ دیکھ لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہنچایا ہے اور جس کے پاس جو کچھ بھی ہے خدا سب پر حاوی ہے اور سب کے اعداد کا حساب رکھنے والا ہے۔"

مذکورہ آیات میں تحفظ وحی کے سلسلے میں دو قسم کے نگہبان مقرر ہونے کا ذکر آیا ہے:

الف: فرشتے، جو پیغمبر پر ہر طرف سے حاوی ہوتے ہے۔

ب: خود خداوند متعال جو پیغمبر اور فرشتوں پر حاوی ہوتا ہے۔

اس مکمل نگہبانی واحاطہ کی وجہ یہ ہے کہ نبوت کا مقصد محقق ہو یعنی وحی الٰہی انسان تک پہنچے۔

۶۳ ویں اصل:

انبیائے الٰہی، شرعی احکام کی انجام دہی میں ہر قسم کے گناہ ولغزش سے محفوظ ہوتے ہیں، اور اصولی طور پر بعثت انبیاء کا مقصد اسی صورت میں محقق ہوتا ہے جب وہ اس قسم کی حفاظت اور معصومیت کے مالک ہوں، کیونکہ اگر وہ احکام الٰہی، جیسے وہ خود پہنچانے والے ہیں۔ کے مکمل طور پر پابند نہ ہوں تو ان کی باتوں کی صداقت پر سے لوگوں کا اعتماد ختم ہو جائے گا اور نتیجہ کے طور پر نبوت کا مقصد بھی پورا نہیں ہوگا۔ محقق طوسی نے ایک مختصر جملے میں اس برہان کو یوں بیان فرمایا ہے:

ویجب فی النبی العصمة لیحصل الوثوق فیحصل الفرض

''انبیاء کے لئے عصمت ضروری ہے تاکہ ان پر اعتماد ووثوق حاصل ہو اور نبوت کا مقصد پورا ہو۔''

گناہ کے مقابلے میں انبیاء کی عصمت کا قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ذکر ہوا ہے، ہم ان میں سے چند کی طرف ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

الف: قرآن مجید انبیاء کو خدا کی طرف سے ہدایت شدہ اور انتخاب شدہ جانتا ہے:

﴿وَاجْتَبَيْنَـٰهُمْ وَهَدَيْنَـٰهُمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (انعام/۸۷)

''اور خود انھیں بھی منتخب کیا اور ان کو سیدھے راستہ کی ہدایت کردی۔''

ب: قرآن مجید میں بیان ہوتا ہے کہ جسے خدا ہدایت کرے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا:

﴿وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّضِلٍّ﴾ (زمر/۳۷)

''اور جس کو وہ ہدایت دیدے اس کا کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے۔''

ج: قرآن مجید، معصیت کو ضلالت سے تعبیر کرتا ہے:

﴿وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا﴾ (یٰس/۶۲)

''اس شیطان نے تم میں سے بہت سی نسلوں کو گمراہ کردیا ہے۔''

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء ہر قسم کی ضلالت، معصیت وگناہ سے محفوظ ہیں۔

اس کے علاوہ، انبیاء کی عصمت کے ضروری ہونے کے سلسلے میں پہلے بیان شدہ دلیل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء کے لئے بعثت سے پہلے بھی عصمت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کوئی انسان اپنی زندگی کے ایک حصہ کو معصیت وگمراہی میں گزارنے کے بعد ہدایت کا علم بلند کرے تو لوگ اس پر کوئی اعتماد نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص پیدائش سے ہی ہر قسم کی آلائشوں اور گناہ سے محفوظ ہو تو وہ آسانی کے ساتھ لوگوں کا اعتماد حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر انبیاء پہلے سے ہی عصمت کے مالک نہ ہوں تو خود غرض اور رسالت کے منکر لوگ آسانی کے ساتھ ایسے اشخاص کے گزشتہ اعمال پر انگلیاں اٹھا کر ان کی

شخصیت کشی اوران کے پیغام کو مخدوش کر سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں تنہا ایسا انسان، جس نے اپنی پاک اور بے لاگ زندگی کی وجہ سے ''محمد امین'' کا لقب پایا ہو، اپنی تابناک شخصیت کے ذریعہ آفتاب کی طرح دشمن کے منفی پروپگنڈے کے پردے ہٹا کر اپنی اعلیٰ وحیرت انگیز استقامت کے ساتھ جاہلیت کے تاریک ماحول کو منور کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ امر بدیہی اور مسلم ہے کہ ایک انسان، جو پیدائش سے ہی معصیت و گناہ سے محفوظ رہ چکا ہو، اس کی ہدایت اس انسان سے بہتر اور مؤثر تر ہوگی، جو فقط بعثت کے بعد اس قسم کے مقام پر پہنچا ہو اور حکمت الٰہی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ احسن و کامل ترین کام کا انتخاب کرے۔

۶۴ ویں اصل:

انبیاء، گناہ و معصیت کے مقابلے میں معصوم ہونے کے علاوہ درج ذیل امور میں بھی خطاؤں سے محفوظ تھے:

الف: نزاع اور جھگڑوں کا فیصلہ:

انبیاء، خداوند متعال کی طرف سے عدل وانصاف کے اصولوں کے تحت فیصلہ دینے پر مأمور تھے، یعنی مدعی سے شہادت طلب کریں، اور اگر مدعی شہادت پیش نہ کر سکا تو مدعا علیہ سے قسم کا مطالبہ کریں۔ انبیاء نے کبھی بھی اس امر میں الٰہی معیار کے خلاف عمل نہیں کیا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ شاہد یا گواہ عمداً یا سہواً خلافِ واقع گواہی دے یا مدعا علیہ جھوٹی یا غلط قسم کھائے اور نتیجہ کے طور پر پیغمبر کا فیصلہ واقع کے مطابق نہ ہو۔ اس قسم کا اختلاف پیغمبر کی عصمت کو کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچاتا، کیونکہ وہ اس امر پر مأمور ہوتا ہے کہ معیار الٰہی کے تحت فیصلہ دے۔ اور جہاں پر اس کا فیصلہ واقع کے خلاف ہو، وہ اپنے فیصلہ کی خطا سے آگاہ ہوتا ہے لیکن سماجی مصلحتوں کے پیش نظر اس کے مطابق عمل کرنے پر مأمور نہیں ہوتا ہے۔

ب: دینی احکام کے موضوعات کی تشخیص: مثلاً فلاں رقیق چیز شراب ہے یا نہیں۔
ج: سماجی مسائل میں مصالح اور مفاسد کی تشخیص۔
د: زندگی کے عام مسائل میں۔

مؤخرالذکر تین امور میں عصمت کی دلیل یہ ہے کہ اکثر افراد ایسے مسائل میں خطا کو دینی احکام میں خطا کا لازمہ سمجھتے ہیں۔لہٰذا ان میں خطا کا مرتکب ہونا پیغمبر کے بارے میں لوگوں کے اطمینان کو مخدوش کر دیتا ہے۔نتیجہ کے طور پر یہ امر بعثت کے مقصد کو بھی مخدوش کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔اگرچہ پہلی دو صورتوں میں عصمت کا ضروری ہونا موخرالذکر صورتوں کی نسبت واضح تر ہے۔

۶۵ ویں اصل:

عصمت کے مراتب میں سے ایک یہ ہے کہ انبیاء میں کوئی ایسا نقص موجود نہیں ہونا چاہئے، جو لوگوں کے لئے ان سے دوری اختیار کرنے کا باعث بنے۔یہ امر مسلم ہے کہ کچھ جسمانی بیماریاں یا بعض اخلاقی عادات انسان کی پستی اور تنزل کی حکایت کرتے ہیں لوگوں کے لئے اس سے نفرت کا باعث بنتے ہیں۔قدرتی طور پر انبیاء کو اس قسم کے جسمانی اور اخلاقی عیبوں سے پاک ومنزہ ہونا چاہئے، کیونکہ انبیاء سے لوگوں کا نفرت اور دوری اختیار کرنا، بعثت کے مقصد- جو پیغمبر کے ذریعہ خدا کی رسالت کو بندوں تک پہنچانا ہے- کے منافی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہاں پر عقل کا فیصلہ، ایک حقیقت کا انکشاف کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حکمت الٰہی کے مطابق پیغمبری کے لئے ایسے افراد منتخب ہونے چاہئیں جو اس قسم کے عیبوں سے پاک ومنزہ ہوں(۱)

۱۔یہاں پر عقل کا فیصلہ ایک حتمی اور قطعی فیصلہ ہے۔چنانچہ بعض روایتوں میں جناب ایوب علیہ السلام کے بارے میں ذکر ہوا ہے کہ جن سے ان کی بعض نفرت انگیز بیماروں کا پتہ چلتا ہے ایسی روایتیں نہ صرف عقل کے قطعی فیصلہ کے خلاف ہیں، بلکہ اس سلسلے میں ائمہ علیہم السلام سے بیان شدہ روایات سے بھی تضاد رکھتی ہیں۔امام صادق علیہ السلام اپنے اجداد سے نقل>>>

۶۶ ویں اصل:

یہاں تک ہم، انبیاء کے لئے عصمت کی ضرورت کے سلسلے میں عقل کے قطعی حکم اور قرآن مجید کے واضح فیصلہ سے آگاہ ہوئے، لیکن اس سلسلے میں بعض آیات- ظاہراً- ان (انبیاء) سے گناہ سرزد ہونے کا اشارہ کرتی ہیں (جیسے حضرت آدم کے سلسلے میں ذکر ہوئی آیات وغیرہ) اس سلسلے میں کیا کہا جائے؟

اس کے جواب میں اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ اس قاعدے کے تناظر میں کہ قرآن مجید میں کسی قسم کے تناقص اور ٹکراؤ کی گنجائش نہیں ہے، اس قسم کی آیات کے اندر موجود قرآئن کی مدد سے اس کے اصلی مفہوم تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہئے اور ایسی آیات کے ظاہری معنی کو ہرگز جلد بازی میں فیصلہ کا معیار قرار نہیں دینا چاہئے۔ خوش بختی سے شیعہ مفسرین اور متکلمین نے اس قسم کی آیات کی تفسیر کی ہے، حتیٰ ان میں سے بعض نے اس موضوع پر مکمل کتابیں تالیف کی ہیں۔ چونکہ اس سلسلے میں ذکر شدہ ہر ایک آیت کے بارے میں بحث کرنا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے اسلئے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات براہ راست ایسی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں(۱)۔

>>> فرماتے ہیں۔

''حضرت ایوب علیہ السلام، اپنی پوری بیماری کے دوران ہرگز بدبو اور بدصورتی سے دوچار نہیں ہوئے۔ اور ان کے بدن سے ہرگز خون یا پیپ یا کوئی ایسی چیز جس سے لوگ نفرت کرتے ہیں خارج نہ ہوئی۔ انبیاء و اولیاء کے بارے میں خداوند متعال کی سنت یہی ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام سے لوگوں کی دوری ان کی فقر و تنگدستی اور ظاہری ضعف کی وجہ سے تھی۔ لیکن وہ لوگ خدا کے نزدیک ان کے مقام و منزلت سے آگاہ نہ تھے۔ (خصال، ج۱، ابواب هفتگانہ، حدیث ۱۰۷، ص ۴۰۰)۔ قدرتی طور پر جو بھی روایتیں اس مطلب کے خلاف بیان کرتی ہیں، مستحکم بنیاد کی حامل نہیں ہیں اور قابل اعتبار بھی نہیں ہیں۔

۱۔ تنزیہ الانبیاء، از سید مرتضیٰ، عصمۃ الانبیاء از فخر الدین رازی، مفاہیم القرآن از جعفر سبحانی، ج۵، بخش عصمت پیامبران۔

۶۷ ویں اصل:

عصمت کے سرچشمہ اور اس کے سبب کو درج ذیل دو چیزوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

الف: انبیاء (اور خدا کے اولیائے خاص) خدا کی معرفت کے لحاظ سے ایک عالی مقام کے مالک ہوتے ہیں اور خدا کی رضامندی اور خوشنودی کو کسی بھی چیز سے تبدیل نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کی عظمت اور اس کے عالی جمال وجلال ادراک انھیں اس بات سے روکتا ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کریں اور خدا کی رضامندی کے علاوہ کسی اور چیز کی فکر دل ودماغ میں پیدا کریں۔ یہ معرفت کا وہی مرتبہ ومقام ہے جس کے بارے میں امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما رأیت شیئاً إلّا ورأیتُ الله قبله وبعده ومعه

''میں نے کسی چیز کو اس حالت میں نہیں دیکھا کہ اس کے آگے پیچھے اور ہمراہ خدا کو نہ دیکھا ہو۔''

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ولکنّی أعبده حبّاله وتلک عبادة الکریم (بحار الانوار، ۷۰/۲۲)

''میں خدا کی عبادت اس سے دوستی کی بنیاد پر کرتا ہوں اور بلند صفات افراد کی عبادت ایسی ہی ہوتی ہے۔''

ب: خدا کی نافرمانی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے سبب، انبیاء، خدا کی اطاعت کے درخشاں نتائج اور معصیت کے بُرے انجام سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن وسیع پیمانے پر ہر پہلو سے محفوظ رہنا اولیائے الٰہی کے ایک خاص گروہ سے مخصوص ہے۔ پھر بھی پرہیزگار مؤمنوں کی ایک تعداد اپنے اعمال کے ایک بڑے حصے کی انجام دہی میں گناہ سے محفوظ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک متقی و پرہیزگار شخص کسی بھی قیمت پر خودکشی کا مرتکب نہیں ہوتا یا کسی بے گناہ فرد کو قتل نہیں کرتا ہے(۱)۔

۱۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اس گروہ کے بارے میں فرماتے ہیں: >>>>

اس سے بڑھ کر عام افراد بھی بعض امور میں معصیت سے محفوظ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی بھی شخص کسی بھی صورت میں اس بات پر تیار نہیں ہوتا ہے کہ بجلی کے کرنٹ والے ننگے تار کو چھولے۔ واضح ہے کہ اس قسم کے مواقع پر محفوظ ہونا اس وجہ سے ہے کہ انسان اپنے اس غلط کام کے برے انجام کے بارے میں قطعی طور پر علم رکھتا ہے۔ اب اگر کوئی فرد گناہ کے انتہائی خطرناک انجام کے بارے میں ایسا ہی قطعی علم پیدا کرے تو یہ امر یقیناً اس کے لئے گناہ سے محفوظ رہنے کا باعث بن جائے گا۔

۶۸ ویں اصل:

منشاء عصمت کے پیش نظر، اس امر کا ذکر کرنا لازمی ہے کہ عصمت اور معصوم کی آزادی واختیار کے درمیان کسی قسم کا تضاد اور ٹکراؤ نہیں ہے، بلکہ ایک معصوم، خدا، اس کی اطاعت وعبادت کے آثار اور معصیت کے انجام کے بارے میں بخوبی علم ومعرفت رکھنے کے باوجود گناہ کو انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے، لیکن اس قدرت سے استفادہ نہیں کرتا۔ بالکل ایک شفیق ومہربان باپ کی طرح کہ وہ اپنے عزیز فرزند کو قتل کرنے کی قدرت رکھتا ہے لیکن ہرگز یہ کام انجام نہیں دیتا۔ اور اس سے بھی واضح بات یہ ہے کہ خداوند متعال کبھی کوئی قبیح فعل انجام نہیں دیتا۔ یعنی خداوند قادر مطلق یہ قدرت رکھتا ہے کہ اپنے مطیع وفرمانبردار بندوں کو جہنم میں ڈال دے اور اسکے برعکس گناہ گار افراد کو بہشت میں داخل کردے، لیکن عدل وحکمت الٰہی اس امر میں رکاوٹ بن جاتے ہیں کہ وہ اس قسم کا فعل انجام دے۔ اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ معصومین کے لئے گناہ سے اجتناب اور عبادت

<<هم والجنة كمن قد رآها وهم فيها منعمّون، وهم والنار كمن قد رآها وهم فيها معذّبون.

''یہ افراد بہشت کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھتے ہیں، جیسے اسے دیکھا ہے اور اس کی نعمتوں سے مستفید ہو رہے ہیں، اور جہنم کے بارے میں بھی ویسے ہوتے ہیں جیسے اس کو دیکھا ہے اور اس کے عذاب سے دوچار ہیں)

واطاعت کی انجام دہی ایک بڑی فضیلت ہے، کیونکہ وہ گناہ کی انجام دہی کی طاقت رکھتے ہوئے بھی اس کے مرتکب نہیں ہوتے۔

۶۹ویں اصل:

ہم، تمام انبیاء کی عصمت کے قائل ہوتے ہوئے، عصمت کو فقط انبیاء سے مختص نہیں جانتے۔ بلکہ ممکن ہے کوئی شخص معصوم ہو لیکن نبی نہ ہو۔ قرآن مجید حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿یٰمَرْیَمُ إِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (آل عمران/۴۲)

''اے مریم خدا نے تمہیں چن لیا ہے اور پاکیزہ بنادیا ہے اور عالمین کی عورتوں میں منتخب قرار دیا ہے۔''

چونکہ قرآن مجید نے حضرت مریم کے بارے میں کلمۂ ''اصطفاء'' کا استعمال کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معصوم تھیں، کیونکہ انبیاء کے بارے میں بھی کلمۂ ''اصطفاء'' استعمال ہوا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی ءَادَمَ وَنُوحًا وَءَالَ إِبْرٰھِیْمَ وَءَالَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ (آل عمران/۳۳)

اس کے علاوہ مذکورہ آیت میں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکیزگی کا ذکر ہوا ہے اور ان کی پاکیزگی کا مطلب ہر قسم کی ناپاکی سے پاک ہونا ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسے یہودیوں کی طرف سے صرف ان کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کے سلسلے میں ان پر لگائی جانے والی تہمت کا ازالہ مقصود ہے۔ کیونکہ اس گناہ کی تہمت سے حضرت مریم کے بری ہونے کا مسئلہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کے ابتدائی ایام میں ہی اُن کے کلام کرنے سے حل ہو چکا تھا، اسلئے اس بیان کو پھر سے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

اس کے علاوہ، حضرت مریم علیہا السلام سے متعلق تطہیر کی آیت اور اس سے مربوط دیگر آیات کے سیاق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ آیت اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب حضرت مریم علیہا السلام محراب میں خدمت گار تھیں اور ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے شکم میں نہیں آئے تھے۔ اس لئے ابھی ان پر تہمت ہی نہ لگی تھی تو یہ آیت اس تہمت سے بری ہونے کے سلسلے میں کیسے ہوتی؟

چھٹا حصہ

کلیات عقائد

(۵)

نبوتِ خاص

۷۰ ویں اصل:

گزشتہ فصل میں نبوت کے بارے میں عمومی بحث ہوئی اس فصل میں نبوتِ خاص، یعنی پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے میں بحث کریں گے۔اس سے پہلے ہم نے بیان کیا ہے کہ انبیاء کی نبوت تین طریقوں سے ثابت ہوسکتی ہے:

الف: معجزہ، جسے انبیاء اپنی نبوت کی دعوت کے ساتھ لاتے ہیں۔

ب: دعوائے پیغمبری کی صداقت کی گواہی دینے والے قرآئن وشواھد۔

ج: گزشتہ پیغمبر کی پیشگوئی وتصدیق۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفٰیؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو مذکورہ تینوں طریقوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔یہاں پر ہم خلاصہ کے طور پر مذکورہ طریقوں کو بیان کرتے ہیں:

قرآن یالافانی معجزہ:

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو گوناگوں معجزات کے ساتھ پیش کیا۔لیکن ان معجزات میں سے ایک معجزہ پرآنحضرت صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے بڑی تاکید فرمائی ہے اور یہ لافانی معجزہ قرآن مجید ہے۔

پیغمبر اسلام نے اپنی نبوت کا اعلان اس آسمانی کتاب کو پیش کرتے ہوئے فرمایا اور دنیاوالوں کو اس کے مقابلے کی دعوت دی۔ قرآن کے واضح اور فیصلہ کن چیلنج کے باوجود بعثتِ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوران کوئی شخص اس کی نظیر نہ لا سکا۔ صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی قرآن مجید اپنے چیلنج کا اعلان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْءَانِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ (اسراء/۸۸)

''اگر انسان اور جنات سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو بھی نہیں لا سکتے، چاہے سب ایک دوسرے کے مددگار اور پشت پناہ کیوں نہ ہو جائیں۔''

قرآن مجید یہاں پر چیلنج کرتے ہوئے فرماتا ہے، اے پیغمبر ان سے کہدو کہ اس کتاب کی مثل لائیں۔ دوسری جگہ پر اس سے بھی نیچے اتر کر فرماتا ہے کہ: کہدو، اگر لا سکیں تو قرآن کے دس سوروں یا حتیٰ ایک سورہ کے مانند ہی لے آئیں:

﴿قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ﴾ (ھود/۱۳)

''کہد یجئے کہ اس کے جیسے دس سورہ گڑھ کر تم بھی لے آؤ۔''

﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ﴾ (بقرہ/۲۳)

''اس کا جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ۔''

یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ دین مبین اسلام کی پیدائش سے آج تک گزشتہ پندرہ صدیوں کے دوران دشمنان اسلام نے اسلام پر کاری ضربیں لگانے میں کوئی دقیقہ فروگزار نہیں کیا ہے، حتیٰ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادوگری اور دیوانگی کی تہمتیں لگانے سے بھی گریز نہیں کیا، لیکن ہرگز قرآن کا مقابلہ نہ کر سکے۔ دشمنان اسلام ہر قسم کے افکار اور وسائل سے لیس ہونے کے باوجود آج بھی قرآن مجید کے قطعی اور واضح چیلنج کے سامنے بے بس

ہیں، یہ بذات خود اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن مجید انسانی کلام سے ماوراکوئی اور چیز ہے۔

۷۱ ویں اصل:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، گوناگوں معجزات کے مالک تھے، ان کی تفصیل تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں درج ہے۔ان سب معجزات میں ان کا جاوداں معجزہ، جو تمام ادوار میں منور رہا، قرآن مجید ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس لافانی معجزہ کی وجہ سے تمام انبیاء پر سبقت حاصل کرنے کا فلسفیہ ہے کہ ان کا دین، آخری اور جاوداں دین ہے، ایک لافانی دین کے لئے لافانی معجزے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ہر عصر و نسل کے لئے نبوت کا واضح اور قطعی برہان موجود رہے، اور آنیوالی صدیوں میں، انسان دوسروں کے اقوال کی طرف رجوع کرنے کے بجائے براہ راست اسکی طرف رجوع کرتا رہے۔

قرآن مجید مختلف جہات سے معجزہ ہے کہ ہر ایک پہلو پر مفصل بحث کرنا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے۔ہم یہاں مختصر طور پر انکا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں:

قرآن مجید کے نزول کے ہی دن، جس چیز نے عرب دنیا کے سخن وروں اور فصاحت و بلاغت کے استادوں کو تعجب اور حیرت میں ڈالدیا، وہ، قرآن کے کلمات کی زیبائی، ترکیب کی حیرت انگیز تازگی اور معانی کی بلندی تھی کہ یہ سب خصوصیات فصاحت و بلاغت سے تعبیر کی جاتی ہیں۔قرآن مجید کا یہ امتیاز اس زمانے کے عربوں اور آج کے عربوں پر بالکل واضح ہے اسی لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآنی آیات کی پے در پے تلاوت کر کے اور ادب و سخن کے اساتذہ اور فصاحت و بلاغت کے ماہروں کو چیلنج کر کے ان کو خضوع و خشوع پر مجبور کر دیا اور اس کلام کی عظمت کے سامنے ہتھیار ڈالنے نیز اس کے مافوق بشر ہونے کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔

قبیلہ قریش کے معروف و نامور سخن ور اور شاعر و ادیب، ولید بن مغیرہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی چند قرآنی آیات کی تلاوت سننے کے بعد یوں اعتراف کیا تھا:

''خدا کی قسم ابھی ابھی میں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسانوں کا کلام لگتا ہے اور نہ جنّوں کا۔ یہ ایک ایسا کلام ہے جس میں ایک خاص مٹھاس اور زیبائی پائی جاتی ہے۔ اس کلام کی شاخیں پر بار اور جڑیں بابرکت ہیں۔ یہ ایک عالی کلام ہے کہ اس سے بالاتر اور کوئی کلام نہیں ہوسکتا، یعنی یہ کلام ہرگز قابل مقابلہ نہیں ہے۔''(۱)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ تنہا ولید بن مغیرہ ہی نہیں تھا جس نے قرآن مجید کے ظاہری جمال اور معنوی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہو، بلکہ عتبہ بن ربیعہ اور طفیل بن عمرو جیسے عربی زبان کے نامور ادیب اور سخن وروں نے بھی بے بس ہو کر قرآن کے ادبی اعجاز کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ لیکن اُس زمانے کے عرب جہلا، اپنی ثقافتی پسماندگی کی وجہ سے قرآن مجید کے اعجاز کے اس پہلو کے علاوہ کچھ اور سمجھ نہیں سکتے تھے۔ لیکن جب اسلام دنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر سورج کی طرح چمکا تو دنیا کے مفکروں نے اس کتاب کی بلند مرتبہ آیات کے بارے میں غور و فکر کرنا شروع کیا اور قرآن مجید کے ادبی پہلو کے علاوہ دیگر پہلوؤں سے بھی استفادہ کیا، جن میں سے ہر ایک مستقل طور پر عالم ملکوت سے رابطے کی روشن اور واضح دلیل ہے اسی طرح انہوں نے ہر زمانے میں اس کے بے پایاں حقائق سے تازہ نکتے کشف کئے اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔

۲۷ویں اصل:

گزشتہ اصل میں قرآن مجید کے ادبی اعجاز کے بارے میں مختصر بحث ہوئی۔ اب ہم قرآن مجید کے دیگر معجزوں کے بارے میں بطور خلاصہ اشارہ کریں گے۔ اگر قرآن مجید کا ادبی اعجاز فقط ان افراد کے لئے قابل درک ہے جو عربی زبان پر کافی مہارت رکھتے ہیں تو خوشبختی سے قرآنی اعجاز کے دیگر جلوے دوسرے افراد کیلئے بھی قابل فہم ہیں:

۱۔ مجمع البیان ۵/ ۳۸۷۔

الف: قرآن کو لانے والا ایک ایسا شخص ہے جس نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی ہے، نہ مدرسہ گیا ہے نہ اس نے کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہ کیا ہے اور نہ کسی کتاب کو پڑھا ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُواْ مِن قَبْلِهِ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ﴾ (عنکبوت/۴۸)

''اے پیغمبر آپ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے، ورنہ یہ اہل باطل (آپ کی رسالت کی حقانیت کے بارے میں) شبہہ میں پڑ جاتے۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت ان لوگوں کے سامنے کی جو ان کی عملی زندگی سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگر وہ دنیاوی طور سے تعلیم یافتہ ہوتے تو قدرتی طور وہ لوگ ان کے اس دعوے کو جھٹلاتے۔ اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ ''کوئی انسان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کی تعلیم دے رہا ہے''(۱) تو یہ تہمت بھی دیگر تہمتوں کی طرح بے بنیاد تھی جیسا کہ قرآن مجید نے اس تہمت کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''حالانکہ جس کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں، وہ عجمی ہے اور یہ زبان، عربی، واضح اور فصیح ہے۔''(۲)

ب: ۲۳ سال کی مدت کے دوران مختلف شرائط (صلح وجنگ، سفر وحضر، و۔۔۔) میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ قرآن مجید کی تلاوت ہوئی۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے حالات میں گفتار کے دوران گفتگو کرنے والا تضاد بیانی کا شکار ہو جائے۔ حتیٰ مناسب حالات میں، ہماہنگ شدہ اصولوں کے تحت اپنی کتابوں کی تألیف کرنے والے مصنف

۱۔ نحل/۱۰۳۔

۲۔ (نحل/۱۰۳)

بھی اپنے کلام میں تضاد وناہماہنگی کے مرتکب ہوجاتے ہیں، چہ جائیکہ کوئی اپنے کلام کوتدریجاً اور مختلف حالات ومواقع پر بیان کرے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے مختلف موضوعات، مثلاالٰہیات، تاریخ، شرع وقانون سازی، اخلاق، طبیعت وغیرہ کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ گونا گوں موضوعات کے ہوتے ہوئے بھی محتویٰ کے لحاظ سے اس کلام میں از سرتاپا ہماھنگی وانسجام واسلوب کلام کی عالی ترین صورت پائی جاتی ہے۔قرآن مجید اعجاز کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿أَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ الْقُرْءَ انَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِندِ غَیْرِ اللهِ لَوَجَدُواْ فِیهِ اخْتِلَٰفًا کَثِیرًا﴾ (نساء/۸۲)

''کیا یہ لوگ قرآن میں غوروفکر نہیں کرتے ہیں کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف ہوتا؟''

ج: قرآن مجید نے انسان کی مستقل وپائیدار فطرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قانون سازی کی ہے۔اس بنیادی نظریہ کے نتیجہ میں، انسانی روح وحیات کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے نا قابل زوال اور فرسودہ نہ ہونے والے کلی اصول بیان کئے ہیں۔

اسلام کے کلی قوانین کا امتیاز یہ ہے کہ یہ مختلف شرائط اور ماحول میں نافذ العمل ہیں۔اور مسلمانوں نے جب دنیا کے ایک بڑے حصہ پر دستیابی حاصل کی تو ان ہی قوانین کے سائے میں قدرت وعظمت کے ساتھ صدیوں تک انسانی معاشرے کا نظم ونسق چلایا۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان اللّٰہ لم یدع شیئاًتحتاج الیه الامة الّا انزله فی کتابه وبیّنه لرسوله وجعل لکلّ شئیَ حداًوجعل علیه دلیلاً.

''خداوندکریم نے کسی بھی چیز کوقرآن مجید میں ذکر کئے بغیراور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کواس کے حکم کی تفصیل بتائے بغیر نہیں

چھوڑا ہے، جس کی لوگوں کو ضرورت واحتیاج ہو، اور ہر چیز کی ایک حد اور ہر حد کی ایک دلیل معیّن کردی ہے۔"

۳۷ویں اصل:

د: قرآن مجید نے مختلف آیات میں گونا گوں موقوں پر تخلیق کائنات کے اسرار۔جن سے اُس زمانے کا انسان آگاہ نہ تھا۔بیان کئے ہیں، اور ایک ان پڑھ انسان کے لئے، جو ایک پسماندہ اور تمام چیزوں سے بے خبر معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہو، ان اسرار کا سراغ لگانا وحی الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔"قانون جاذبہ" کی دریافت جدید سائنس کے افتخارات میں شمار ہوتی ہے اور تخلیق کائنات کے استحکام کو اسی قانون کی بنیادوں پر استوار سمجھا جاتا ہے۔قرآن مجید ایک انتہائی مختصر جملے میں اس قانون سے پردہ اٹھاتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿اللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (رعد/۲)

"اللہ ہی وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر کسی ستون کے بلند کر دیا ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔"

"قانون زوجیت" کی دریافت بھی جدید سائنس کے نمایاں کارناموں میں شمار ہوتی ہے۔قرآن مجید نے اس قانون کے بارے میں اس وقت خبر دی ہے جب اس سلسلے میں کسی کو کچھ علم نہ تھا:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (ذاریات/۴۹)

"اور ہر شے میں سے ہم نے جوڑا بنا دیا ہے کہ شاید تم نصیحت حاصل کرسکو۔"

اس کے علاوہ اور بھی گونا گوں اسرار کی دریافت کے نمونے تفسیر اور کلام کی کتابوں یا

دائرۃ المعارف میں بیان ہو چکے ہیں۔

ھ: قرآن مجید نے بعض حوادث کے واقع ہونے سے پہلے ان کے بارے میں خبر دی ہے اور بعد میں قرآن کی یہ پیشگوئیاں سو فیصد صحیح ثابت ہوئی ہیں۔ اس قسم کے نمونہ بہت ہیں۔ ہم یہاں پر اس طرح کے صرف ایک نمونہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

جس دن خدا پرست رومی عیسائیوں نے آتش پرست ساسانیوں کے ہاتھوں شکست کھائی، مشرکین عرب اس واقعہ کو اپنے حق میں نیک شگون سمجھ کر یہ کہنے لگے کہ وہ بھی جزیرۃ العرب کے خدا پرستوں (مسلمانوں) پر غلبہ پا جائیں گے۔ لیکن قرآن مجید نے اُس وقت دوٹوک الفاظ میں خبر دیدی:

﴿غُلِبَتِ الرُّومُ. فِیٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُونَ. فِی بِضْعِ سِنِینَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِن قَبْلُ وَمِن بَعْدُ وَ یَوْمَئِذٍ یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (روم/۲-۴)

''روم والے مغلوب ہو گئے۔ قریب ترین علاقہ میں، لیکن یہ مغلوب ہو جانے کے بعد عنقریب پھر غالب ہو جائیں گے۔ چند سال کے اندر، اللہ ہی کے لئے اول و آخر ہر زمانہ کا اختیار ہے اور اسی دن صاحبان ایمان خوشی منائیں گے۔''

کوئی خاص مدت نہ گزری تھی کہ یہ پیشینگوئی صحیح ثابت ہوئی اور دونوں خدا پرست گروہ (رومی عیسائی اور عرب مسلمان) ایک ساتھ اپنے دشمنوں (ایران کے ساسانیوں اور مشرکین عرب) پر فتحیاب ہوئے۔ اس لئے اس آیت کے ضمن میں مؤمنین کی خوشحالی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿یو مَئِذٍ یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ﴾

''اور اسی دن صاحبان ایمان خوشی منائیں گے''

کیونکہ یہ دونوں کامیابیاں ایک ساتھ واقع ہوئیں۔

و: قرآن مجید نے گزشتہ انبیاء اورامتوں کی زندگی کے بارے میں مختلف سوروں میں گوناگوں تعبیروں کے ذریعہ داستانیں ذکر کی ہیں۔ یہ داستانیں توارت وانجیل میں بھی ذکر ہوئی ہیں۔لیکن ان کے قرآن مجید سے مقابلہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید تمام کا تمام وحی الٰہی ہے،لیکن جوکچھ توارت وانجیل میں موجود ہے وہ تحریف وتصرّف سے محفوظ نہیں رہا ہے۔انبیاء علیھم السلام کی زندگی کے بارے میں قرآن مجید میں جوکچھ بیان ہوا ہے وہ عقل وفطرت اورانبیاء کے اعلیٰ مقام وشأن کے ذرہ برابر خلاف نہیں ہے جبکہ توارت وانجیل میں اس قسم کی فراوان خامیاں پائی جاتی ہیں۔اس سلسلے میں قرآن مجیداور توارت وانجیل کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کے قصے کے بارے میں تقابلی مطالعہ ہی کافی ہے۔

۷۴ویں اصل:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت کے قرائن وشواھد

جیسا کے ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ،قرائن وشواہد،دعوائے پیغمبری کی صداقت کوثابت کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔یہاں پرہم مختصرطور پرایسے قرائن کی طرف اشارہ کریں گے جوپیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری کی صداقت کے دلائل کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں:

الف: پیغمبر اسلام کی گزشتہ زندگی:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے قبیلۂ قریش انھیں ''محمد امین'' کے لقب سے پکارتے تھے اور اپنی قیمتی اشیاء کوان کے پاس امانت کے طور پر رکھتے تھے۔جب کعبہ کی تعمیرنو کے سلسلے میں حجرالاسود کونصب کرنے کے مسئلے پر چار قبیلوں کے

درمیان اختلاف پیدا ہوا تو سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اس کام کو عزیز قریش یعنی پیغمبر اسلام انجام دیں۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امین و پاک دامن شخص ہیں[۱]۔

ب: ماحول کی آلائشوں سے محفوظ:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسے ماحول اور سماج میں پرورش پائی جہاں بت پرستی، جوابازی، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے، خون اور مردار کھانے، ظلم وستم، لوٹ مار اور غارتگری کا چرچا تھا اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسے بلند پایہ انسان تھے کہ کسی بھی صورت میں ان اخلاقی واعتقادی برائیوں میں ہرگز ملوث نہ ہوئے۔

ج: مفہوم دعوت:

جب ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے معنی ومفہوم پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو اس ماحول میں رائج رسومات کے بالکل برعکس دعوت دیتے تھے۔ وہ بت پرست تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کی دعوت دی، وہ معاد کے منکر تھے اور آپ معاد پر اعتقاد کو شرط اسلام سمجھتے تھے، وہ لڑکیوں کو زندہ دفناتے تھے اور عورت کے لئے کسی قسم کے احترام کے قائل نہ تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو پھر سے عظمتِ انسانی بخشی، وہ سود خوار وذخیرہ اندوز تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود خواری وذخیرہ اندوزی سے منع فرمایا۔ معاشرے میں شراب نوشی اور جوابازی رائج تھی اور آپ نے ان کاموں کو شیطانی کردار کہہ کر ان سے اجتناب کو واجب قرار دیا۔

۱۔ سیرہ ابن ھشام، ج۱، ۲۰۹۔

د: دعوت وتبلیغ کے وسائل:

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کے سلسلے میں جن وسائل سے کام لیا وہ بالکل انسانی واخلاقی تھے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہرطرح کے غیرانسانی طریقے،جیسے دشمن پر پانی بند کرنایاپانی کوآلودہ کرنا،درختوں کوکاٹناجیسے طریقوں کونہیں اپنایا۔بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نصیحت فرماتے تھے کہ عورتوں،بچوں اور بوڑھوں کواذیت وآزار نہ پہنچائیں،درختوں کونہ کاٹیں اوراتمام حجت سے پہلے دشمن پرحملہ نہ کریں۔آپ، ماکیاولے کی منطق (مقصدکوپہنچنے کے لئے ہرقسم کے وسیلے کوبروئے کارلانے)جیسے مفہوم سے سخت بیزار تھے۔نمونہ کے طور پر جنگ خیبرمیں،دشمن کوپانی مسموم کرکے شکست دینے کی ایک یہودی کی تجویزکو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہرگز قبول نہ کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی تاریخ دشمنوں کے ساتھ آپ کے کریمانہ برتاؤکےقصوں سے بھری پڑی ہے۔

ھ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنے والوں کے صفات وکردار:

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرایمان لانے والوں کے حالات،افکاراوران کے کردارکامشاہدہ کرکے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حق گوئی کااندازہ کیاجاسکتاہے۔ظاہرہے کہ اگرکسی کی دعوت معاشرے کی ممتازشخصیتوں پرمؤثرثابت ہوجائے،تویہ دعوت کرنے والے کی صداقت وحقانیت کی علامت ہے،لیکن اگراس کے اردگردونیا پرست جمع ہوجائیں تو یہ اس کے دعوے کی کمزوری ہوگی۔پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی شیدائیوں میں عظیم شخصیتیں جیسے:امیرالمؤمنین حضرت علی ابن ابیطالب،جعفرابن ابیطالب،سلمان فارسی ، ابوذرغفاری،بلال حبشی،مصعب،ابن مسعود،مقداد اورعمارقابل

ذکر ہیں کہ تاریخ نے ان کے نیک کردار زہد وتقویٰ، جہاد وایثار اور پاک دامنی کا اعتراف کیا ہے۔

و: ماحول پر مثبت اثر اور ایک عظیم و پرشکوہ تہذیب کی داغ بیل:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۲۳ سال کی مدت میں جزیرۃ العرب کے حالات کو دگرگوں کر کے رکھدیا۔ آنحضرتؐ نے لٹیروں اور غارتگروں کو امین ودیانتدار بنادیا اور بت پرستوں کو ایسا مستحکم و پائیدار موحد ومفکر بنادیا کہ انہوں نے نہ صرف اپنے معاشرے میں ایک باشکوہ تہذیب کی داغ بیل ڈالی بلکہ ایک بے نظیر اسلامی تہذیب کو دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیلایا۔ صدر اسلام کے عظیم مسلمان جناب جعفر ابن ابیطالب نے اس امر کی تائید کرتے ہوتے حبشہ کے بادشاہ کے سوال کے جواب میں اس طرح فرمایا:

''اے حاکم خدا نے ہمارے درمیان ایک ایسے پیغمبر کو مبعوث کیا ہے کہ جس نے ہمیں بت پرستی اور جوابازی سے نجات دیکر نماز، زکات، انصاف، نیکی اور اپنے اعزہ واقربا کی مدد کی طرف دعوت دی اور ظلم وستم اور فحشا اور برے اعمال سے منع فرمایا۔''

مذکورہ، اور اسی جیسے دیگر شواہد وقرائن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت وحقانیت کے بہترین گواہ ہیں۔ ان خصوصیات کا مالک شخص قطعی طور پر اپنی نبوت اور غیب کی دنیا سے رابطہ رکھنے کے دعوے میں سچا تھا، اس کے علاوہ اور بھی قرائن موجود ہیں جو ان مطالب کی تائید کرتے ہیں۔

۷۵ ویں اصل:

گزشتہ پیغمبر کی تصدیق:

دعوائے نبوت کے ثبوت کا ایک طریقہ گزشتہ پیغمبر کی تصدیق ہے۔ چونکہ فرض اس بناء پر ہے کہ اگر گزشتہ نبی کی پیغمبری قطعی دلائل سے ثابت ہوئی ہو، تو قدرتی طور بعد والے پیغمبر کے سلسلے میں اسکی پیشگوئی ایک مستحکم سند ہوسکتی ہے۔ قرآن کی بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اہل کتاب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے فرزندوں کی طرح پہچانتے تھے، یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی علامتیں ان کی آسمانی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس امر کا دعویٰ کیا ہے اور کسی نے اسکی تردید نہیں کی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿الَّذِينَ ءَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَٰبَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَآءَ هُمْ وَ إِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (بقرہ/۱۴۶)

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ رسول کو اپنی اولاد کی طرح پہچانتے ہیں، بس ان کا ایک گروہ ہے جو حق کو دیدہ ودانستہ چھپا رہا ہے۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوی کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بشارت دی ہے اور کہا ہے کہ: ''میں تم لوگوں کو اپنے بعد ایک پیغمبر کے آنے کی بشارت دیتا ہوں کہ اس کا نام احمد ہوگا:

﴿وَمُبَشِّراً بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ (صف/۶)

اور اہل کتاب نے اس دعوے کی تردید نہیں کی ہے اگرچہ حقیقت کے اظہار میں لیت ولعل کرتے رہے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کتاب انجیل صدیوں پہلے تحریف سے دچار ہونے کے باوجود، انجیل یوحنا کی فصل ۱۴، ۱۵، اور ۱۶ میں حضرت مسیح کی یہ پیشگوئی کہ ایک شخص بنام فارقلیطا = (ستائش شدہ-محمد) آنے والا ہے، موجود ہے اور محققین اس کی طرف رجوع کرسکتے ہیں(۱)۔

۱۔ کتاب انیس الاعلام کا مطالعہ کیا جائے۔

۶۷ویں اصل:

جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات قرآن مجید تک ہی محدود نہ تھے بلکہ آپ مختلف مقامات پر لوگوں کو قائل کرنے کے لئے معجزے دکھاتے تھے۔ یہاں پر اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ عقل کی کسوٹی پر بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اصولی طور پر قرآن کے علاوہ دیگر معجزات کا بھی حامل ہونا چاہئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (۹) نو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے (۵) پانچ معجزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا یہ قابل قبول ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود کو دیگر انبیاء سے برتر اور خاتم انبیاء جانتے ہوئے دیگر پیغمبروں کے اتنے معجزے بیان کریں اور خود فقط ایک معجزہ کے حامل ہوں؟ اور کیا لوگ گزشتہ انبیاء کے بارے میں گونا گوں معجزات سننے کے باوجود پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف معجزوں کی آرزو نہ رکھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک ہی معجزہ دیکھنے پر اکتفا کر لیتے؟

جبکہ قرآن مجید نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد معجزات بیان کئے ہیں کہ ہم ذیل میں ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف: شق القمر:

جس وقت مشرکین نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے یہ شرط رکھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم خدا سے ایسا کر کے دکھا دیا۔ قرآن مجید کا اس سلسلے میں ارشاد ہے:

﴿اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ. وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ﴾ (قمر/۱-۲)

''قیامت قریب آ گئی اور چاند کے دوٹکڑے ہوئے۔اور یہ کوئی بھی نشانی (معجزہ) دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک مسلسل جادو ہے۔''

اس آیت کا ذیل اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ چاند کے دوٹکڑے ہونا قیامت کے دن سے متعلق نہیں ہے بلکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے متعلق ہے۔

ب : معراج:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک ہی رات میں مکہ میں مسجد الحرام سے فلسطین میں مسجد الاقصیٰ تک اور وہاں سے عالم بالا کی طرف تشریف لے گئے، ایسا عظیم سفر ایک مختصر وقت کے اندر، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیگر معجزات میں سے ایک ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے۔قدرت الٰہی اس سے برتر ہے کہ طبیعی عوامل واسباب اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم افلاک بالا کی طرف لے جانے میں مانع اور رکاوٹ بنیں۔(۱)

ج : مباہلہ:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے اہل کتاب کے ایک گروہ کو مباہلہ کی دعوت دی اور فرمایا:''آؤ تا کہ اپنے آپ کو، اپنے فرزندوں اور اپنی عورتوں کو مباہلہ کے لئے سامنے لائیں۔'' یہ مسلم ہے کہ مباہلہ دو طرف میں سے ایک کی نابودی وہلاکت پر ختم ہوتا۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آمادگی کا اعلان کیا۔لیکن اہل کتاب کے گروہ نے جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مصمم ارادے کے علاوہ یہ دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مباہلہ کے لئے اپنے خاندان کے عزیز ترین افراد کو ساتھ لے آئے ہیں، تو پسپائی قبول کر کے پیچھے ہٹ گئے۔اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

۱۔اسراء/۱۔

شرائط ماننے پر تیار ہو گئے۔(۱)

"عالم غیب کی خبر" کے موضوع میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غیب کی خبر دیتے تھے (۲)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی وحی الٰہی کے ذریعہ غیب کے خبر دیتے تھے، جن میں سے ایک رومیوں کی ایرانیوں پر فتحیابی (۳) کی پیشنگوئی اور دوسری فتح مکہ (۴) کی پیشنگوئی ہے۔

یہ ان معجزات کا ایک سلسلہ ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ محدثین اور مورخین اسلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے معجزات نقل کئے ہیں جو تواتر کی حد تک پہنچے ہیں۔

۱۔ آل عمران/۶۱۔

۲۔ آل عمران/۴۹۔

۳۔ روم/۲۔

۴۔ فتح/۲۷۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت کے خصوصیات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت چند خصوصیات کی حامل ہے۔ان میں سے چار چیزیں اہم ہیں،جن پر ہم آئندہ تین اصولوں میں بحث کریں گے۔

۷۷ ویں اصل:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دین عالمی ہے اور کسی خاص قوم یا علاقہ سے متعلق نہیں ہے،جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا كَآفَّةٗ لِّلنَّاسِ بَشِيرٗا وَنَذِيرٗا﴾ (سبا/۲۸)

''اور اے پیغمبر ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے یہ اور بات ہے کہ اکثر لوگ اس حقیقت سے باخبر نہیں ہیں۔''

مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا رَحۡمَةٗ لِّلۡعَٰلَمِينَ﴾ (انبیاء/۱۰۷)

''اور ہم نے آپ کو عالمین کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

اسی بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعوت کے دوران کلمہ ''الناس'' استعمال فرماتے تھے۔ جیسے کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿یٰاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآئَکُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّکُمْ فَئَامِنُوا خَیْرًا لَّکُم﴾ (نساء/۱۷۰)

''اے انسانو تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے حق لے کر رسول آ گیا ہے لہذا اس پر ایمان لے آؤ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو طبیعی طور پر یہ سلسلہ اپنے قبیلہ کو ڈرانے سے شروع کیا تا کہ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہ آیا تھا۔

﴿لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰھُم مِّن نَّذِیرٍ مِّن قَبْلِکَ﴾ (سجدہ/۳)

''تا کہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس کی طرف آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا رسول نہیں آیا ہے۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا دائرہ ایک خاص گروہ تک ہی محدود تھا۔ اسی لئے، اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید، جب ایک خاص گروہ کو دعوت دیتا ہے تو فوراً ہی اپنی دعوت کو ان تمام افراد کے لئے بھی حجت قرار دیتا ہے جن تک یہ دعوت پہنچ سکے اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاُوحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْءَ انُ لِاُنذِرَکُم بِہِ وَمَنْ بَلَغَ﴾ (انعام/۱۹)

''اور میری طرف اس قرآن کی وحی کی گئی ہے تا کہ اس کے ذریعہ میں تمہیں اور جہاں تک یہ پیغام پہنچے سب کو ڈراؤں۔''

ظاہر ہے کہ انبیاء کو سب سے پہلے اپنی قوم وقبیلہ کو ہی اپنے دین کی دعوت دینی چاہئے، چاہے ان کی دعوت عالمی ہو یا علاقائی۔ قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے کہ: ''کسی نبی کو ہم نے اس

قوم کی زبان کے بغیر نہیں بھیجا۔"

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (ابراہیم/۴)

لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ کسی رسول کو اپنی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجنا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ اس کی دعوت کا دائرہ اس کی قوم تک ہی محدود ہے۔

۷۸ ویں اصل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت، آخری نبوت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت آخری شریعت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب آخری الٰہی کتاب ہے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور آپ کی شریعت ایک جاودان شریعت کے طور پر قیامت تک باقی رہے گی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے آخری نبوت ہونے کے دو مطلب لئے جاسکتے ہیں:

۱۔ اسلام، گزشتہ تمام شریعتوں کا ناسخ ہے۔ اس کے آنے کے بعد گزشتہ شریعتوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔

۲۔ آئندہ کوئی آسمانی شریعت نہیں آئے گی اور ہر قسم کی نئی آسمانی شریعت کا دعویٰ باطل ہے۔

ختم نبوت کا موضوع، قرآن اور اسلامی احادیث میں جس طرح واضح طور سے بیان ہوا ہے اس سے کسی کے لئے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہم ذیل میں چند اہم امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَ كَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيماً﴾ (احزاب/۴۰)

"محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تمہارے مردوں میں سے کسی ایک کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور سلسلۂ انبیاء کے خاتم ہیں اور اللہ ہر شے کا خوب جاننے والا ہے۔"

''خاتم'' انگوٹھی کو کہتے ہیں (صدر اسلام میں) لوگوں کی انگوٹھیوں کے نگین ان کی مہریں ہوا کرتی تھیں کہ ان سے مکتوبات پر مہر لگاتے تھے، یعنی پیغام یا مطلب ختم ہوا۔ اس لحاظ سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی کی تشریف آوری کے بعد پیغمبری و نبوت کے طومار پر اختتام کی مہر لگ گئی اور نبوت کی فائل بند ہوگئی ہے۔

اس کے علاوہ چونکہ ''رسالت'' کا مطلب وحی کے ذریعہ حاصل شدہ پیغامات کو پہنچانا ہے، قدرتی طور الٰہی رسالت نبوت کے بغیر ممکن نہیں، نتیجہ کے طور پر ختم نبوت ختم رسالت کا بھی لازمہ ہے(۱)۔

اس امر کی دلیل میں بہت سی احادیث موجود ہیں۔ ہم یہاں پر صرف ایک حدیث یعنی حدیث ''منزلت'' کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جنگ تبوک کے دوران حضرت علی علیہ السلام کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا اور اُن سے فرمایا:

الاٗ ترضیٰ ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ الّا انّه لانبی بعدی.(۲)

''کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تمہاری منزلت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی، فقط یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔''

حدیث منزلت (جو ایک متواتر حدیث ہے) کے علاوہ ختم نبوت کے سلسلے میں بیان شدہ احادیث کا ایک مجموعہ ہے جو تواتر کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۔ خاتمیت کے گواہ کے طور صرف مذکورہ آیت نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں قرآن مجید میں نصوص شگانہ ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خاتمیت پر گواہی دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو مفاہیم القرآن:۳/۱۳۰ - ۱۳۹

۲۔ صحیح بخاری:۳/۵۸، صحیح مسلم:۲/۳۲۳، امالی صدوق، ص۲۸ و۴۷و۸۱، بحار الانوار، ۳۷/۲۵۴-۲۸۹، باب ۵۳، بخاری، صحیح، ۳/۵۴، باب غزوة تبوک، مسلم ۴/۱۸۷۱ ط ۱۳۷۵، ترمذی، سنن، ۲/۳۰۱، سیرہء ابن ہشام ۴/۱۶۲، أحمد، مسند، ۱/۱۷۴۔

۷۹ ویں اصل:

دین اسلام کے جاوداں اور لافانی ہونے کا راز دو چیزوں میں مضمر ہے:

الف: شریعت اسلام نے انسان کی طبیعی اور فطری ضرورتوں کو الٰہی ہدایتوں کے ذریعہ پورا کرنے کے لئے کامل ترین منصوبہ عمل پیش کیا ہے اور یہ منصوبہ اس قدر کامل ہے کہ اس سے بہتر و کامل تر منصوبہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ب: اسلام نے احکام عملی کی قلمرو میں بھی وسیع، ہمہ گیر اور مستحکم اصول وکلیات کا ایک سلسلہ بیان کیا ہے جو انسان کی نوع بہ نوع اور روزمرہ کی ضرورتوں کا حل ہو سکتے ہیں۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ فقہائے اسلام، خاصکر شیعہ فقہا، گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران اسلامی معاشرہ میں احکام عملی کے میدان میں ہر قسم کی ضرورتوں کا خاطر خواہ جواب دیتے آئے ہیں اور آج تک ایک بھی ایسا مسئلہ پیش نہیں آیا ہے کہ اسلامی فقہ نے اس کے جواب میں ناتوانی کا اظہار کیا ہو۔ اس مقصد تک پہنچنے میں درج ذیل امور مؤثر ومفید ثابت ہوئے ہیں:

۱۔ حجیت عقل:

پوری انسانی زندگی میں فیصلہ کے مواقع پر عقل کی حجیت اور اس کا اعتبار، فرائض کے استنباط کے طریقوں میں سے ایک طریقہ رہا ہے۔

۲۔ اہم و مہم میں اہم کا لحاظ رکھنا:

ہم جانتے ہیں کہ احکام اسلام، اشیاء کے واقعی اور ذاتی (یا عرضی) معیارات مصلحتوں اور مفاسد کے ایک سلسلے کا نتیجہ ہیں۔ ان احکام میں سے بعض کو عقل کے ذریعہ حل کیا جاتا ہے اور بعض کو شرع بیان کرتی ہے۔ ان معیاروں کی شناخت کی بنیاد پر فقیہ ان کے باہمی تزاحم کی صورت میں اہم کو مہم پر ترجیح دیکر مشکل کو حل کرسکتا ہے۔

۳۔ باب اجتہاد کا کھلا ہونا:

امت اسلامیہ کے لئے اجتہاد کے دروازے کا کھلا رہنا۔ جو مذہب شیعہ کے

افتخار وامتیاز میں شمار ہوتا ہے۔بذات خود دین اسلام کے آخری دین ہونے کی دلائل میں سے ہے۔

۴۔احکام ثانویہ:

شریعت اسلام میں احکام اولیہ کے علاوہ احکام ثانویہ کا ایک سلسلہ بھی موجود ہے، جس سے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔مثال کے طور پر ایسے مواقع پر کہ جہاں کسی مسئلہ کے سلسلے میں حکم کا اطلاق افراد کے لئے عسر وحرج یا نقصان وضرر کا باعث بنے، تو فقہ میں بیان شدہ شرائط کے تحت یہ اصول یعنی "نفی حرج" یا "لاضرار" کا قاعدہ، تعطّل اور کوتاہ دستی کو توڑنے میں شریعت کو تقویت بخش کر اس کی مدد کر سکتا ہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿وَمَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (حج/۷۸)

"اور دین میں کوئی زحمت نہیں قرار دی ہے۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اعلان کیا ہے: لاضَرَرَ وَلاضِرار۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ جو مکتب مذکورہ دو قاعدوں یا ایسے دیگر قواعد کا حامل ہو، اس کے پیرو اپنی زندگی میں ہرگز مشکل کا شکار نہیں ہوں گے۔

ختم نبوت کی تفصیلی بحث، علم کلام کی کتابوں میں ملاحظہ کی جا سکتی۔

۸۰ویں اصل:

شریعت اسلام کی خصوصیت میں سے ایک اس کا معتدل ہونا اور اس کے مفاہیم واحکام کو سمجھنے کی آسانی ہے اور اسی وجہ کو دنیا کی مختلف اقوام وملتوں میں وسیع سطح پر اس دین کے پھیلاؤ کے اہم ترین اسباب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔اسلام، خدا پرستی کے بارے میں ایک خالص اور واضح توحید کو بیان کرتا ہے جو ہر قسم کے شبہہ و پیچیدگی سے پاک ہے۔قرآن مجید کا صرف سورہء توحید اس دعوے کے ثبوت میں کافی ہے۔انسان کے مقام ومنزلت

کے سلسلے میں یہ مقدس کتاب تقویٰ کو بنیاد قرار دیتی ہے اور تقوی بذاتِ خود تمام اخلاقی صفات کا احاطہ کرتا ہے۔ عملی احکام کے باب میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ اسلام ہر قسم کے عسر و حرج کی نفی کرتا ہے، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کو ایک سہل و آسان شریعت کا لانے والا بتایا ہے:

جِئْتُ بِشَرِيعَةٍ سَهْلَةٍ سَمحةٍ.

''میں ایک سہل اور آسان شریعت لیکر آیا ہوں۔''

باانصاف اور بے غرض مصنفوں، حتیٰ غیر مسلم دانشوروں نے بھی اس حقیقت کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ دین اسلام کے جلدی پھیلنے کی وجہ اس کے احکام وتعالیم کا واضح طور مکمل اور ہمہ گیر ہونا تھی۔ ایک فرانسی دانشور ڈاکٹر گوستا ولوبون کہتا ہے:

''اسلام کی ترقی کا راز اس کے سہل و آسان ہونے میں مضمر ہے۔ اسلام ایسے امور سے پاک ہے جن کو عقل سلیم ماننے سے انکار کرتی ہے۔ لیکن دیگر ادیان میں اس قسم کے نمونے فراواں پائے جاتے ہیں۔ جتنا بھی غور کیا جائے اسلام سے سادہ تر اصول کہیں نہیں ملیں گے، جیسا کہ اسلام کہتا ہے: ''اللہ ایک ہے، تمام لوگ خدا کے سامنے مساوی ہیں، انسان چند فرائض دینی کو انجام دیکر مشیت اور سعادت کو پہنچتا ہے اور ان سے منہ پھیر کر جہنم میں چلا جاتا ہے۔'' احکام الٰہی کے صاف وشفاف اور سادہ ہونے کی وجہ سے دین اسلام کو دنیا میں پھیلنے میں مدد ملی ہے۔ اس سے اہم امروہ قوی ایمان ہے جو اسلام نے دلوں میں ڈال دیا ہے، ایسا ایمان جسے کسی بھی قسم کا شبہہ دلوں سے جدا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسلام جس طرح علمی میدان میں ایجاد وانکشاف کے سلسلے میں تمام ادیان کے مقابلہ میں مناسب ونرم ولطیف ہے اسی طرح لوگوں کو درگزر کرنے کی ترغیب دینے میں بھی ایک ایسا عظیم دین ہے جو انسان کی تہذیب نفس کرتا اور اخلاق کو سنوار سکتا ہے۔''(۱)

۱۔ تمدن اور مغرب، تألیف ڈاکٹر گستا ولوبون، فرانسیسی ص ۱۴۲-۱۴۳

۱۸ویں اصل:

گزشتہ انبیاء جو آسمانی کتابیں لے کر آئے تھے، افسوس ان کے بعد ان کتابوں میں ہٹ دھرموں اور خودغرضوں کے ہاتھوں تدریجاً تحریف ہوئی ہے، اس بات کی گواہی قرآن مجید کے علاوہ تاریخ بھی دیتی ہے۔اس کے علاوہ خود ان کتابوں کا مطالعہ اور انکے مطالب میں غور وفکر کرنے سے بھی یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے، کیونکہ ان کتابوں میں کچھ ایسے مطالب کا سلسلہ داخل کیا گیا ہے کہ وحی الٰہی کی طرف سے ہرگز ان کی تائید نہیں ہوسکتی ہے۔اس کے علاوہ موجودہ انجیل اکثر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح حیات کی صورت میں ہے کہ اس میں ان کو سولی پر چڑھانے کی وضاحت کی گئی ہے۔لیکن گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی کتابوں میں واضح تحریفات کے باوجود قرآن مجید ہر قسم کی کمی یا زیادتی سے محفوظ رہا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کے ۱۱۴ سورے یادگار کے طور پر دنیا کے حوالے کئے ہیں اور کاتبان وحی۔خصوصاً حضرت علی علیہ السلام جو روز اول سے وحی الٰہی کو لکھتے رہے تھے۔نے ان کو تحریر کیا ہے۔خوش قسمتی سے ۱۵ صدیاں گزرنے کے باوجود قرآن کی آیات اور سوروں میں سے نہ کوئی چیز کم ہوئی ہے اور نہ اس میں کسی چیز کا اضافہ ہوا ہے۔یہاں پر ہم عدم تحریف قرآن کے سلسلے میں کچھ دلائل واسباب کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔یہ کس طرح ممکن ہے کہ قرآن مجید میں تحریف واقع ہوجائے جبکہ خداوند کریم نے خود اس کی حفاظت کی ضمانت لی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (حجر/۹)

''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

۲۔خداوندمتعال نے قرآن مجید میں ہر قسم کے باطل کے داخل ہونے کی تردید کی ہے،ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَّا يَأْتِيهِ الْبَٰطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (فصلت/۴۲)

''اس کے قریب،سامنے یا پیچھے کسی طرف سے باطل آ بھی نہیں سکتا ہے کہ یہ خدائے حکیم وحمید کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔''

خداوندمتعال نے قرآن مجید میں جس باطل کے داخل ہونے کی تردید کی ہے،اس کا مطلب اس قسم کا باطل ہے جو قرآن کی توہین کا باعث بنے۔چونکہ قرآن کے الفاظ میں کمی وبیشی کرنا اس کی بے احترامی وتوہین ہے لہٰذا اس مقدس کتاب میں ہرگز کسی قسم کی کمی یازیادتی واقع نہیں ہوتی ہے۔

۳۔تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان قرآن کی تعلیم اوراس کو حفظ کرنے میں انتہائی دلچسپی دکھاتے تھے۔پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عربوں کے درمیان ایسے قوی حافظ موجود تھے جو صرف ایک بار طولانی خطبہ سننے کے بعد اسے یاد کر لیتے تھے،اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے قاریوں کے ہوتے ہوئے قرآن مجید میں کسی قسم کی تحریف ہوئی ہو؟

۴۔اس میں شک نہیں کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام چند مسائل میں خلفاء سے اختلاف نظر رکھتے تھے اوراپنی مخالفت کو مختلف مواقع پر منطقی طور سے ظاہر بھی کرتے تھے جس کا ایک نمونہ خطبہ شقشقیہ اوران کے دفاعیات ہیں۔اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی میں ایک حرف بھی تحریف قرآن کے بارے میں نہیں فرمایا ہے۔اگر(نعوذ باللہ)قرآن مجید میں تحریف ہوتی تو آپ علیہ السلام کسی بھی صورت میں خاموش نہ رہتے۔اس کے برعکس آپ ہر وقت قرآن میں تدبیر کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے اورفرماتے تھے:

لیس لاحدٍمن بعدالقرآن من فاقةٍ ولابعد القرآن من غنی

فکونوا من حرثته واتباعه.(۱)

''اے لوگو قرآن کی پیروی کرنے والے فقر و نیازمندی سے دوچار نہیں ہوں گے۔ اور قرآن کی پیروی کے بغیر غنا اور بے نیازی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لئے اپنی زندگی کی زمین میں قرآن کے بیج ڈالو اور اس کے پیروؤں میں سے ہو جاؤ۔''

مذکورہ اور ان کے علاوہ دیگر دلائل کی بناء پر شیعہ امامیہ کے بلند پایہ علماء نے اہل بیت اطہار علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے قدیم زمانے سے آج تک قرآن مجید کے تحریف سے محفوظ ہونے کی حقیقت کی تاکید کی ہے۔ ان میں سے درج ذیل شخصیتوں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ فضل ابن شاذان (متوفی ۲۶۰ھ۔ عصر ائمہ میں زندگی کرتے تھے)۔ کتاب الایضاح رص ۲۱۷ میں۔

۲۔ شیخ صدوق (متوفی ۳۸۱ھ)۔ کتاب الاعتقادات ر۹۳۔

۳۔ شیخ مفید (متوفی ۴۱۳ھ)۔ کتاب اجوبۃ المسائل السرویہ مطبوع درمجموعۃ الرسائل رص ۲۶۶۔

۴۔ سید مرتضی (متوفی ۴۳۶ھ)۔ کتاب جواب المسائل الطرابلسیات کہ اس کے کلام کو شیخ طبری نے مجمع البیان کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔

۵۔ شیخ طوسی معروف بہ شیخ الطائفہ (متوفی ۴۶۰ھ) کتاب التبیان ج۱رص۳۔

۶۔ شیخ طبری (متوفی ۵۴۸ھ)۔ مجمع البیان کے مقدمے میں عدم تحریف قرآن کی تشریح اور تاکید کی ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۱۔

۷۔سید ابن طاووس (متوفی ۶۶۴ھ)۔کتاب سعد السعود ص ۱۴۴ میں فرماتے ہیں ''عدم تحریف قرآن امامیہ کا نظریہ ہے۔''

۸۔علامہ حلّی (متوفی ۷۲۶ھ)۔کتاب اجوبۃ المسائل المھناویہ ص ۱۲۱ میں لکھتے ہیں: ''حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی واقع نہیں ہوئی ہے اور میں تحریف کے قول کے سلسلے میں خدا سے پناہ چاہتا ہوں، کیونکہ یہ امر پیغمبر کے ایک متواتر معجزے میں شک کا باعث بنتا ہے۔''

ہم یہاں پر تحریف قرآن کے منکر علمائے شیعہ کے ذکر کو تمام کرتے ہوئے اس امر کی تاکید کرتے ہیں کہ شیعہ امامیہ کے بلند پایہ علماء مختلف زمانوں میں قرآن کے عدم تحریف کے عقیدے کے قائل رہے ہیں اور عصر جدید میں بھی تمام شیعہ مراجع اسی عقیدہ کے قائل ہیں۔

۸۲ ویں اصل:

حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں کچھ ایسی روایتیں بھی نقل ہوئی ہیں جن سے بعض کو تحریف قرآن کی دلیل قرار دیا جاتا ہے۔لیکن اس سلسلے میں توجہ کرنے کی ضرورت ہے:

اول یہ کہ: اس قسم کی اکثر روایتیں ایسے افراد اور ایسی کتابوں سے نقل کی گئی ہیں جو مستند و معتبر نہیں ہیں۔جیسے احمد بن محمد سیاری (متوفی ۲۸۶ھ) کی کتاب ''قرائت'' کہ علمائے رجال نے اس کی روایتوں کو ضعیف قرار دیا ہے اور اس کے مذہب کو فاسد جانا ہے(۱)۔یا علی بن احمد کوفی (متوفی ۳۵۲ھ) کی کتاب کہ علماء رجال نے ان کے بارے میں کہا ہے: آخر عمر میں اس نے غلو کا راستہ اختیار کر لیا تھا(۲)

۱۔رجال نجاشی: ۱/۲۱۱، شمارہ ۱۹۰، ترجمہ ۱۹۰۔

۲۔رجال نجاشی ۲/۹۶، شمارہ ۶۸۹، ترجمہ ۶۸۹۔

دوسرے یہ، کہ: روایات کے جس حصہ کو تحریف قرآن کی دلیل قرار دیا گیا ہے وہ تفسیری پہلو رکھتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں روایت میں مصداق پر آیت کے مفاد کلی کو تطبیق دیا گیا ہے، اور کچھ لوگوں نے تصور کیا ہے کہ مذکورہ تفسیر اور تطبیق خود قرآن کا جزء تھا اور اس سے حذف ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ حمد میں "صراط المستقیم" کی تفسیر روایت میں "صراط پیغمبر اور اہل بیت علیہم السلام" سے کی گئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کی تفسیر اپنی فرد اعلیٰ (یعنی متن قرآن) پر کلی مطابقت ہے(۱) (جسے جزء قرآن سمجھ لیا گیا ہے۔)

امام خمینیؒ نے ان روایتوں کو جن سے تحریف کا مفہوم لیا جاتا ہے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

الف. ضعیف روایتیں، جن سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

ب. جعلی روایتیں، جن کا نقلی ہونا واضح ہے۔

ج. صحیح روایتیں کہ اگر ان کے مفہوم و معنیٰ پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں تحریف کا مقصد ان کے معنی میں تحریف ہے نہ کہ ان کے الفاظ میں کسی قسم کی کمی و بیشی۔

تیسرے یہ کہ جو لوگ کسی مذہب کے پیروؤں کا عقیدہ معلوم کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ ان کی اعتقادی و علمی کتابوں کا مطالعہ کریں، نہ کہ ان احادیث کی کتابیں پڑھیں جن کو تألیف کرنے میں مؤلف کا مقصد صرف حدیثوں کو اکٹھا کرنا ہوتا ہے اور ان کی تحقیق کا کام دوسروں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طرح کسی مذہب کے پیروؤں کے شاذ و نادر نظریات کی طرف رجوع کر کے اس مذہب کے مسلم عقائد کو نہیں پہچانا جا سکتا اور اصولی طور پر کسی مذہب کے علماء و دانشوروں کی قطعی اکثریت کے مقابلے میں ایک یا دو افراد کے قول کو بطور سند تسلیم کرنا انصاف نہیں ہے۔

تحریف کی بحث کے اختتام پر چند اہم نکات کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے:

۱۔ طبرسی مجمع البیان ۱/۲۸ ، ط

۱۔تحریف قرآن کے سلسلے میں اسلامی فرقوں کا ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا۔خصوصاً موجودہ زمانے میں۔اسلام کے دشمنوں کو فائدہ پہنچانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۲۔اگر بعض شیعہ علماء نے تحریف قرآن کے سلسلے میں کوئی کتاب لکھی ہو تو اسے خود ان کا ذاتی نظریہ شمار کرنا چاہئے نہ کہ شیعہ علماء کی قطعی اکثریت کا نظریہ۔اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی کتابوں کی اشاعت کے بعد شیعہ علماء کی طرف سے اس کی مذمت اور رد میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔اسی طرح جب ۱۳۴۵ھ۔ق۔میں ایک مصری عالم نے اہل سنت کی حدیث کی کتابوں سے استناد کر کے تحریف قرآن کے ثبوت کے طور پر ''فرقان'' نام کی کتاب لکھی تو الازہر یونیورسٹی کے علماء کی طرف سے اس کی رد کی گئی اور اسے ضبط کر لیا گیا۔

۳۔دنیا بھر کے مسلمانوں کی آسمانی کتاب ''قرآن مجید'' ہے۔یہ کتاب ۱۱۴ سوروں پر مشتمل ہے،اس کا پہلا سورہ ''الحمد'' اور آخری ''الناس'' ہے۔اور کلام الٰہی کی یہ کتاب ''قرآن'' کے نام اور ''مجید''، ''کریم'' اور ''حکیم'' (۱) جیسے صفات سے متعارف ہوئی ہے۔مسلمان کبھی کبھی اسے ''مصحف'' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔عربی زبان میں ''مصحف'' تحریر شدہ اوراق کے ایک مجموعے کو کہتے ہیں جن کو ایک جگہ پر جمع کیا گیا ہو۔روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جب قرآن کے سوروں کو ایک جگہ جمع کیا گیا تو کچھ اصحاب نے اسے ''مصحف'' کہنے کا مشورہ دیا(۲)۔

اس لحاظ سے ''مصحف'' تحریر شدہ اوراق کے ایک مجموعے کو کہتے ہیں جو کتاب کی صورت میں ایک جگہ جمع کئے گئے ہوں،خواہ یہ قرآن ہو یا دوسری کوئی کتاب۔خود قرآن مجید نامہء اعمال کو ''صحف'' کا نام دیتا ہے اور فرماتا ہے:

﴿وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾ (تکویر/۱۰)

''اور جب نامہ اعمال منتشر کردئے جائیں گے۔''

۱۔''ق۔والقرآن المجید''ق/۱۔''انہ القرآن کریم فی کتاب مکنون''واقعہ/۷۷۔''یٰس۔و القرآن الحکیم''یٰس/۱)

۲۔الاتقان:۱/۸۵۔

اسی طرح دوسری آسمانی کتابوں کو بھی ''صحف'' کا نام دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ﴾ (اعلیٰ/۱۹)

''ابراھیم اور موسیٰ کی کتابیں۔''

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ ''صحیفہ'' یا ''مصحف'' کے وسیع معنیٰ ہیں، اگرچہ یہ کلمہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد قرآن مجید کے ایک نام کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

اس لحاظ سے یہ امر بالکل تعجب خیز نہیں ہے اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ ء زہرا علیہا السلام کی کتاب کو ''مصحف'' کہا جاتا ہے۔ اس مصحف کی حقیقت کے بارے میں حضرت امام صادق علیہ السلام ایک روایت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''حضرت فاطمہ ء زہرا علیہا السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ۷۵ دن زندہ رہیں، اس مدت میں اُن پر غم واندوہ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ جبرئیل امین (خدا کے حکم سے) نازل ہوتے تھے اور حضرت زہراء علیہا السلام کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں نیز خدا کے نزدیک خود ان کے مقام ومنزلت کے بارے میں بیان فرماتے تھے اور اس طرح حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کو تسلی دیتے تھے۔ اور اس کے علاوہ مستقبل میں رونما ہونے والے حوادث کے بارے میں ان کو خبر دیتے تھے۔ اور امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام جبرئیل امین کے بیانات کو (جیسے حضرت فاطمہ ء زہرا علیہا السلام آپ کو املاء فرماتی تھیں) لکھتے تھے اور یہی کتاب ''مصحف فاطمہ'' کہلاتی ہے۔''(۱)

ابو جعفر، امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

مصحف فاطمة مافيه شيء من كتاب الله وانّما هو شيء القي اليها بعدموت ابيهاصلوات الله عليها

''مصحف فاطمہ علیہا السلام میں کتاب الٰہی میں سے کوئی چیز نہیں

ا۔ کافی: ۱/۲۴۰۔

ہے (یعنی تصور نہ کیجئے کہ یہ قرآن ہے) بلکہ اس کتاب کے مطالب
ان کے والد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ان پر الہام ہوئے
ہیں۔"

ہم فقہ اور حدیث سے متعلق حصے میں بیان کریں گے کہ امت اسلامی میں ایسی بلند پایہ شخصیتیں گزری ہیں کہ نبی نہ ہونے کے باوجود ان سے فرشتے باتیں کرتے تھے۔ ایسے افراد کو "محدَّث" کہتے ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی "محدثہ" تھیں۔

ساتواں حصہ

کلیات عقائد

(٦)

امامت وخلافت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی شریعت کی تبلیغ اور مدینہ فاضلہ کی بنیاد ڈالنے کے لئے ۲۳ سال تک انتہائی جدوجہد کے بعد گیارھویں ہجری کے ابتدائی ایام میں اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد، باوجود اس کے کہ وحی ونبوت اختتام کو پہنچی اور اب نہ کوئی پیغمبر آئے گا اور نہ کسی نئی شریعت کی بنیاد ڈالی جائے گی، لیکن (وحی الٰہی کو پہنچانے کی ذمہ داری کے علاوہ) جو فرائض پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ تھے، وہ ہرگز منسوخ ہوکر اختتام کو نہیں پہنچے۔ نتیجہ کے طور پر لازم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ایک آگاہ اور متقی شخصیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ وجانشین اور مسلمانوں کے امام وپیشوا کی حیثیت سے ان فرائض کو ہر زمانے میں نبھائے۔ مذکورہ امر پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، اگرچہ جانشین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ صفات اور انتخاب کے طریقہء کار پر شیعہ وسنی حضرات کے درمیان اختلافِ نظر پایا جاتا ہے۔

ذیل میں ہم پہلے کلمہء ''شیعہ'' کے معنی بیان کرکے اس کی تاریخ پیدائش پر روشنی ڈالیں گے اور اس کے بعد امامت سے متعلق دیگر بحثوں کا ذکر کریں گے۔

۸۳ویں اصل:

لغت میں ''شیعہ'' کے معنی پیرو کے ہیں۔اور اصطلاح میں شیعہ ایک ایسے گروہ کو کہتے ہیں،جن کا اعتقاد یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد معاشرے کی رہبری حضرت علی علیہ السلام اوران کے معصوم فرزندوں کا حق ہے۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،اپنی پوری زندگی کے دوران مختلف مواقع پر حضرت علی علیہ السلام کے فضائل ومناقب کے علاوہ اپنے بعدان کی قیادت، رہبری اور جانشینی کے سلسلے میں مکرر بیان فرماتے رہے ہیں۔مستندروایات کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی سفارش باعث بنی تھی کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہی لوگوں کاایک گروہ حضرت علی علیہ السلام کے گرد جمع ہوکر شیعیان علی علیہ السلام کی نام سے مشہور ہوا۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعداس گروہ کے افراد اپنے اس عقیدہ پر باقی رہے اورانہوں نے رہبری کے سلسلے میں فردی اور اجتماعی مصلحت اندیشیوں کورسول خدا کی نص پر ترجیح نہیں دی۔اسی لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اوران کے بعد یہ گروہ ''شیعہ'' نام سے مشہور ہوا۔ملل ونحل کے لکھنے والوں نے بھی اس مطلب کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔

نوبختی (متوفی ۳۱۰ھ۔ق) لکھتا ہے:

''شیعہ ان لوگوں کوکہاجاتا ہے،جنہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اورآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علی علیہ السلام کوامام وخلیفہ کے عنوان سے قبول کیااور دیگرلوگوں سے جداہوکرعلی علیہ السلام سے جاملے۔''(۱)

ابوالحسن اشعری کہتا ہے:

''اس گروہ کو شیعہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ علی علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے دیگر صحابہ پر آپ علیہ السلام کوترجیح دیتے

۱۔فرق الشیعہ ص۱۷

ہیں۔"(۱)

شہرستانی لکھتا ہے:

"شیعہ وہ لوگ ہیں جو خصوصی طور پر حضرت علی علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے انھیں نص ووصیت کے ذریعہ امامت وخلافت کا حقدار سمجھتے ہیں۔"(۲)

۸۴ویں اصل:

آئندہ بحثوں میں ہم ثابت کریں گے کہ،مسئلہء امامت ایک الٰہی اور آسمانی مسئلہ ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین بھی وحی الٰہی کے ذریعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں سے معین ہونا چاہئے۔لیکن اس موضوع سے متعلق روایتوں اور عقلی دلائل کی وضاحت واستدلال سے پہلے فرض کریں کہ اس سلسلے میں کوئی شرعی نص دستیاب نہیں ہے۔ایسی حالت میں ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس زمانے کے حالات کے پیش نظر حکمِ عقل کا تقاضا کیا ہے؟

بدیہی طور عقل حکم کرتی ہے کہ اگر کوئی اصلاح کرنے والا اپنی سالہا سال کی انتھک کوششوں کے نتیجہ میں ایک منصوبہ کو روبہ عمل لاکر انسانی سماج میں ایک نئی روش پیدا کرے، تو فطری طور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس منصوبہ کو جاری رکھنے اور اس کی نشونما کے لئے چارہ جوئی کرے۔یہ بات عقلی طور پر کسی صورت میں صحیح نہیں کہ ایک شخص بڑی زحمتوں کے بعد ایک عمارت کی تعمیر کرے لیکن اس کو مستقبل میں پیش آنے والے احتمالی خطرات وحوادث سے محفوظ رکھنے کے لئے کسی قسم کا اقدام نہ کرے،اور اس کی حفاظت کے لئے کسی متولی یا ذمہ دار کو معین نہ کرے۔

۱۔مقالات اسلامیین ۱/۶۵

۲۔ملل ونحل ۱/۱۳۱۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم بشریت کی سب سے عظیم شخصیت ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شریعت اسلام کولاکر عالم بشریت میں ایک گہری تبدیلی رونما کی اور ایک نورانی تہذیب کی داغ بیل ڈالی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عالم بشریت کے سامنے ایک لافانی شریعت پیش کی اور اپنے زمانے میں انسانی معاشرے کی رہبری فرمائی۔ عقل کا تقاضا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آئندہ پیش آنے والے امکانی آفات اور اجتماعی خطرات سے اس لافانی شریعت کو بچانے اور امت جاوید کی اپنے بعد رہبری کرنے کیلئے کسی کا تعارف کر کے ضرور اس کا تدارک کیا ہوگا اور اپنے بعد والے رہبر کے اوصاف بیان فرمائے ہوں گے۔ کیونکہ یہ ہرگز معقول نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک لافانی اور ابدی شریعت کی بنیاد ڈال کر اس کی بقاء اور حفاظت کی ضمانت کے سلسلے میں کسی قسم کی منصوبہ بندی نہ فرمائیں۔ جس پیغمبر نے بشر کی سعادت کے لئے چھوٹے چھوٹے مسائل بیان کرنے سے بھی گریز نہ کیا، کیسے ممکن اور معقول ہے کہ معاشرے کی رہبری کے مسئلہ اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں۔ جو کلیدی اور بنیادی مسئلہ ہے۔ خاموش رہیں اور کوئی دستور العمل بیان نہ کریں اور حقیقت میں اسلامی معاشرے کو سرگردانی کی حالت میں چھوڑ کر چلے جائیں؟

اس لحاظ سے یہ دعویٰ قابل قبول نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے بعد امت اسلامیہ کی رہبری کے بارے میں کچھ نہ فرمایا۔

۸۵ ویں اصل:

اسلام کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے زمانے میں اس علاقہ اور دنیا کے حالات کو دیکھتے ہوئے، منصب امامت کا منصوص ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے وقت دین اسلام پر تین جانب سے خطرات کے بادل منڈلا رہے تھے۔ ایک طرف سے روم کی بادشاہت دوسری طرف سے ایران کی شہنشاہیت اور تیسری طرف سے داخلی منافقین کا خطرہ تھا۔ پہلے خطرے کی

اہمیت کے بارے میں ثبوت کے طور پر اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا کافی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے آخری لحظہ تک اس سلسلے میں کافی فکرمند تھے۔اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسامہ بن زید کی سرپرستی اور کمانڈ میں ایک بڑے لشکر کو رومیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کیلئے منظم کر کے روانہ کیا۔اور اس لشکر میں شمولیت سے اجتناب کرنے والوں کی مذمت اور لعنت کی تھی۔دوسرا بدخواہ دشمن وہ تھا جس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کو پھاڑ کر یمن کے گورنر کو حکم دیا تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قیدی بنا کر یا ان کے سر کو تن سے جدا کر کے بھیجدے۔اس کے علاوہ تیسرے اور داخلی دشمن (منافقین) کے بارے میں جان لینا چاہئے کہ یہ لوگ مدینہ میں اور مدینہ سے باہر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مسلسل مشکلات ایجاد کرتے رہے تھے اور گوناگوں سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کو مجروح کرتے رہے تھے۔قرآن مجید میں ایسے افراد کی رخنہ اندازیوں کے بارے میں کافی ذکر ہوا ہے، حتیٰ قرآن مجید میں مکمل ایک سورہ ان کے نام سے منسوب اور ان کے اعمالِ بد کے بارے میں ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قسم کے مثلث خطرے کے ہوتے ہوئے اور ہر طرف سے دشمن کے تاک میں ہونے کے باوجود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مناسب اور صحیح تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیادت ورہبری کا تعین کئے بغیر امت اسلامیہ اور دین اسلام کو اپنے حال پر چھوڑ کر چلے جاتے؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بخوبی جانتے تھے کہ عربوں کی اجتماعی زندگی قبیلوں پر مشتمل ہے اور مختلف قبیلوں کے افراد کے درمیان قبیلوں کے سرداروں کے بارے میں تعصب ان کی زندگی میں ممزوج ہو چکا ہے۔لہٰذا ایسے لوگوں پر رہبری اور قیادت کا انتخاب چھوڑنا اختلاف وافتراق اور فرقہ بندی کے علاوہ قبیلوں کے درمیان رسہ کشی کا باعث ہو سکتا تھا اور دشمن اس اختلاف سے اپنے حق میں استفادہ کر سکتا تھا۔اسی حقیقت کی بناء پر شیخ الرئیس ابوعلی

سینا کہتے ہیں:

"نص پیغمبر کے ذریعہ جانشین کا انتخاب صحیح ترین طریقہ ہے کیونکہ اس طرح اختلاف وافتراق اور ہرج ومرج کو روکا جاسکتا ہے۔"(۱)

۸۶ویں اصل:

اب یہ ثابت ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت اور دانائی کا تقاضا یہی تھا کہ اپنے بعد امت اسلامیہ کی قیادت کے لئے اقتضاء کے مطابق اقدام فرمائیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مسئلہ کی چارہ جوئی کے لئے کونسا طریقہ اختیار کیا ہے؟

یہاں پر دو نظریہ ہیں اور ان دونوں کے بارے میں ہم بحث وتحقیق کریں گے:

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم کے مطابق امت اسلامیہ کی قیادت ورہبری کے لائق ایک ممتاز اور مناسب شخصیت کا انتخاب کرکے اسے اپنے جانشین کی حیثیت سے لوگوں میں تعارف کرایا۔

۲۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جانشینی اور امت اسلامیہ کی رہبری کے انتخاب کا مسئلہ لوگوں پر چھوڑ دیا تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد خود اپنی مرضی سے کسی کا انتخاب کریں۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ان دو مذکورہ نظریات میں سے کونسا نظریہ کتاب وسنت، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور تاریخ کی کسوٹی پر اترتا ہے؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی پر۔ اپنے اعزہ واقرباء کے بعد عام لوگوں میں اپنے دین کا اعلان کرنے کے دن سے اپنی وفات تک۔ غور کرنے سے بخوبی پتہ چلتا ہے

۱۔ شفاء، الہیات، مقالہ دہم، فصل پنجم، ص۵۶۴۔

کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد جانشین کی خصوصیات کو مکرر اور واضح طور بیان فرمایا ہے اور دوسرے الفاظ میں رہبری اور قیادت کے مسئلہ میں ''تنصیص'' کے طریقے کا انتخاب فرمایا ہے نہ لوگوں کے ذریعہ انتخاب کے طریقے کا۔ اس بات کے ثبوت میں درج ذیل امور قابل ذکر ہیں:

۱۔ یوم الدار (دعوت ذی العشیرہ):

آغاز بعثت سے تین سال گزرنے کے بعد، خداوند متعال نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم فرمایا کہ اپنی دعوت کو کھل کر بیان کریں اور اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (شعراء/۲۱۴)

''اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی ہاشم کے بزرگوں کو جمع کیا اور فرمایا:

''میں آپ لوگوں کے لئے دنیا و آخرت کی خیر و نیکی لایا ہوں۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دوں۔ آپ میں سے کون ہے جو اس دین کی اشاعت میں میری مدد کرے تاکہ میں اُسے آپ لوگوں کے درمیان اپنا بھائی، وصی اور جانشین مقرر کروں؟''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جملے کو تین بار دہرایا اور ہر بار فقط حضرت علی علیہ السلام نے اُٹھ کر آمادگی کا اعلان کیا۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انّ هٰذا أخي ووصيّي وخليفتي فيكم

''بیشک یہ تم لوگوں میں میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہے۔''(۱)

۱۔ مسند احمد، تاریخ طبری: ۲/۶۲ ۲۰ تفسیر طبری (جامع البیان)، ۱۹/۷۴-۷۵ تفسیر سورہ شعراء، آیہ ۲۱۴۔

۲۔ حدیث منزلت:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی موقوں پر بیان فرمایاہے کہ حضرت علی علیہ السلام کامقام ورتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت وہی ہے جوحضرت ہارون علیہ السلام کاحضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت تھا،صرف اس فرق کے ساتھ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعدکوئی نبی نہیں ہوگا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں-جوتواتر کے قریب ہے-فرمایا:

یا علی انت منّی بمنزلت هارون من موسیٰ الّا انّه لانبیّ بعدی(۱)

نص قرآن کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حضرت ہارون علیہ السلام نبوت (۲)،خلافت (۳) اور وزارت (۴) کے مرتبہ پر فائز تھےاورحدیث منزلت سے حضرت ہارون علیہ السلام کے-مقام نبوت کے سوا-تمام مقامات ورتبے حضرت علی علیہ السلام کے لئے ثابت ہوتے ہیں۔بالکل واضح ہے کہ اگراس حدیث میں مقصد،نبوت کے سوا تمام مقامات کاثبوت نہ ہوتاتونبوت کے استثناءکی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

۱۔(صحیح بخاری :۶/۳،طبع ۱۳۱۴،باب غزوہ تبوک،صحیح مسلم:۷/۱۲۰،درباب فضائل علیعلیہ السلام،سنن ابی ماجہ:۱/۵۵،باب فضائل اصحاب النبی ،مسندامام احمد:۱/۱۷۳،۱۷۵،۱۷۷،۱۷۹،۱۸۲،و۲۳۰،سیرہ نبویہ،ابن ھشام:۴/۱۶۳،غزوہ تبوک)

۲۔﴿ووهبناله من رحمتنااخاه هارون نبیا﴾مریم/۵۳

۳۔﴿واذقال موسی لأخیه هارون اخلفنی فی قومی ...﴾اعراف/۱۴۲۔

۴۔﴿واجعل لی وزیراً من اهلی﴾(طٰہٰ/۲۹)

۳۔حدیث سفینہ:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت کو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی سے تشبیہ دیدی ہے کہ جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے (اس میں سوار ہونے میں) مخالفت کی وہ غرق ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ألاإنّ مثل اهل بيتي فيكم مثل سفينة نوح في قومه من ركبها نجىٰ ومن تخلّف عنهاغرق(۱)

ہم جانتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی انسان کو طوفان سے نجات دلانے کی تنہا پناہ گاہ تھی۔اس لئے حدیث سفینہ کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت بھی امت کو انحراف وگمراہی کے باعث بننے والے ناگوار حوادث سے نجات دلانے کا تنہا وسیلہ ہیں۔

۴۔حدیث امانِ امت:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت علیہ السلام کا تعارف، امت میں اتحاد واتفاق ایجاد کرنے اور امت سے اختلافات کو دور کرنے والوں کی حیثیت سے فرمایا ہے۔اور فرماتے ہیں:

النجّوم امان لاهل الارض من الغرق واهل بيتي امانٌ لامتّي من الاختلاف،فاذاخالفتها قبيلة من العرب اختلفوا فصاروا حزب ابليس(۲).

”جس طرح ستارے اہل زمین کے لئے سمندر میں غرق ہونے سے

۱۔مستدرک حاکم، ۳/۳۵۱، الصواعق المحرقۃ، ص۹۱، میزان الاعتدال، ۱/۲۲۴، تاریخ الخلفاء، ص۵۷۳، الخصائص الکبری، ۲/۲۶۶، ینابیع المودۃ، ص۲۸، فتح القدیر، ص۱۱۳ اور دیگر کتب۔

۲۔مستدرک حاکم، ۳/۱۴۹۔

بچانے کا سبب اور وسیلہ ہیں (چونکہ سورہ نحل کی ۱۶ ویں آیت: وبالنجم ھم یھتدون کے مطابق جہاز ران ستاروں کی مدد سے سمندر کی امواج میں سے راستہ پیدا کر کے ساحل تک پہنچ جاتے ہیں) اسی طرح میرے اہل بیت علیہم السلام بھی میری امت کو تفرقہ اور اختلاف سے نجات دلانے کا وسیلہ ہیں۔ اگر عربوں کا کوئی گروہ ان کی مخالفت کرے تو وہ اختلافات سے دوچار ہو کر شیطان کا گروہ شمار ہوگا۔'

۵۔ حدیث ثقلین:

حدیث ثقلین، متواتر اسلامی احادیث میں سے ہے جس کو شیعہ و سنی علمائے حدیث کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حدیث میں امت اسلامیہ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

إنّی تارک فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ وعترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلّوا ابدا وانّھما لن یفترقا حتیٰ یردا علیّ الحوض(۱)

''میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا تا ہوں۔ کتاب خدا اور میری عترت، اہلبیت علیہم السلام۔ اگر تم انھیں اختیار کئے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں۔''

یہ حدیث قرآن مجید کے دوش بدوش اہل بیت علیہم السلام کی علمی مرجعیت کو واضح طور ثابت کرتی ہے اور مسلمانوں کے لئے اس امر کو ضروری قرار دیتی ہے کہ کتاب خدا کے ساتھ ساتھ

۱۔ صحیح مسلم: ۱۲۲/۷، سنن ترمذی: ۳۰۷/۲، سنن دارمی: ۴۳۲/۲، مسند احمد: ۱۴/۳، ۱۷، ۲۶ و ۵۹/۴، ۳۶۶ و ۳۷۱، ۱۸۲/۵ اور ۱۸۹، خصائص علویہ، نسائی ص ۲۰، مستدرک حاکم: ۱۰۹/۳، ۱۴۸ و ۵۳۳ اور دیگر کتب۔ ضمناً اس بارے میں نشریات دار التقریب بین المذاہب اسلامیہ (قاہرہ، مطبعہ مخیمر) کے مجلّہ ''حدیث ثقلین'' کی طرف بھی رجوع کیا جاسکتا ہے)

اہل بیت علیہم السلام کی رہبری کی طرف بھی رجوع کریں۔لیکن افسوس کا مقام ہے کہ کچھ لوگ در اہل بیت علیہم السلام کے علاوے ہر دروازے پر دستک دیتے ہیں۔حدیث ثقلین،جس کے بارے میں شیعہ و سنی متفق ہیں،دنیا کے تمام مسلمانوں کو امت واحدہ کے طور پر آپس میں جمع کرسکتی ہے۔کیونکہ حدیث ثقلین کے مطابق اہلبیت علیہم السلام کی علمی مرجعیت پر سب کا اتفاق ہے۔امت اسلامیہ کو چاہئے تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت کے سیاسی قائد کے انتخاب کے سلسلے میں تفرقہ واختلاف کے بجاے اہل بیت علیہم السلام کی علمی مرجعیت کی طرف رجوع کرکے اتحاد واتفاق کی فضا قائم کرتی۔

اصولی طور پر خلفاء کی خلافت کے زمانے میں بھی علمی مرجعیت عملاً حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں تھی اور شرعی مسائل واختلافات،حضرت علی علیہ السلام کے ذریعہ ہی حل ہوتے تھے۔حقیقت میں جس دن اہل بیت علیہم السلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امت کی قیادت سے علیحدہ کیا گیا،اسی دن سے فرقہ گرائی بھی شروع ہوئی اور ایک کے بعد ایک کلامی فرقے وجود میں آتے گئے۔

۸۷ویں اصل:

مذکورہ احادیث کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض اوقات عمومی اور بعضے خصوصی طور واضح انداز میں اپنے جانشین کا تعارف کرایا ہے اور یہ احادیث آگاہ اور حقیقت پسند لوگوں کے لئے اتمام حجت ہیں۔اس کے باوجود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس پیغام کو دور ونزدیک رہنے والے تمام مسلمانوں تک پہنچانے اور اس سلسلے میں ہر قسم کے شک وشبہہ کو دور کرنے کے لئے ایک اور تاریخی اقدام کیا،کہ حجۃ الوداع سے واپسی کے دوران سرزمین غدیر خم میں قیام کرکے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ''خدا کی طرف سے مجھے حکم ہوا ہے

کہ ایک پیغام کو آپ لوگوں تک پہنچادوں۔" یہ الٰہی پیغام اتنا اہم اور عظیم فریضہ تھا کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے انجام نہ دیتے تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رسالت کی ذمہ داری کو بھی نہیں نبھایا۔فرمان الٰہی یوں تھا:

﴿یاأَیُّهَاالرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ اُنزِلَ إِلَیْکَ مِن رَّبِّکَ وَإِن لَّم تَفعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاس﴾ (مائدہ/۶۷)

"اے پیغمبر آپ اس حکم کو پہنچادیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو گویا اس کی رسالت کو نہیں پہنچایا اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"(۱)

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایک ممبر کا اہتمام کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر جلوہ افروز ہوئے اور لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا:

"میں عنقریب دعوتِ حق کو لبیک کہنے والا ہوں۔تم لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

جواب میں لوگوں نے کہا:

"ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین خدا کو ہم تک پہنچادیا،ہمارے لئے خیرخواہی کی اور کافی تکلیفیں اٹھائیں،خدا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جزائے نیک عطا کرے۔"

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"کیا خدا کی وحدانیت،میری پیغمبری اور روز محشر کی حقیقت پر شہادت دیتے ہو؟"

۱۔محدثین اور مفسرین نے اس آیہ شریفہ کے حجۃ الوداع اور روز غدیر نازل ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔غور کیجئے کتاب"الدر المنثور"سیوطی،۲/۲۹۸، فتح القدیر شوکانی ۲/۵۷، کشف الغمہ اربلی ص۹۴، ینابیع المودۃ قندوزی،ص ۱۲۰،المنار،۶/۴۶۳وغیرہ۔

سب لوگوں نے مثبت جواب دیا۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں تم لوگوں سے پہلے حوض کوثر پر پہنچ جاؤنگا، دیکھتا ہوں کہ میرے دوگرانقدر جانشینوں کے ساتھ تم لوگ کیسا برتاؤ کرتے ہو؟''

کسی نے سوال کیا:

''دوگرانقدر جانشینوں سے مراد کون ہیں؟''

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا:

''ایک کتاب خدا اور دوسرے میری عترت واہل بیت علیہم السلام ہیں۔اور خدائے لطیف وخبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ قیامت کے دن حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے۔ان دونوں پر برتری اوران سے دوری اختیار کرنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ اس طرح ہلاک ہوجاؤ گے۔''

اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو اٹھا کر اس قدر بلند کیا کہ تمام لوگوں نے آپ دونوں کو دیکھ لیا۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ایھاالناس من اولی الناس بالمؤمنین من انفسھم؟''

''ای لوگو کون مؤمنین پر خود ان سے زیادہ صاحب اختیار ہے۔''

لوگوں نے جواب دیا:

''خداوند متعال اور اس کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔''

پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اِنّ اللہ مولایَ وانامولی المؤمنین وانااولیٰ بھم من انفسھم''

'' خداوند متعال میرا مولا ہے اور میں مؤمنین کا مولا ہوں اور مؤمنین پر انکے نفوس سے زیادہ صاحب اختیار ہوں۔''

اس کے بعد تین بار تکرار کر کے یہ جملہ فرمایا:

فمن کنت مولاه فعليٌّ مولاه

''جس جس کا میں مولا ہوں اس کے علی علیہ السلام بھی مولا ہیں۔''

اس کے بعد اس جملے کا اضافہ فرمایا:

اللّٰهم والِ من والاه وعاد من عاداه وأحبَّ من احبّه وأبغض من ابغضه وانصر من نصره واخذل من خذله،وأدر الحقّ معه حيث دار،الا فليبلّغ الشاهدالغائبَ۔

''خداوندا تو دوست رکھ اسے جو علی (علیہ السلام) کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو علی (علیہ السلام) سے دشمنی کرے اور محبت کر اس سے جو علی (علیہ السلام) سے محبت کرے اور غضب کر اُس پر جو ان پر غضب کرے، مدد کر اس کی جو علی (علیہ السلام) کی مدد کرے، ذلیل کر اسے جو اُن کو ذلیل کرے اور حق کو ہمیشہ اس (علیہ السلام) کے ساتھ قرار دے۔ آگاہ ہو کہ حاضر افراد کا فریضہ ہے کہ وہ غیر حاضر لوگوں تک میری یہ بات پہنچا دیں۔''

۸۸ ویں اصل:

حدیث غدیر متواتر احادیث میں سے ہے اور اس حدیث کے راویوں -جن میں صحابہ، تابعین اور دیگر اسلامی محدثین شامل ہیں- نے اسے ہر صدی میں تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس طرح ۱۱۰ صحابہ، ۸۹ تابعین اور ۳۵۰۰ دیگر علماء و اسلامی محدثین نے حدیث غدیر کو نقل کیا ہے۔ اس تواتر کے پیش نظر اس حدیث کی اصالت اور اعتبار پر کسی قسم کا شک و شبہہ ممکن نہیں۔ اسی طرح کئی علماء نے حدیث غدیر پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں جامع و کامل ترین

کتاب، جسمیں اس حدیث کے تمام اسناد کو جمع کیا گیا ہے۔علامہ عبدالحسین امینی (۱۳۲۰-۱۳۹۰) کی کتاب ''الغدیر'' ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کے مولا ہونے کا مقصد کیا ہے؟ بہت سے قرائن اس امر کی طرف دلالت کرتے ہیں کہ اس تعبیر کا مقصد امت کی قیادت ورہبری ہے۔ہم ان قرائن میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

الف۔غدیر کے واقعہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زائرین بیت اللہ کے کاروان کو شدید گرمی کے دنوں میں دوپہر کے وقت ایک بنجر اور بے آب وگیاہ سرزمین پر ٹھہرنے کا حکم فرمایا۔گرمی کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے اپنی عبا کے آدھے حصے کو اپنے سروں پر اوڑھ لیا تھا اور باقی آدھے حصہ کو اپنے نیچے فرش کے طور بچھایا تھا۔قدرتی بات ہے کہ اس تمہید واہتمام کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی ایسا کلام فرمانا ہوگا جو امت کی ہدایت میں کلیدی اہمیت کا حامل اور تقدیر ساز ہو۔حقیقت میں مسلمانوں کے لئے جانشین کے تقرر۔جو مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد اور ان کا حافظ ہو۔کے علاوہ کونسی چیز کلیدی اور تقدیر ساز ہوسکتی تھی؟

ب۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان کرنے سے پہلے اسلام کے تین بنیادی اصولوں۔توحید، نبوت اور معاد۔کا ذکر فرمایا اور لوگوں سے اس سلسلے میں اقرار بھی لیا، پھر اس پیغام الٰہی کو پہنچایا۔اس پیغام کے اصول دین کے اقرار سے متصل ہونے سے اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔صاف ظاہر ہے کہ اس عظیم اور غیر معمولی اجتماع کا مقصد کسی خاص شخصیت کی دوستی کے اعلان جیسا ایک عادی ومعمولی مسئلہ نہیں ہوسکتا۔

ج۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبے کے شروع میں اپنی قریب الوقوع رحلت کی خبر دی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد اپنی امت کے بارے میں فکرمند تھے۔لہٰذا اس سے کیا بہتر اور ضروری بات ہوسکتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نازک موقع پر آئندہ کے لئے کوئی چارہ جوئی کرتے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کا دین، آنیوالے حوادث کے طوفانوں کے خطرے میں نہ پڑے۔

د۔الٰہی پیغام کو بیان فرمانے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مولویت واولویت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''خداوندمتعال میرا مولا ہے اور میں مؤمنین کا مولا ہوں اوران کے بارے میں ان کے اپنے نفوس سے زیادہ صاحب اختیار ہوں۔''

ان مطلب کا بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ علی علیہ السلام کا ''مولا ہونا'' پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مولا واولی بالتصرف ہونے ہی جیسا ہے۔اورآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم خدا سے ہی مذکورہ امر یعنی حضرت علی علیہ السلام کے اولی ومولا ہونے کو ثابت کیا ہے۔

ھ۔پیغام الٰہی کو پہنچانے کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین سے چاہا کہ اس خبر کو غیر حاضر افراد تک پہنچائیں۔

۸۹ویں اصل:

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی الٰہی دعوت کو نابود کرنے کے لئے مختلف طریقوں سے-آپ پر سحر وجادو کی تہمت لگانے سے بستر خواب پر قتل کرنے کے منصوبے تک-سازشوں پر سازشیں کرتے رہے۔لیکن ان تمام موقوں پر خداوندمتعال کی مدد آپ کے شامل حال رہی اوراس نے مشرکوں کی منحوس سازشوں کے مقابلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت فرمائی۔دشمنوں کی آخری اُمید اس پر متمرکز تھی کہ (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی بیٹا نہیں ہے) آپ کی رحلت کے بعد یہ الٰہی دعوت خود بخود ختم ہوجائے گی:

﴿أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ﴾ (طور/۳۰)

''کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں حوادث زمانہ (موت) کا انتظار کر رہے ہیں۔''

یہ تصور بہت سے مشرکین و منافقین کے ذہن میں تھا۔ لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک باصلاحیت شخص۔ جس نے اپنی پوری زندگی میں اسلام کی نسبت اپنے مخلصانہ ایمان واستقامت کا ثبوت پیش کیا تھا۔ کو اپنے جانشین کی حیثیت سے مقرر فرما کر مخالفوں کی اُمیدوں کو یأس و نااُمیدی میں بدل ڈالا۔ اس طرح دین کی بقا کو ضمانت بخشی اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور اسلام کی نعمت اس قائد کی تنصیب سے کمال کو پہنچی۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام کے جانشین پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہونے کے بعد غدیر خم کے دن آیۂ ''اکمال دین'' نازل ہوئی:

﴿اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾(۱) (مائدہ/۳)

''آج کفار تمہارے دین سے مایوس ہوگئے۔ لہٰذا اب تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا ہے

۱۔ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے مذکورہ آیت کو واقعہ غدیر سے مربوط جانا ہے، جیسے ابو سعید خدری، زید بن ارقم، جابر بن عبد اللہ انصاری، ابو ہریرہ و مجاہد مکی۔ مذکورہ افراد کی روایات کے بارے میں مزید آگاہی کے لئے درج ذیل منابع کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

ابو جعفر طبری نے کتاب ''الولایہ''، حافظ ابن مردویہ اصفہان نے ابن کثیر کی تفسیر کی ج ۲ سے نقل کرتے ہوئے، ابو نعیم اصفہانی نے کتاب ''ما نزل من القران فی علی''، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ ج۸، حافظ ابو سعید بجستانی نے کتاب ''الولایہ''، حافظ ابو القاسم حسکانی، ابن عساکر شافعی سیوطی نے الدر المنثور ۲/۲۹۵ سے نقل کرتے ہوئے خطیب خوارزمی نے کتاب ''مناقب'' میں جن کی عبارتوں کو ''الغدیر'' ۱/۲۳۲-۲۳۶ میں نقل کیا گیا ہے۔

اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کردیا ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ بنادیا ہے۔"(۱)

مذکورہ متواتر روایتوں کے علاوہ۔۔جن سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کا مسئلہ ایک الٰہی مسئلہ ہے اور اسمیں لوگوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔تاریخی واقعات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدائی ایام میں، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں تشریف فرما تھے اور ابھی مدینہ میں کسی قسم کی حکومت تشکیل نہیں پائی تھی، جانشینی کے مسئلہ کو ایک الٰہی مسئلہ کے طور پر پیش کیا تھا۔مثال کے طور پر جب قبیلہء بنی عامر کے سردار نے موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر کہا:"چونکہ ہم نے آپ کی بیعت کی اور آپ اپنے مخالفوں پر فتحیاب ہوئے،تو کیا امر رہبری میں ہمارے نصیب میں کوئی فائدہ ہے؟"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا:"یہ کام خدا سے مربوط ہے،وہ جیسے چاہے گا اس کام کے لئے انتخاب کرے گا۔

"الامر الی اللہ یضعہ حیث یشاء."(۲)

ظاہر ہے کہ اگر مسئلہء رہبری لوگوں کے انتخاب پر منحصر ہوتا تو اس طرح فرمانا چاہئے تھا:

"الا مرالی الامۃ" یا"الیٰ اھل الحل والعقد"

۱۔فخر رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس آیت کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ۸۱ یا ۸۲ دن سے زیادہ زندہ نہ رہے اور اس کے بعد کسی قسم کی نسخ یا تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔اس لحاظ سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ یہ آیت غدیر کے دن نازل ہوئی ہے جو ۱۸ ذی الحجہ سال حجۃ الوداع کی تاریخ تھی چونکہ اہل تسنن کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۲ ربیع الاول کو رحلت فرمائی۔اگر تینوں مہینے ۲۹ دن کے حساب کئے جائیں تو وہی ۸۲ دن ہوتے ہیں (تفسیر فخر رازی ۳/۳۶۹)

۲۔سیرہ ء ابن ھشام ۲/۴۲۲۔

یہاں پر رسالت کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کلام خدا کے کلام کے مانند ہے، جیسا کہ خداوند کریم فرماتا ہے:

﴿اللّٰہُ أَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہُ﴾ (انعام/۱۲۴)

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں رکھے گا۔''

۹۰ ویں اصل:

منصب خلافت کی تنصیص اور جانشینی پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعیین میں امت کا عمل دخل نہ ہونے کا تصور، صحابہ کے ذہن میں بھی موجود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ بھی خلیفہ اول کے علاوہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جانب سے تنصیص کے بجائے گزشتہ خلیفہ کی طرف سے بعد کے خلیفہ کی تنصیص پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ تاریخوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خلیفہ دوم کی تعیین خلیفہ اول کے ذریعہ انجام پائی۔

یہ تصور، نص تاریخ کے خلاف ہے کہ خلیفہء دوم کا قطعی تعیین ابوبکر کے ذریعہ انجام نہیں پایا تھا بلکہ اس تعیین میں تجویز کا پہلو تھا۔ اس لئے کہ ابھی خلیفہء اول زندہ تھے کہ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے اعتراض ہوا، اور اعتراض کرنے والوں میں سے ایک زبیر تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تعیین صرف ایک تجویز ہوتی تو اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے اعتراض کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ابوبکر کے ذریعہ عمر کی تقرری کے علاوہ تیسرے خلیفہ کا انتخاب بھی دوسرے خلیفہ کی معین کردہ چھ رکنی شوریٰ کے ذریعہ انجام پایا اور یہ کام بھی ایک طرح سے خلیفہ کا تعیّن تھا جو عام لوگوں کے ساتھ صلاح ومشورہ کرنے میں رکاوٹ بن گیا۔

اصولی طور پر صحابہء رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذہن میں یہ تصور تھا ہی نہیں کہ خلیفہ کے انتخاب کے سلسلے میں رائے عامہ سے رجوع کیا جائے۔ بلکہ وہ اس بات کے معتقد تھے کہ اگلے خلیفہ کا تعیّن سابقہ خلیفہ کرے۔ جو کچھ اس سلسلے میں بعد میں دعویٰ کیا گیا ہے، یہ بعد کے

لوگوں کی توجیہات ہیں۔مثال کے طور پر جب خلیفہ دوم مجروح ہوئے،تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ عائشہ نے،خلیفہ کے بیٹے عبداللہ ابن عمر کے ذریعہ انھیں پیغام بھیجا اور کہا:

''اپنے باپ کو میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ امت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلا چرواہے کے نہ چھوڑنا۔''(۱)

عبداللہ ابن عمر نے بھی،بستر علالت پر اپنے باپ سے خلیفہ کی تعیین کے لئے کہا اور کہا کہ:

''لوگ آپ کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ آپ کسی کو اپنے جانشین کے طور پر معین نہیں کریں گے۔اگر آپ کے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کا چرواہا انھیں بیابان میں یوں ہی چھوڑ کر چلا جائے اور اپنی جگہ پر کسی اور کو معین نہ کرے تو،کیا آپ اس کی سرزنش نہیں کریں گے؟لوگوں کے حالات کا خیال رکھنا یہ مسئلہ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں سے،کہیں زیادہ اہم ہے۔''(۲)

۹۱ویں اصل:

بحث امامت کی ابتداء میں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق امام اور خلیفہ وہ شخص ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض (شریعت لانے کے علاوہ) نبھاتا ہے۔ذیل میں ہم ان فرائض میں سے چند اہم فریضوں کی طرف اشارہ کرتے

۱۔الامامۃ والسیاسۃ:۱/۳۲۔

۲۔حلیۃ الاولیاء:۱/۴۴۔

ہیں تا کہ امامت کا مقام اور اس کی اہمیت واضح ہو جائے:

الف۔ قرآن کریم کے مفاہیم کا بیان اور اس کی پیچیدگیوں کو حل کرنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض میں سے تھا۔ قرآن فرماتا ہے:

﴿وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (نحل/۴۴)

''اور آپ کی طرف ہم نے ذکر کو (قرآن) نازل کیا ہے تا کہ لوگوں کے لئے ان احکام کو واضح کر دیں جو ان کی طرف نازل کئے گئے ہیں۔''

ب۔ شرعی احکام کا بیان، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیگر فرائض میں سے ایک تھا۔ ان میں سے بعض کو آیات قرآنی کی تلاوت سے اور بعض کو سنت کے ذریعہ بیان فرماتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احکام کو زمانہ کے حوادث کے مطابق تدریجاً بیان فرماتے تھے، اور طبیعت امر کا تقاضا تھا کہ یہ فریضہ جاری رہے۔ حالانکہ احکام کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل شدہ احادیث جو ہم تک پہنچی ہیں پانچ سو سے زائد نہیں ہیں(۱)۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ فقہ کے موضوع پر احادیث کی یہ تعداد قانون سازی کے قلمرو میں امت اسلامیہ کو خود کفیل نہیں کر سکتی ہے۔

ج۔ چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محور حق تھے اور امت میں عقائد کے سلسلے میں ہر قسم کے انحرافات کو اپنی توجیہات اور بروقت اقدام سے روکتے تھے۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود کی وجہ سے امت کے اندر تفرقہ وتشطط پیدا نہ ہوا۔

د۔ دینی اور اعتقادی مسائل کا جواب دینا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور ذمہ داری تھی۔

ھ۔ گفتار و رفتار کے ذریعہ معاشرے کے لوگوں کی تربیت کرنا۔

و۔ اسلامی معاشرے میں عدل وانصاف اور امن وامان برقرار رکھنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض میں سے تھا۔

۱۔ الوحی المحمد: ص ۲۱۲، طبع ششم۔

ز۔ دشمنوں کے مقابلے میں اسلامی سرحدوں اور اثاثوں کی حفاظت کرنا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرائض میں شمار ہوتا تھا۔ موخرالذکر دو ذمہ داریوں کو ممکن ہے لوگوں کے منتخبہ رہبر بھی انجام دے سکیں، لیکن اس سے پہلے والی ذمہ داریوں (مفاھیم قرآن کا بیان، قرآن کے پیچیدہ مفاہیم کا حل اور احکام شرع کا بیان۔۔۔) کو نبھانے کے لئے ایک ایسے آگاہ اور طاقتور رہبر کی ضرورت ہے جس پر خداوند کریم کی خاص نظر عنایت ہو اور جو علم و عمل میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جیسا ہو، یعنی وہ علوم نبوی کا جاننے والا اور ہر طرح کے سہو و خطا و نسیان سے مبرّا و پاک ہونا چاہئے تا کہ معاشرے کی مذکورہ عظیم ذمہ داریوں کو عملی جامہ پہنا سکے اور نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلاء کو پوری تاریخ اسلام کے نشیب و فراز کے دوران پر کر سکے۔ ایسا شخص اگر چہ علوم نبوی کا حامل ہوگا لیکن نہ پیغمبر ہوگا اور نہ کسی شریعت کی بنیاد رکھنے والا ہوگا۔ مزید یہ کہ منصب امامت اور منصب نبوت یکساں نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی شخصیت کا تعیّن، جو علم و دانش میں عام لوگوں سے بالاتر ہو، صرف حکم الٰہی کے تحت اور پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہے کہ مذکورہ اغراض و مقاصد کی تعمیل کا دارومدار بھی اس بات پر ہے کہ لوگ پیغمبر کی طرف سے معین شدہ جانشین و رہبر کی حمایت و اطاعت کریں، چونکہ تعیین الٰہی اور اعلان پیغمبر، مذکورہ اغراض کی تکمیل کے لئے شرط کافی نہیں ہے کہ (لا رأی لمن لا یطاع) چنانچہ قرآن و پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سلسلے میں بھی قضیہ ایسا ہی تھا اور ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت کے بعد منفی واقعات اور مسلمانوں میں تفرقہ کا وجود میں آنا، اسلئے نہیں تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے (نعوذ باللہ) اپنے حکیمانہ فریضہ پر عمل نہیں کیا تھا اور اپنے بعد امت کی باگ ڈور سنبھالنے کیلئے کوئی بنیادی منصوبہ نہیں بنایا تھا، یا آپ کا منصوبہ ناقص تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ امت کے بعض افراد نے اپنی رائے اور نظریہ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رائے اور نظریہ پر مقدم قرار دیکر اپنی ذاتی مصلحت اندیشی کو خدا اور رسول خدا

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص پر ترجیح دیدی، اور یہ صرف ایک حادثہ نہیں ہے جو تاریخ اسلام میں رونما ہوا۔ بلکہ تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے حوادث پیش آئے ہیں۔(۱)

۹۲ ویں اصل:

ہم نے گزشتہ اصل میں بیان کیا ہے کہ امام ایک معمولی رہبر ہی نہیں ہوتا کہ اس کی ذمہ داری فقط حکومت کا نظم ونسق اور سرحدوں کی حفاظت کرنا ہو، بلکہ اس کے ذمہ اس کے علاوہ اور بھی فرائض ہوتے ہیں جن کے بارے میں پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے اس خطیر ذمہ داری۔ جیسے تفسیر قرآن، احکام کا بیان، لوگوں کے عقائد سے متعلق سوالات کا جواب، عقیدہ وشریعت میں ہر قسم کے انحرافات کو روکنا۔ کی شرط یہ ہے کہ امام وسیع اور نا قابل خطا علم کا حامل یعنی معصوم ہو۔ اگر عام لوگ اس قسم کی ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لے لیں تو خطا وغلطی سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

البتہ عصمت، نبوت کے مساوی نہیں ہے۔ ممکن ہے ایک انسان اشتباہ اور خطا سے معصوم ومحفوظ ہو لیکن نبی نہ ہو، اس کی واضح مثال حضرت مریم عذرا علیہ السلام کی ذات ہے کہ پیغمبروں کی عصمت کی بحث میں ان کی عصمت کے دلائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔(۲)

مذکورہ عقلی تجزیہ کے علاوہ عصمتِ امامت کے سلسلے میں کچھ اور امور دلالت کرتے ہیں، ان میں سے چند کی طرف ہم یہاں پر اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ اہل بیت علیہم السلام کو ہر قسم کے رجس وناپاکی سے پاک کرنے کا خداوند کریم کا نا قابل تنسیخ ارادہ۔ جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (احزاب/۳۳)

۱۔ سید عبد الحسین شرف الدین عاملی کی کتاب النص والاجتہاد ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ الالٰھیات، از مؤلف ۲/۱۳۶-۱۹۸ ملاحظہ فرمائیں)

''بس اللہ کا ارادہ ہے، اے اہل بیت علیہم السلام کہ تم سے ہر برائی
کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے۔''

اہل بیت علیہم السلام کی عصمت پر اس آیت کی دلالت اس طرح ہے کہ: خداوند عالم کی مشیت خاص یہ ہے کہ وہ اہل بیت کو ہر طرح کی پلیدی، برائی اور گناہ سے محفوظ رکھے جو ان حضرات کی عصمت کے مساوی ہے۔ کیونکہ آیہء شریفہ میں ''رجس'' سے مراد ہر قسم کی یعنی فکر، روح و کردار کی برائی ہے جس کا اہم مصداق گناہ ہے اور چونکہ اس ارادے کا تعلق چند خاص افراد سے ہے نہ عام لوگوں سے، لہٰذا قدرتی طور تطہیر کے اس ارادے سے مختلف ہے جس کا تعلق عام مسلمانوں سے ہے۔ عام لوگوں سے تعلق رکھنے والی تطہیر، ایک تشریعی ارادہ ہے (سورہء مائدہ ۶ میں آیہء وضو کے ذیل میں آیا ہے "ولاکن یرید لیطھرکم")۔ ممکن ہے افراد کی نافرمانی کی وجہ سے یہ تطہیر محقق نہ ہو سکے۔ جبکہ مذکورہ ارادہ ایک تکوینی ارادہ ہے جو اپنے مراد (گناہ سے پاکیزگی) سے کبھی جدا نہیں ہوگا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ عصمت اہل بیت علیہم السلام کے سلسلے میں، اللہ کا تکوینی ارادہ، ان سے اختیار کو سلب نہیں کرتا ہے، اس طرح جیسے پیغمبروں کی عصمت بھی ان سے اختیار کو سلب نہیں کرتی ہے۔ (اس مطلب کی تفصیل عقائد کی کتابوں میں آئی ہے۔)

۲۔ حدیث ثقلین میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''انّی تارک فیکن الثقلین، کتاب اللہ وعترتی''

اس حدیث کی رو سے اہل بیت علیہم السلام قرآن مجید کے ہم ردیف واقع ہوئے ہیں، یعنی جس طرح قرآن ہر قسم کی خطاء واشتباہ سے محفوظ ہے۔ اسی طرح اہل بیت علیہم السلام بھی ہر قسم کی فکری وعلمی خطا سے محفوظ ہیں۔

اور یہ مطلب اس حدیث کے درج ذیل ضمیمہ سے واضح ہوتا ہے:

الف: ما إن تمسکتم بھمالن تضلّو أبداً

جب تک ان دونوں کو پکڑے رہو گے، ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔

ب:انّھمالن یفترقا حتیٰ یراد اعلیّ الحوض

میری یہ دونوں یادگاریں ایک دوسرے سے جدانہیں ہونگی، یہاں تک کہ قیامت کے دن حوض کوثر کے کنارے پر میرے پاس پہنچ جائیں۔

بیشک اہل بیت علیہم السلام سے تمسک ہدایت کا سبب ہے اور گمراہی وضلالت سے نجات کا ذریعہ۔چونکہ اہل بیت علیہم السلام ہرگز قرآن سے جدانہیں ہوں گے،اس لئے ہر قسم کی خطاوگناہ سے محفوظ ہیں۔

۳۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت علیہم السلام کوحضرت نوح کی کشتی سے تشبیہ دی ہے، جوکوئی اس میں سوار ہوا اس نے طوفان کی لہروں سے نجات پائی اور جس نے اس میں سوار ہونے سے انکار کیا،وہ طوفان کی لہروں میں غرق ہوگیا۔جیسا کہ فرمایا:

انّما مثل اھل بیتی فی امتی کسفینة نوح من رکبھا نجیٰ ومن تخلف عنھاغرق.(۱)

ان مختصر دلائل کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کی عصمت دلیل وبرہان پر مبنی ایک واضح امر ہے۔البتہ عصمت سے متعلق منقول دلائل ہمارے مذکورہ بیان تک ہی محدود نہیں ہیں۔

۹۳ ویں اصل: بارہ امام

امام کی پہچان دوطریقوں سے ممکن ہے:

الف۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے حکم سے کسی خاص شخص کی امامت کے بارے میں صراحت کے ساتھ بیان فرمائے۔

۱۔مستدرک حاکم:۲/۱۵۱،خصائص کبریٰ،سیوطی۲/۲۶۶)

ب۔سابقہ امام اپنے بعد آنیوالے امام کے بارے میں وضاحت فرمائے۔

شیعوں کے بارہ اماموں کی امامت مذکورہ دونوں طریقوں سے ثابت ہوئی ہے۔روایات کے مطابق یعنی پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کی امامت کے بارے میں صراحت سے بیان فرمایاہے اور ہرامام نے اپنے بعد آنیوالے امام کاتعارف بھی کرایا ہے۔

اس سلسلے میں اختصار سے کام لیتے ہوئے ہم صرف ایک حدیث کے ذکر پراکتفا کرتے ہیں۔(۱)

پیغمبرخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف علی کوبطور امام نصب کرنے پراکتفا نہیں کی ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذکرفرمایاہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بارہ امام آئیں گے،جن کے ذریعہ دین اسلام کوعزت ملے گی۔جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لایزال الدین منیعاًالی اثنی عشر خلیفة

''دین بارہ خلفاء کے ذریعہ محفوظ رہے گا۔''

دوسری جگہ فرمایاہے:

لایزال السلام عزیزاًالی اثنی عشرخلیفة

''بارہ خلفاء کے ذریعہ اسلام مقتدرومضبوط ہوگا''

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بارہ خلفاء کے وجود کے بارے میں دلالت کرنے والی حدیثیں اہل سنت کی معتبرترین صحاح میں بھی ذکرہوئی ہیں۔(۲)

۱۔باقی تمام احادیث سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے احادیث کی کتابوں،جیسے اصول کافی کفایة الاثر،اثبات الھداة،منتخب الاثروغیرہ کی طرف رجوع کیا جاسکتاہے۔

۲۔صحیح بخاری،۸۱/۹،باب الاستخلاف صحیح مسلم،۳/۶کتاب الامارہ،مسند احمد،۱۰۸،۵۶/۵،مستدرک حاکم:۱۸/۳۔۔۔)

حقیقت میں یہ بارہ خلیفہ، جن کے وجود کے سبب عزت اسلام محفوظ ہے، شیعوں کے ۱۲ اماموں کے علاوہ کسی اور سے مطابقت نہیں رکھتے۔ چونکہ نہ اموی خلفاء دین کی عزت کا سبب تھے اور نہ عباسی خلفاء اور نہ یہ عدد ہی ان پر مطابقت کرتا ہے۔

شیعوں کے بارہ امام حسب ذیل ہیں:

۱۔ امیر المؤمنین حضرت امام علی ابن ابیطالب علیہ السلام۔
(ولادت: بعثت سے دس سال پہلے۔ شہادت: ۴۰ھ۔ مدفن: نجف اشرف، عراق)

۲۔ حضرت امام حسن ابن علی علیہ السلام، ملقب بہ مجتبیٰ علیہ السلام۔
(ولادت: ۳ھ۔ شہادت: ۵۰ھ مدفن: مدینہ منورہ، قبرستان بقیع)

۳۔ حضرت امام حسین ابن علی علیہ السلام، سید الشہداء۔
(ولادت: ۴ھ شہادت: ۶۱ھ۔ مدفن: کربلائے معلی، عراق)

۴۔ حضرت امام علی ابن حسین علیہ السلام، ملقب بہ زین العابدین علیہ السلام۔
(ولادت: ۳۸ھ۔ شہادت: ۹۴ھ۔ مدفن: مدینہ منورہ، قبرستان بقیع)

۵۔ حضرت امام محمد ابن علی علیہ السلام، معروف بہ باقر العلوم۔
(ولادت: ۵۷ھ۔ شہادت: ۱۱۴ھ، مدفن: مدینہ منورہ، قبرستان بقیع)

۶۔ حضرت امام جعفر ابن محمد علیہ السلام، معروف بہ صادق علیہ السلام
(ولادت: ۸۳ھ۔ شہادت: ۱۴۸ھ۔ مدفن: مدینہ منورہ، قبرستان بقیع)

۷۔ حضرت امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام، ملقب بہ کاظم علیہ السلام
(ولادت: ۱۲۸ھ۔ شہادت: ۱۸۳ھ۔ مدفن: کاظمین، عراق)

۸۔ حضرت امام علی ابن موسیٰ علیہ السلام، ملقب بہ رضا علیہ السلام۔
(ولادت: ۱۴۸ھ۔ شہادت: ۲۰۳ھ۔ مدفن: خراسان، ایران)

۹۔ حضرت امام محمد ابن علی علیہ السلام، معروف بہ جواد علیہ السلام۔
(ولادت: ۱۹۵ھ۔ شہادت: ۲۲۰ھ۔ مدفن: کاظمین، عراق)

۱۰۔ حضرت امام علی ابن محمد علیہ السلام، معروف بہ ہادی علیہ السلام۔
(ولادت: ۲۱۲ھ۔ شہادت: ۲۵۴ھ۔ مدفن: سامرّا، عراق)
۱۱۔ حضرت امام حسن ابن علی علیہ السلام، معروف بہ عسکری علیہ السلام۔
(ولادت: ۲۳۲ھ۔ شہادت: ۲۶۰ھ۔ مدفن: سامرّا، عراق)
۱۲۔ حضرت امام محمد ابن حسن عسکری علیہ السلام، معروف بہ حجت و مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف۔ آپ علیہ السلام شیعوں کے بارہویں امام ہیں اور ابھی زندہ و غائب ہیں تا کہ حکم خدا سے ایک دن ظہور فرما کر، قرآن مجید کے صریح وعدہ (سورہ ء نور/۵۴، توبہ/۳۳، فتح/۲۸ و صف/۹) اور اسلام کی متواتر احادیث کے مطابق تمام دنیا میں اسلام کی حکومت قائم کریں گے۔ (۱)۔

شیعوں کے اماموں کی زندگی کے بارے میں تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں وضاحت کے ساتھ درج ہیں۔ چونکہ بارہویں امام اس وقت زندہ ہیں، اسلئے آپ علیہ السلام منشائے الٰہی کے تحت امامت کی ذمہ داری اور منصب سنبھالے ہوئے ہیں، آئندہ بحث میں آپ کے بارے میں مزید وضاحت کی جائے گی۔

۹۴ ویں اصل:

خاندانِ رسالت علیہ السلام سے محبت کرنا ایک ایسا امر ہے جس کی قرآن و سنت میں تاکید ہوئی ہے، جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

﴿قُل لَّآ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ (شوریٰ/۲۳)

''اے رسول آپ کہد یجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا کوئی

۱۔ بعض ائمہ کی تاریخ ولادت و شہادت میں اختلاف ہے، ہم نے ایک کا انتخاب کیا ہے۔ ائمہ علیہ السلام کی رحلت شہادت کے ذریعہ واقع ہوئی ہے۔ تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں۔)

اجرنہیں چاہتا،علاوہ اس کے کہ میرے اقرباء سے محبت کرو۔''

قرباء سے مرادخود پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہ السلام ہیں اوراس کاقرینہ یہ ہے کہ درخواست کرنے والے خودپیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

خاندان نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوستی بذات خودایک بڑافضل وکمال ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا سبب ہوتی ہے کہ لوگ ان کے جیسے بننے کی کوشش کریں نیزاچھائیاں حاصل کرنے اور برے کاموں سے دوری اختیارکرنے میں اہل بیت علیہ السلام کی اقتداءکریں۔

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل شدہ متواتر احادیث کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہ السلام سے دوستی ایمان کی علامت اوران سے دشمنی کفرونفاق کی نشانی ہے۔جس کسی نے اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوستی کی اس نے خداورسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوستی کی ہے اورجسنے ان سے دشمنی کی،اس نے خداورسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمن کی ہے۔

اصولی طورپراہل بیت پیغمبر علیہ السلام سے محبت کرناضروریات دین میں سے ہے اور اس میں کسی قسم کاشک وشبہہ نہیں ہے بلکہ اس پرتمام مسلمانوں کااتفاق نظرہے۔فقط ایک فرقہ،جنھیں ''ناصبی'' کہتے ہیں اس امرکامنکرہے اوراسی لئے اس فرقہ سے متعلق افرادمنکراسلام شمارہوتے ہیں۔

بارہویں امام

غیبت اور ظہور

بارہ اماموں میں سے ہر ایک کے بارے میں کچھ لکھنا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے۔ یہاں پر صرف ایک چیز کی طرف قدری تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے اور وہ، وجود امام عصرؑ کے اعتقاد کا مسئلہ ہے جو پردہ غیبت میں ہیں۔ خدا کے حکم سے ایک دن ظہور فرمائیں گے اور تمام دنیا پر عدل وانصاف کی حکومت قائم کریں گے۔ ہم اس موضوع پر ذیل میں چند اصل کے تحت بحث کریں گے۔

۹۵ویں اصل:

تاریخ بشریت کے مستقبل میں، خاندان رسالت علیہ السلام میں سے ایک شخص کا ظہور کرنا اور عالمی سطح پر عدل وانصاف کی حکومت قائم کرنا (جبکہ دنیا ظلم وستم سے پر ہو چکی ہو)، عقائد اسلامی کے مسلمات میں سے ہے اور مسلمانوں کے تمام فرقے اس پر متفق ہیں۔ اس

سلسلے میں نقل ہوئی احادیث تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ محققین کے حساب کے مطابق اس سلسلے میں ۶۵۷ روایتیں نقل ہوئی ہیں۔ ان سب میں سے ہم یہاں پر مسند احمد بن حنبل سے فقط ایک حدیث کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لولم یبق من الدنیا الّا یوم واحد لطوّل اللہ ذالک الیوم حتیٰ یخرج رجل من ولدی فیملاء ھاعدلاو قسطا کماملئت ظلمًاو جورًا(۱)

"اگر دنیا کی عمر میں سے صرف ایک ہی دن باقی بچے تو بھی خداوند کریم اس دن کو اتنا طولانی کرے گا یہاں کہ میری اولاد میں سے ایک فرد اٹھے گا اور دنیا کو عدل وانصاف سے اس طرح بھردے گا جس طرح وہ ظلم وستم سے پر ہو چکی ہوگی۔"

اس طرح آخر الزمان میں خاندان رسالت سے ایک مرد کے قیام وظہور پر تمام مسلمانوں۔ شیعہ وسنی۔ کا اتفاق ہے۔

۹۶ ویں اصل:

اس مصلح عالم کے خصوصیات جو فریقین (شیعہ وسنی) سے نقل شدہ اسلامی روایات میں درج ہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہ السلام میں سے ہے۔ اس پر ۳۸۹ حدیثیں۔

۲۔ وہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔ اس پر ۲۱۴ حدیثیں۔

۳۔ وہ حضرت فاطمہ زہرا کی اولاد میں سے ہے۔ اس پر ۱۹۲ حدیثیں۔

۱۔ مسند احمد بن حنبل ۱/۹۹، ۳/۱۷ و ۷۰۔

۴۔وہ امام حسین علیہ السلام کی اولاد کے نویں فرزند ہیں۔	اس پر ۱۴۸ حدیثیں۔
۵۔وہ امام زین العابدین علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔	اس پر ۱۸۵ حدیثیں۔
۶۔وہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔	اس پر ۱۴۶ حدیثیں۔
۷۔وہ ائمہ اہل بیت علیہ السلام کے بارہویں امام ہیں۔	اس پر ۱۳۶ حدیثیں۔
۸۔وہ روایتیں جو ان کی ولادت کی خبر دیتی ہیں۔	اس پر ۲۱۴ حدیثیں۔
۹۔اُن کی عمر طولانی ہوگی۔	اس پر ۳۱۸ حدیثیں
۱۰۔وہ طویل مدت تک غیبت میں رہیں گے۔	اس پر ۹۱ حدیثیں۔
۱۱۔ان کے ظہور پر اسلام عالمگیر ہوگا۔	اس پر ۲۷ حدیثیں۔
۱۲۔وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔	اس پر ۱۳۲ حدیثیں۔

مذکورہ روایات کی رو سے تاریخ بشریت کے مستقبل میں ایسی شخصیت کا وجود اسلامی روایات کے مطابق مسلم اور ناقابل تردید ہے۔جس چیز پر اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ کیا وہ پیدا ہو چکے ہیں؟ اور اس وقت زندہ ہے؟ یا مستقبل میں پیدا ہوں گے؟ تمام شیعہ اور اہل سنت کے محققین کا ایک گروہ پہلے نظریہ کے قائل ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ آپ سنہ ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور اس وقت بھی زندہ ہیں۔لیکن اہل سنت کے ایک گروہ کا اعتقاد ہے کہ آپ مستقبل میں پیدا ہوں گے۔

چونکہ ہم شیعہ معتقد ہیں کہ آپ سنہ ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے ہیں اور اس وقت بھی زندہ ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ اس کتاب کی گنجائش کے بقدر غیبت اور آپ کی طول عمر کے بارے میں چند نکتے بیان کریں:

۹۷ ویں اصل:

قرآن مجید کی نگاہ میں اولیائے الٰہی دو قسم کے ہیں: ولی ظاہر، یعنی لوگ اسے جانتے ہیں۔اور ولی غائب، یعنی جو آنکھوں سے اوجھل ہے، جسے لوگ نہیں پہچانتے، اگر چہ وہ ان کے درمیان

ہے اوران کے حالات سے آ گاہ ہے۔

سورہ کہف میں مذکورہ دونوں اولیاء کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہے۔ان میں سے ایک حضرت موسیٰ ابن عمران ہیں اوردوسرے اُن کے دریاو خشکی کے عارضی ساتھی حضرت خضر ہیں۔حضرت خضر ایک ایسے ولی خدا تھے کہ حضرت موسیٰ انھیں جانتے بھی نہیں تھے صرف خدا کی رہنمائی سے آپ نے انھیں پہنچانا اوران کے علم سے استفادہ کیا۔جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿فوجدا عبدًامن عبادناء اتینٰہ رحمة من عندنا وعلّمنٰہ من لّدنّا علمًا.قَال له موسیٰ هَل أتّبغک علیٓ ان تعلمن مماعلمت رشداً﴾

''توان دونوں نے اس جگہ پر ہمارے بندوں میں سے ایک ایسے بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی طرف سے رحمت عطا کی تھی اوراپنے علم خاص میں سے ایک خاص علم کی تعلیم دی تھی۔موسیٰ نے اس بندے سے کہا کہ: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں کہ آپ مجھے اس علم میں سے کچھ تعلیم کریں جو رہنمائی کا علم آپ کو عطا ہوا ہے؟''

اس کے بعد قرآن مجید اس ولی خدا کے مفید اور سودمند کاموں کی تشریح کرتا ہے،جس سے بالکل واضح ہوتا ہے کہ لوگ اسے نہیں جانتے تھے لیکن اس کے آثار و برکات سے استفادہ کرتے تھے۔(۱)

حضرت امام زمان بھی حضرت موسیٰ کے ساتھی (حضرت خضر علیہ السلام) کی طرح ہیں۔انھیں بھی کوئی نہیں پہچانتا لیکن پھر بھی وہ امت کے لئے فائدہ مند ہیں۔اس صورت میں امام کی غیبت معاشرے سے دوری اور جدائی کے معنی میں نہیں ہے۔بلکہ وہ۔جیسا کہ روایات میں ذکر ہوا ہے- ابر کے پیچھے پنہاں آفتاب کی مانند ہیں،جو دکھائی نہیں دیتا لیکن

۱۔سورہ ٔ کہف/۷۱۔۸۲.

لوگوں کو روشنی اور گرمی پہنچاتا ہے۔(۱)

اس کے علاوہ پوری تاریخ میں بہت سے پاک دل، شائستہ اور نیک انسان ان کے حضور میں پہنچے ہیں اوران سے بہرہ مند ہوئے اور ہوتے رہے ہیں۔اس طرح دوسرے لوگ بھی ان کے وجود کے برکات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

۹۸ویں اصل:

انسانوں کے درمیان یہی معمول رہا ہے کہ حکام ورہبر، کچھ کام بلا واسطہ خود انجام دیتے ہیں اور کچھ کام ان کے نمائندے انجام دیتے ہیں۔یہ صحیح ہے کہ مختلف اسباب وعوامل کی وجہ سے امام عصر غیبت میں ہیں اور انسان ان تک براہ راست رسائی پیدا کرنے سے محروم ہے، لیکن خوش قسمتی سے ان کے نمائندوں یعنی عظیم فقہا اور مجتہدین سے اشارہ اور ہدایت حاصل کرنے کا راستہ ان کے پیروؤں کے اوپر مسدود نہیں ہے۔عظیم المرتبت فقہا اور مجتہدین شرعی وحکومتی امور میں آپ کے نمائندے ہیں اور غیبت کے زمانے میں اسلامی معاشرے کا نظم ونسق چلانے کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی ہے۔البتہ حضرت علیہ السلام کے تمام ظاہری آثار سے محرومیت کی وجہ کچھ خاص شرائط وحالات ہیں۔اورانہی شرائط کی وجہ سے ان کی غیبت ناگزیر بن گئی ہے۔

۹۹ویں اصل:

حضرت ولی عصر کی غیبت کا سبب ایک سرّ الٰہی ہے اور ممکن ہے ہم اس کی حقیقت سے واقف نہ ہوسکیں۔اولیائے الٰہی کا مختصر مدت کے لئے لوگوں کے درمیان سے غائب ہونا گزشتہ امتوں میں بھی معمول رہا ہے:

۱۔کمال الدین،شیخ صدوق،باب ۴۵، حدیث ۴،ص ۴۸۵۔

حضرت موسیٰ ابن عمران علیہ السلام چالیس دن تک اپنی امت سے غائب رہے اورانہوں نے یہ ایام میقات میں بسر کئے (اعراف/۱۴۲)۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام مشیت الٰہی سے اپنی امت کی نظروں سے اوجھل ہوئے اوراس طرح دشمن انھیں قتل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے (نساء/۱۵۸)۔حضرت یونس ایک مدت تک اپنی امت سے غائب رہے (صافات/۱۴۰)۔

اصولی طور پر اگر کوئی مطلب متواتر روایات سے ثابت ہوجائے لیکن انسان اس کے راز وفلسفہ کو مکمل طور سے درک نہ کرسکے تو،اس پر شک کر کے اس سے انکار نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اس طرح سے اس بات کا امکان ہے کہ احکام الٰہی کا ایک بڑا حصہ، جو مسلمات اور ضروریات دین میں شمار ہوتا ہے،شک وشبہہ کا شکار ہوجائے گا۔حضرت ولی عصر کی غیبت کا مسئلہ بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہے اور غیبت کے اسرار کی حقیقت سے بے خبر ہونا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ ان کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ان باتوں کے باوجود آپ کی غیبت کے اسرار کو انسانی فکر کے دائرہ میں سمجھا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

اس آخری معصوم حجت الٰہی کو ایک عظیم مقصد (یعنی عمومی عدل وانصاف برپا کرنے اور پرچم اسلام کو پوری دنیا میں لہرانے) کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے،اوراس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زمانہ کا گزرنا،انسانی عقل وعلم کی وسعت اورانسان کی ذہنی طور آمادگی ضروری ہے تاکہ دنیا عدل وآزادی کے اس امام کی ہم رکابی اور استقبال کے لئے آمادہ ہوسکے۔ظاہری بات ہے کہ اگر حضرت ولی عصر علیہ السلام ابتدائی اقدامات اور تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے لوگوں کے درمیان ظاہر ہوجائیں تو ان کا انجام بھی دیگر حجت خدا کی طرح (شہادت) ہوسکتا ہے اور وہ بھی اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے سے پہلے ہی رحلت فرماجائیں گے۔اس فلسفہ کی طرف روایتوں میں بھی اشارہ ہوا ہے۔امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:''حضرت قائم عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کیلئے ظہور سے پہلے ایک غیبت ہے۔''راوی نے اس غیبت کی وجہ پوچھی تو امام علیہ السلام نے فرمایا:''شہادت سے بچنے

کے لئے۔''(۱) کچھ روایتوں میں اس کا فلسفہ لوگوں کا امتحان بھی بیان ہوا ہے، یعنی یہ کہ غیبت کے زمانے میں لوگ آزمائش وامتحان الٰہی سے دوچار ہوں گے اور غیبت کے ذریعہ ان کے ایمان واعتقادات کی استقامت وپائداری کو آزمایا جائے گا(۲)۔

۱۰۰ ویں اصل:

علم کلام کے دلائل وبراہین کے مطابق معاشرے میں امام کا وجود خدا کی عظیم الطاف میں سے ہے جو لوگوں کے لئے ہدایت کا سبب ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر لوگ اس نعمت الٰہی کے مظہر کی طرف رجوع کریں گے تو اس کے وجود کے تمام آثار وبرکات سے بہرہ مند ہوں گے۔ دوسری صورت میں لوگ اس نعمت کے فوائد سے محروم رہیں گے اور اس محرومیت کا سبب وہ خود ہوں گے، نہ کہ خدا اور امام۔

۱۰۱ ویں اصل:

حضرت ولی عصر سنہ ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس حساب سے، اس وقت (۱۴۲۱ھ) میں آپ کی عمر شریف ۱۱۶۶ سال ہے۔ خداوند متعال کی وسیع ولا متناہی قدرت کے پیش نظر یہ طولانی عمر کوئی مشکل امر نہیں ہے، حقیقت میں جو لوگ آپ کی طولانی عمر کو مشکل سمجھتے ہیں، وہ خداوند کریم کی لا متناہی قدرت سے غفلت برتتے ہے۔ (وَمَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهِ. انعام/۹۱) اس کے علاوہ گزشتہ امتوں میں بہت سے معمّر افراد گزرے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت کے دور کو ۹۵۰ سال بیان کرتا ہے (عنکبوت/۱۴)۔ اسی طرح عصر حاضر میں سائنسدان اس جدوجہد میں ہیں کہ طول عمر کی مشکل کو حل کریں۔

۱۔ کمال الدین شیخ صدوق، باب ۱۴، حدیث ۸، ۹، ۱۰۔

۲۔ مجلسی، بحار الانوار ۵۲/۱۰۲۔۱۱۳۔۱۱۴ باب المحیص والنہی عن التوقیب۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سائنسدانوں کے اعتقاد کے مطابق انسان طولانی عمر کی صلاحیت رکھتا ہے،لیکن درحقیقت کچھ ایسی دشواریاں ہیں جو عمر کے طولانی ہونے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

حقیقت میں، جو خدا-خود قرآن کے مطابق-حضرت یونس علیہ السلام کو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں زندہ رکھ سکتا ہے(صافات/۱۴۳-۱۴۴)، کیا وہ اپنے فضل وکرم اور مہربانیوں وعنایتوں سے اپنے حجّت کو طولانی عمر بخش کر زمین پر زندہ نہیں رکھ سکتا؟ بیشک اس کا جواب مثبت ہے کیونکہ وہ خدا جو کائنات کو پائندہ رکھ سکتا ہے، اپنے حجت کو زندہ بھی رکھ سکتا ہے۔

۱۰۲ اویں اصل:

حضرت ولی عصر کے ظہور کے وقت سے کوئی واقف نہیں ہے، اور اس امر کے بارے میں قیامت کی طرح صرف خداوند متعال کو علم ہے۔اس لئے اگر کوئی آپ علیہ السلام کے ظہور کے وقت کے بارے میں باخبر ہونے کا دعویٰ کرے یا ظہور کے وقت کو معیّن کرے تو اس کا دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا۔

كذب الوَقّاتون

''وقت کو معین کرنے والے جھوٹے ہیں۔''

ظہور کی صحیح اور قطعی تاریخ سے صرف نظر کرتے ہوئے اس مسئلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ احادیث وروایتوں میں حضرت ولی عصر علیہ السلام کے ظہور کے سلسلے میں عمومی اور کلّی نشانیاں بیان ہوئی ہیں اور یہ نشانیاں دو قسم کی ہیں:

۱۔یقینی اور ناگزیر نشانیاں۔

۲۔غیر یقینی نشانیاں۔

ان نشانیوں سے متعلق عقائد اور حدیثوں کی کتابوں میں تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔

آٹھواں حصہ

کلیات عقائد

(۷)

عالم بعد از موت

۱۰۳ ویں اصل:

تمام الٰہی ادیان عالم آخرت پر ایمان کی ضرورت پر متفق ہیں۔ ہر پیغمبر نے توحید کی دعوت کے ساتھ معاد اور موت کے بعد زندگی کے اعتقاد پر زور دیا ہے اور عالم آخرت پر ایمان کو اپنے دینی منصوبے کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے قیامت پر اعتقاد، اسلام کے ارکانِ ایمان میں شمار ہوتا ہے۔ اگر چہ مسئلہ معاد، قدیم وجدید زمانوں میں۔ بلکہ عہد جدید میں واضح صورت میں۔ زیر بحث قرار پایا ہے، لیکن قرآن مجید نے دیگر آسمانی کتابوں کی نسبت اس موضوع کی طرف خاص توجہ دی ہے اور اس کتاب مقدس کی آیات کا ایک بڑا حصہ اس موضوع سے مخصوص ہے۔ قرآن کریم میں معاد کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے، جیسے یوم القیامۃ، یوم الحساب، الیوم الآخر، یوم البعث وغیرہ۔ یہ سب اہتمام اس لئے ہے کہ قیامت پر اعتقاد کے بغیر ایمان کا کوئی فائدہ اور پھل نہیں ہے۔

۱۰۴ ویں اصل:

اسلامی فلاسفہ اور متکلمین نے معاد اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں مختلف دلیلیں پیش کی ہیں اور انہوں نے ان دلائل کو، قرآن مجید سے اخذ کیا ہے۔ لہذا مناسب ہے کہ اس سلسلے میں قرآن مجید کی چند دلائل کا ذکر کیا جائے:

الف: خداوند کریم، حق مطلق ہے اور اس کے کام بھی حکیمانہ اور ہر قسم کے باطل و بیہودگی سے پاک و منزہ ہیں اور انسان کی خلقت ایک بامقصد اور جاودانی زندگی کے وجود کے بغیر بیہودہ و عبث ہوگی، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَٰكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ (مؤمنون/۱۱۵)

''کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد اور بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آ ؤ گے؟''

ب: عدل الٰہی کا تقاضا ہے کہ، سزا و جزاء کے مقام پر نیک اور بد افراد کے ساتھ یکسان برتاؤ نہیں ہونا چاہئے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی ایسی ہے کہ سزا و جزا کے نفاذ کے مقام پر مکمل انصاف کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ نیک و بد (دونوں گروہ) کا مقدر آپسمیں اس طرح وابستہ ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ممکن نہیں۔ دوسری جانب سے کچھ نیک و بد کام ایسی جزا و سزا کے مستحق ہیں کہ اس دنیا میں انھیں عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنی پوری عمر جہاد میں گزارنے کے بعد اپنی جان کی قربانی دیتا ہے، اور دوسرا شخص بے شمار حق پسندوں کو موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔ اس صورت میں ایک دوسری دنیا اور ایک دوسرے عالم کا ہونا ضروری ہے تا کہ عدل الٰہی اپنے لامحدود امکانات کے دائرہ میں عملی جامہ پہن سکے، جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ ءَ امَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّلِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ﴾ (ص/۲۸)

''کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں جیسا قرار دیں یا صاحبان تقویٰ کو فاسق و فاجر افراد جیسا قرار دیں۔''

اور فرماتا ہے:

﴿وَإِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا إِنَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ ءَ امَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّلِحَٰتِ بِالْقِسْطِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾ (یونس/۴)

''اسی کی طرف تم سب کی بازگشت ہے۔ یہ خدا کا سچا وعدہ ہے۔ وہی خلقت

کا آغاز کرنے والا ہے اور واپس لے جانے والا ہے تا کہ ایمان اور نیک عمل
والوں کو عادلانہ جزا دے اور جو کافر ہو گئے ہیں، ان کے لئے تو گرم پانی
کا مشروب ہے اور ان کے کفر کی بنا پر دردناک عذاب بھی ہے۔''

ج: اس دنیا میں انسان کی خلقت ایک معمولی اور حقیر ذرہ سے شروع ہوئی ہے اور وہ جسمانی کمال کے مختلف مراحل و مدارج کو تدریجاً طے کرتا ہے۔ اور اس کے بعد ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں اس ڈھانچے میں روح پھونکی جاتی ہے اور قرآن مجید اس ممتاز وجود کی خلقت کی تکمیل کے پیش نظر خالق کائنات کو ''احسن الخالقین'' کے نام سے پکارتا ہے، اس کے بعد یہ انسان موت کے ذریعہ اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہوتا ہے، جو گزشتہ مرحلہ کا مقامِ کمال ہوتا ہے۔ خداوند متعال قرآن مجید میں اس مطلب کی طرف اس طرح اشارہ فرماتا ہے:

﴿ثُمَّ اَنشَاْنٰهُ خَلْقًا ءَ اخَرَ فَتَبَارَکَ اللهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِینَ. ثُمَّ اِنَّکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُونَ. ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُونَ. (مؤمنون/ ۱۴-۱۶)

''پھر ہم نے اس سے ایک دوسری مخلوق بنا دیا تو کس قدر بابرکت ہے وہ خدا جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے۔ پھر اس کے بعد تم سب مر جانے والے ہو۔ پھر اس کے بعد تم روز قیامت دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔''

سیاقِ آیت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایک معمولی ذرہ سے انسان کی خلقت اور دوبارہ زندگی کے درمیان ایک رابطہ و تعلق ہے۔

۱۰۵ ویں اصل:

نزول قرآن کے زمانے میں منکرین معاد کچھ شکوک و شبہات پھیلاتے تھے۔ قرآن مجید نے اس سلسلے میں مذکورہ شبہات کو دور کرنے کے ساتھ وجود معاد کے بارے میں واضح دلائل پیش کئے ہیں۔ ہم ذیل ان میں سے چند کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف۔ بعض اوقات خداوند متعال کی قدرتِ مطلقہ پر تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِلَى اللهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (ہود/۴)

''تم سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے اور وہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

ب۔ بعض اوقات یاد دلایا گیا ہے کہ جو، انسان کو پہلی بار پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے، وہ اس کو دوبارہ خلق کرنے سے عاجز نہیں ہوسکتا۔ مثلاً منکرین معاد کی تنقید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا﴾ (اسراء/۵۱)

''عنقریب یہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں کون دوبارہ واپس لاسکتا ہے۔''

پھر اس کے جواب میں فرماتا ہے:

﴿قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (اسراء/۵۱)

''کہہ دیجئے کہ جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے''

ج۔ بعض اوقات انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کو موسم بہار میں زمین کے زندہ ہونے سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ﴾ (حج/۵)

''اور تم زمین کو مردہ دیکھتے ہو پھر جب ہم پانی برساتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے اور ہر طرح کی خوبصورت چیز اگانے لگتی ہے''۔

اس فطری حقیقت کے طرف اشارہ کرتے ہوئے معاد کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ﴾ (حج/۶)

''اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے''۔(۱)

۱۔ سورۂ ق کی آیت ۹ اور ۱۱ بھی اسی مضمون کی ہیں۔

د۔ یہ سوال وشبہہ ایجاد کیا جاتا تھا کہ، جب انسان مرتا ہے اور اس کے بدن کے اجزاء گل سڑ کر مٹی میں مل جاتے ہیں تو کیسے ان اجزاء کو پیدا کر کے دوبارہ پہلا جیسا بدن بنایا جائے گا؟ اس کے جواب میں قرآن مجید خداوند متعال کے وسیع علم کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿بَلىٰ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيمُ﴾ (یٰس/۸۱)

''جی ہاں وہ اس کام پر قادر ہے، کیونکہ وہ بہترین پیدا کرنے اور جاننے والا ہے''۔

دوسری جگہ پر بھی اس وسیع علم کا یوں تذکرہ فرمایا ہے:

﴿قَدْعَلِمْنَا مَاتَنقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعِندَنَاكِتٰبٌ حَفِيظٌ﴾ (ق/۴)

''ہم جانتے ہیں کہ زمین ان کے جسموں میں سے کس قدر کم کر دیتی ہے اور ہمارے پاس ایک محفوظ کتاب موجود ہے''۔

ھ ۔ بعض اوقات تصور کیا جاتا ہے کہ انسان صرف مادی جسم کے اجزاء واعضاء کا ایک مجموعہ ہے، جو مرنے کے بعد گل سڑ کر مٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کیسے ممکن ہے کہ قیامت کے دن زندہ ہونیوالا انسان وہی پہلے والا انسان ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں ان دو جسموں کے ایک ہونے کا محافظ کون ہے؟

قرآن مجید کافروں کے بارے میں یوں بیان فرماتا ہے:

﴿أَءِذَاضَلَلْنَا فِى الْأَرْضِ أَءِنَّالَفِى خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾ (سجدہ/۱۰)

''اور یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم زمین میں گم ہو گئے تو کیا نئی خلقت میں پھر ظاہر کئے جائیں گے؟''

پھر اس کے جواب میں فرماتا ہے:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِى وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ

رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ﴾ (سجدہ/۱۱)

''آپ کہد یجئے کہ ملک الموت جوتم پر تعینات کیا گیا ہے تم سے تمہاری زندگی لے لیگا اور اس کے بعد تم سب پروردگار کی بارگاہ میں پیش کئے جاؤ گے''۔

اس آیت میں کلمہ ''توفی'' لینے کے معنی میں ہے۔اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت اس چیز (بدن) کے علاوہ جو زمین میں باقی رہتی ہے اور خاک کے حوالے کی جاتی ہے، موت کا فرشتہ ایک اور چیز بھی لیتا ہے اور وہ ''روح'' ہے۔اس صورت میں قرآن کے جواب کا مفہوم یہ ہے کہ ان دو بدنوں کا محافظ (اجزاء کی وحدت کے علاوہ) یہی روح ہے، جسے ملک الموت لیتا ہے اور یہی روح سبب ہوگی کہ قیامت کے دن زندہ ہونے والا انسان وہی انسان ہوگا جو دنیا میں موجود تھا اور جزاء وسزاء اسی کو ملے گی جو اس کا حقدار ہوگا۔

ایک دوسری آیت میں بھی قرآن مجید انسانی بدن کی وحدت کا یوں بیان فرماتا ہے:

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِىٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ﴾

(یٰس/۷۹)

''اے رسول آپ کہد یجئے کہ جس نے اسے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ ہر مخلوق کا بہتر جاننے والا ہے''۔

۱۰۶ ویں اصل:

آیاتِ قرآنی اور اسلامی احادیث اس امر کے گواہ ہیں کہ انسان کا پھر سے زندہ ہونا جسمانی وروحانی، دونوں صورتوں میں مراد ہے۔معاد جسمانی کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن بدن کے اجزاء کو پھر سے جمع کر کے اس میں روح پھونک دی جائے گی اور جزاء وسزاء، لذتیں اور تکلیفیں۔جن کا تعلق جزئی اور حسی پہلو سے ہے اور ان کو عملی جامہ پہنانا بدن اور قوائے حسی کے بغیر ممکن نہیں

ہے۔ تحقق پائیں گی۔

معاد روحانی کا مقصد یہ ہے کہ جسمانی وحسّی سزا و جزا اور جزئی و جسمانی لذتوں اور تکلیفوں کے علاوہ صالح اور بدکردار افراد کیلئے ایسی روحانی وغیر حسّی جزائیں وسزائیں بھی مقرر کی گئی ہیں کہ روح کو ان کے ادراک کے لئے بدن اور قوای حسّی کی ضرورت نہیں۔ جیسے رضوان خدا (اللہ کی رضا و خوشنودی) کا ادراک، جس کے بارے میں قرآن مجید حسّی جزاؤں کو گننے کے بعد فرماتا ہے:

﴿رِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ أَكْبَرُ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (توبہ/۷۲)

''اس کی مرضی تو سب سے بڑی چیز ہے اور یہی ایک عظیم کامیابی ہے''۔

یا جان لیوا غم واندوہ کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (مریم/۳۹)

''اور ان لوگوں کو اس حسرت کے دن سے ڈرایئے جب قطعی فیصلہ ہو جائے گا اگر چہ یہ لوگ غفلت کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں''۔

۷۰ ویں اصل:

موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونا ہے، ایک ایسے عالم میں جو ابدی ہے اور وہی قیامت اور لافانی عالم ہے۔ ساتھ ہی اس دنیا اور قیامت کے درمیان ایک اور عالم بھی ہے جسے ''برزخ'' کہتے ہیں اور انسان موت کے بعد کچھ مدت اس عالم میں گزارتا ہے۔ برزخ کی زندگی کی حقیقت سے ہم پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اور قرآن واحادیث میں اس کے بارے میں بیان شدہ معلومات تک ہی جانکاری رکھتے ہیں۔ اس سلسلے

میں قرآن مجید کے چند اشارات وراہنمائیاں ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

الف۔جب ایک مشرک موت سے دوچار ہوتا ہے تو کہتا ہے: خداوندا مجھے واپس بھیج، تا کہ جوفرائض مجھ سے چھوٹ گئے ہیں، انھیں انجام دوں۔خداوندمتعال کی طرف سے خطاب آتا ہے: ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا تمہارا کہنا لقلقہ زبان کے سوا کچھ نہیں۔اس کے بعد فرماتا ہے:

﴿وَمِنْ وَرَآئِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ (مؤمنون/۱۰۰)

''اوراس کے پیچھے ایک برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے''۔

مذکورہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ انسان حقیقت میں مرنے کے بعد بھی وجود رکھتا ہے، لیکن دنیا میں واپس آنے کے سلسلے میں اسے رکاوٹ کا سامنا ہوتا ہے۔

ب۔شہیدوں کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَآءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ﴾ (بقرہ/۱۵۴)

''اور جولوگ راہ خدا میں قتل ہوجاتے ہیں انھیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے''۔

ایک دوسری آیت میں شہیدوں کی زندگی کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿فَرِحِينَ بِمَآ ءَاتَٰهُمُ اللهُ مِن فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

(آل عمران/۱۷۰)

''وہ خدا کی طرف سے ملنے والے فضل وکرم سے خوش ہیں اور جو ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہوسکے ہیں، ان کے بارے میں یہ خوش خبری رکھتے ہیں کہ ان کے واسطے بھی نہ کوئی خوف ہے اور نہ حزن''۔

ج۔گنہگاروں خصوصاً آلِ فرعون کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ قیامت برپا ہونے سے پہلے ہر صبح وشام آگ کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور قیامت کے دن شدید تر عذاب سے دوچار ہو جائیں گے۔جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُواً وَعَشِيًّاوَيَوْمَ تَقُومُوالسَّاعَةُ أَدْخِلُواْ آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّالْعَذَابِ﴾ (غافر/۴۶)

''وہ آگ جس کے سامنے یہ ہر صبح وشام پیش کئے جاتے ہیں اور جب قیامت برپا ہوگی تو فرشتوں کو حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو بدترین عذاب کی منزل میں داخل کر دو''۔

۱۰۸ویں اصل:

انسان کی برزخی زندگی کا پہلا مرحلہ اس کے بدن سے قبض روح ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔انسان کو سپرد خاک کرنے کے بعد۔بہت سی احادیث کے مطابق۔خدا کے فرشتے اس سے توحید،نبوت اور بعض عقائد واحکام کے بارے میں کچھ سوالات کرتے ہیں۔معلوم ہے کہ ایک مؤمن کی طرف سے ان سوالات کے جواب اور کافر کے جواب میں فرق ہوگا،نتیجہ کے طور پر مؤمن کے لئے قبر اور برزخ مظہر رحمت اور کفار ومنافقین کے لئے عذاب الٰہی کی جگہ بن جائے گی۔قبر میں فرشتوں کی طرف سے پوچھے جانے والے سوالات اور اس جگہ کا مؤمنین کے لئے رحمت اور کفار کے لئے عذاب بن جانا،ہمارے مسلم دینی عقائد میں سے ہے،قبر،حقیقت میں برزخی زندگی کا آغاز ہے جس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا،اس کے بارے میں علمائے امامیہ نے عقائد کی کتابوں میں وضاحت کی ہے۔شیخ صدوق اپنی کتاب ''اعتقادات'' میں لکھتے ہیں:

''قبر میں سوال کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ حق ہے اور جو کوئی ان

سوالات کا صحیح جواب دے گا اس کے لئے رحمت الٰہی ہے اور جو ان سوالات کا صحیح جواب نہ دے گا، عذاب خداوندی میں گرفتار ہوگا''۔(۱)

شیخ مفید کتاب ''تصحیح الاعتقاد'' میں لکھتے ہیں:

''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ صحیح روایتیں نقل ہوئی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اہل قبور سے ان کے دین کے بارے میں سوال ہوگا، اور بعض روایات میں آیا ہے کہ جو دو فرشتے انسانوں سے قبر میں سوال کرنے کے لئے ماٴمور ہیں ان کے نام نکیر و منکر ہیں''۔

اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں:

''قبر میں سوال ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ مردے قبر میں زندہ ہوتے ہیں اس کے بعد ان کی یہ زندگی قیامت تک جاری رہتی ہے''۔(۲)

خواجہ نصیر الدین طوسی نے بھی اپنی کتاب ''تجرید الاعتقاد'' میں ذکر کیا ہے:

''عذاب قبر واقع ہوگا، کیونکہ یہ عقلی طور ممکن امر ہے اور اس سلسلے میں متواتر روایتیں بھی نقل ہوئی ہیں''۔(۳)

دین اسلام کے دیگر مذاہب کے عقائد سے مربوط کتابوں کا مطالعہ کرنے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس عقیدہ پر تمام مذاہب اسلامی کا اتفاق ہے اور صرف ایک شخص، ضرار ابن عمرو کے بارے میں یہ عقیدہ منسوب ہوا ہے کہ وہ عذاب قبر کا منکر تھا''۔

۱۔ الاعتقادات، صدوق، باب ۱۷، ص ۳۷۔

۲۔ تصحیح الاعتقاد، مفید، ص ۴۵ و ص ۴۶۔

۳۔ کشف المراد، مقصد ۶، مسئلہ ۱۴)

۱۰۹ویں اصل:

گذشتہ بیانات سے واضح ہوا کہ حقیقتِ معاد یہ ہے کہ، مشیت الٰہی کے تحت، روح بدن سے جدا ہونے کے بعد دوبارہ اسی بدن میں واپس آتی ہے، جس میں پہلے زندگی بسر کررہی تھی تا کہ دنیا میں انجام دئے گئے اعمال کی جزاوسزا کو دوسرے عالم میں پائے۔

بعض لوگ، جیسے ہندومت کے پیرو، آسمانی ادیان میں بیان شدہ معاد کے منکر ہیں۔ لیکن اعمال کی جزاوسزا کے قائل ہیں اور آواگون کے طریقے سے اسکی توجیہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ روح جنین میں داخل ہونے کے بعد مختلف مراحل طے کرتے ہوئے دوبارہ دنیا میں واپس آجاتی ہے اور بچپن، جوانی وپیری کے دور سے گزرتی ہے، جو لوگ پچھلے جنم میں نیکو کار تھے وہ دوسرے جنم میں آرام وآسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بدکار افراد نامناسب اور مشکل زندگی گزارتے ہیں۔ آواگون کا عقیدہ۔ جس کے پیرو ہمیشہ تاریخ میں موجود رہے ہیں۔ ہندومت کا ایک اصول مانا جاتا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اگر انسانی ارواح مجموعی طور پر اور ہمیشہ آواگون کے چکر میں رہیں تو پھر معاد کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جبکہ معاد سے مربوط عقلی اور نقلی دلائل کی روسے، اس پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ حقیقت میں کہنا چاہئے کہ آواگون کا اعتقاد رکھنے والے اصل میں معاد کی صحیح صورت کو نہ سمجھ سکے، اس لئے آواگون کو اس کی جگہ پر تسلیم کرلیا ہے۔ اسلام کے مطابق تناسخ کفر ہے اور ہمارے عقائد کی کتابوں میں اس کے بطلان اور عقائد اسلامی کے منافی ہونے کے سلسلے میں مفصل بحث ہوئی ہے، کہ ہم یہاں پر اس کا خلاصہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ موت کے وقت انسان کی روح درجہ ءکمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اس بناء پر روح کا دوبارہ جنین میں حلول کرنا۔ جو روح بدن کے درمیان قانون ہماہنگی کے برخلاف اور مرحلہ کمال سے نقص کی طرف اور مرحلہ ءفعلیت سے دوبارہ مرحلہ بالقوہ کی طرف تنزل ہے۔ قانون خلقت (یعنی

موجودات کا بالقوہ سے بالفعل کی طرف کمال کا سفر) سے ٹکراؤ اور تضاد رکھتا ہے۔(۱)

۲۔اگر اس امر کو قبول کریں کہ روح بدن سے جدا ہونے کے بعد ایک دوسرے زندہ بدن میں حلول کرتی ہے، تو اس سے یہ لازم آئیگا کہ ایک بدن میں متعدد ارواح ہوں اور ایک شخصیت میں دوگانگی پائی جائے گی۔ یہ امر انسان کے اپنے احساس و وجدان کے منافی ہے جو ایک شخصیت کا مالک ہے(۲)۔

۳۔تناسخ (آواگون) کا عقیدہ نظام خلقت کائنات کے فطری قانون کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ، ظالموں اور مطلب پرست عناصر کیلئے ایک اچھا ہتھکنڈا بن سکتا ہے تا کہ وہ اپنے موجودہ جنم کی آرام و آسائش والی زندگی کو گذشتہ جنم کے نیک اعمال کا سبب بتائیں اور مظلوموں کی بدبختی کو ان کے پچھلے جنم کے گناہوں کا نتیجہ کہیں۔ اس طرح اپنی بدکرداری اور ظلم کی پردہ پوشی اور توجیہ کریں۔

۱۰۰ ویں اصل:

مسئلہ تناسخ کی بحث کے خاتمہ پر ضروری ہے کہ دو سوالات کے جواب دیدیں:

سوال ۱: قرآن مجید صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ گذشتہ امتوں میں مسخ ہونے کے چند واقعیات رونما ہوئے ہیں اور اس طرح کچھ انسان سور اور بندر کی شکل میں تبدیل ہوئے ہیں۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ جَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَ خَنَازِيرَ﴾ (مائدہ/۶۰)

۱۔یہ امر قابل ذکر ہے کہ انسانی روح قیامت کے دن کامل بدن میں داخل ہوگی لہٰذا روح کے جنین میں دوبارہ داخل ہونے کے مفروضہ اور کامل بدن میں داخل ہونے کے درمیان بڑا فرق ہے۔

۲۔کشف المراد، علامہ حلی، مقصد دوم، فصل چہارم، مسئلہ ہشتم، اسفار، صدر المتألہین ۹/۱۰۔

''اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور بنادیا ہے''۔(۱)

پس اگر تناسخ باطل ہے تو مسخ کیسے رونما ہوا؟

جواب: مسخ اور تناسخ میں بنیادی فرق ہے۔ تناسخ میں روح اپنے بدن سے جدا ہونے کے بعد دوسرے بدن یا جنین میں داخل ہوتی ہے۔ لیکن مسخ میں، روح بدن سے جدا نہیں ہوتی، بلکہ صرف بدن کی شکل وصورت بدل جاتی ہے تاکہ بدکردار انسان اپنے آپ کو بندر اور سور کی شکل میں پاکر رنج والم میں محسوس کرے۔

دوسرے الفاظ میں بدکردار انسان کی روح مقام انسانیت سے مقام حیوانیت میں تنزل نہیں کرتی ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو مسخ شدہ انسان اپنے اعمال کی سزا کے عذاب کو محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن مجید مسخ کو گنہگار افراد کی عبرت اور سزا کے طور پر بیان کرتا ہے(۲)۔

اس سلسلے میں تفتازانی کہتے ہیں:

''تناسخ کی حقیقت یہ ہے کہ انسانی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد اسی دنیا میں تدبیر وتصرف کی غرض سے دوسرے بدن میں داخل ہوتی ہے، اس میں بدن کی صورت وشکل تبدیل نہیں ہوتی ہے۔ جبکہ مسخ میں بدن کی شکل وصورت تبدیل ہوجاتی ہے۔(۳)

علامہ طباطبائی لکھتے ہیں:

''مسخ شدہ انسان ایسے انسان ہوتے ہیں، جن کی صورت مسخ ہوتی ہے اور ان کی روح وہی اپنی روح ہوتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ ان کی روح بھی مسخ ہوتی ہو اور بندر کی روح میں تبدیل ہوجاتی ہو۔(۴)

۱۔اس کے علاوہ سورہ اعراف کی ۱۶۶ ویں آیت بھی ملاحظہ ہو۔

۲۔﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾(بقرہ/۶۶)''اور ہم نے اس جنسی تبدیلی کو دیکھنے والوں اور بعد والوں کے لئے عبرت اور صاحبان تقویٰ کے لئے نصیحت بنادیا''۔

۳۔شرح مقاصد، تفتازانی:۳/۳۳۷۔

۴۔المیزان، طباطبائی ۱/۲۰۹

سوال۲: بعض مصنفین نے رجعت کو تناسخ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ کیا رجعت کا عقیدہ تناسخ کا لازمہ نہیں ہے؟

جواب: ہم مناسب جگہ پر اس موضوع کی وضاحت کریں گے، اکثر امامیہ شیعہ علماء کے عقیدہ کے مطابق رجعت کا مفہوم یہ ہے کہ اہل ایمان اور اہل کفر میں سے بعض افراد آخری زمانہ میں ایک بار پھر اس دنیا میں لائے جائیں گے۔ اور ایسے افراد کی واپسی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مردوں کے زندہ ہونے جیسی ہے، یا حضرت عزیز (آل عمران:۴۹) کے ایک سو سال کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے مانند ہے۔ اس لئے رجعت کا عقیدہ تناسخ کے مسئلہ سے کوئی ربطہ نہیں رکھتا اور ہم رجعت کی بحث میں اس موضوع پر مزید گفتگو کریں گے۔

۱۱۱ویں اصل:

علماء نے قرآن مجید کی پیروی میں ''اشراط الساعۃ'' کے نام سے ایک مسئلہ پر بحث کی ہے، جس سے مراد قیامت کی نشانیاں اور علامتیں ہیں۔ قیامت کی علامتیں دو قسم کی ہیں:

الف: وہ حوادث جو قیامت واقع ہونے سے پہلے نظام خلقت میں تغیر وتبدیل کی صورت میں پیدا ہوں گے اور ان کے وقوع کے وقت ابھی انسان زمین پر زندگی گزارتے ہوں گے۔ ''اشراط الساعۃ'' کا کلمہ اکثر و بیشتر ان ہی حوادث سے متعلق ہے۔

ب: وہ حوادث جو نظام خلقت کے نابود ہونے کا باعث بن جائیں گے، ایسے حوادث کا ذکر بیشتر قرآن مجید کے سورہء ''تکویر''، ''انفطار''، ''انشقاق'' اور ''زلزلہ'' میں ہوا ہے۔

پہلی قسم کے علائم کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت۔ (سورہء محمدؐ:۱۸)

۲۔ یاجوج وماجوج کی روکاوٹ اور سدّ کا ٹوٹنا۔ (کہف:۹۸و۹۹)

۳۔ غلیظ دھویں کا آسمان پر چھا جانا۔ (دخان:۱۰۔۱۶)

۴۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا۔ (زخرف:۵۷۔۶۱)

۵۔زمین کے اندر سے ایک (عجیب وغریب) مخلوق کا نکلنا۔ (نمل:۸۲)

ان علائم کی وضاحت تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔دوسری قسم کے حوادث اور علائم کی تفصیل بھی قرآن مجید میں ''حالات کے بدلنے'' اور سورج، چاند، سمندر، پہاڑ اور زمین وآسمان کے نابود ہونے کی شکل میں بیان ہوئی ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کے موجودہ نظام کا خاتمہ ہوجائے گا۔اور ایک دوسرا نظام وجود میں آئیگا اور یہ خدا کی قدرتِ تامہ کا مظہر ہوگا، جیسا فرماتا ہے:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (ابراہیم ۴۸)

''اس دن جب زمین دوسری زمین میں تبدیل ہوجائیگی اور آسمان بھی بدل دیے جائیں گے اور سب خدائے واحد وقہار کے سامنے پیش ہوں گے''۔

۱۱۲ ویں اصل:

قرآن مجید میں ''نفخ صور'' کے نام سے ایک حادثہ کا ذکر ہوا ہے کہ یہ حادثہ دوبار واقع ہوگا:

الف: پہلی مرتبہ صور پھونکنے کے نتیجہ میں آسمانوں اور زمین پر موجود تمام جاندار مرجائیں گے (سوائے ان کے جنھیں خداوند متعال زندہ رکھنا چاہے)۔

ب: دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے نتیجہ میں مردے زندہ ہوجائیں گے اور خدا کی بارگاہ میں حاضر کئے جائیں۔(۱)

۱۔﴿یہ آیہ مبارکہ:إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ﴾اسی سورہ کی آیت ۵۱ کی وضاحت کرتی ہے کہ اس میں صور کے پھونکنے کی حقیقت بیان ہوئی ہے کہ:﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ﴾اور مذکورہ پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے صور کا پھونکنا ایک فریاد کی صورت میں ہوگا کہ اس کے بعد سب کے سب اپنی قبروں سے نکل کر ہماری بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

جیسا کہ فرماتے ہیں:

﴿وَنُفِخَ فِی الصُّورِ فَصَعِقَ مَن فِی السَّمٰوٰتِ وَمَن فِی الْأَرْضِ إِلَّا مَن شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ﴾ (زمر/۶۸)

''اور جب صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان کی تمام مخلوقات بیہوش ہوکر گر پڑیں گی علاوہ ان کے جنھیں خدا بچانا چاہے۔اس کے بعد دوبارہ صور پھونکا جائیگا تو سب کھڑے ہوکر دیکھنے لگیں گے''۔

قرآن مجید قیامت کے دن انسانوں کے حشر ونشر کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ﴾ (قمر/۷)

''مردے اپنی قبروں سے پراگندہ ٹڈیوں کے مانند باہر آئیں گے''۔

۱۱۳ویں اصل:

مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے اور میدان قیامت میں داخل ہونے کے بعد بہشت و دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے چند امور انجام پائیں گے جن کے بارے میں قرآن مجید اور احادیث نے خبر دی ہے:

۱۔لوگوں کے اعمال کے حساب وکتاب کی ایک خاص طریقے سے تحقیق کی جائے گی۔اس عمل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر انسان کے ہاتھ میں اس کا نامہ اعمال دیا جائے گا۔(اسراء:۱۳۔۱۴)

۲۔اس کے علاوہ کہ ہر فرد کے نامہ عمل میں اس کے تمام چھوٹے بڑے اعمال درج ہونے کے ساتھ ساتھ قیامت کے دن کچھ بیرونی نیز اس کے اپنے وجود کے گواہ بھی دنیا میں اس کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

بیرونی گواہ حسب ذیل ہوں گے:

خدا(آل عمران:۹۸)، ہر امت کا اپنا پیغمبر (نحل:۸۹)، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و

آلہ وسلم (نساء:۴۱)، امت اسلامیہ کی منتخب شخصیتیں (بقرہ:۱۴۳)، فرشتے (ق:۱۸) اور زمین (زلزلہ:۳۔۵)۔

انسان کے وجود کے داخلی گواہ حسب ذیل ہوں گے:

انسان کے اپنے اعضاء وجوارح (نور:۲۴، فصلت:۲۰۔۲۱) اور خود اعمال کا تجسم ہونا (توبہ:۳۴۔۳۵)۔

۳۔ جو کچھ بیان ہوا اس کے علاوہ انسان کے اعمال کو تولنے کے لئے عدل وانصاف کی ترازوئیں بھی ہوں گی اور جو جس چیز کا مستحق ہوگا بیشک اسے پائے گا۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ﴾ (انبیاء/۴۷)

''اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازوئیں قائم کریں گے اور کسی نفس پر ادنیٰ ظلم نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی کا عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہے تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم سب کا حساب کرنے کے لئے کافی ہیں''۔

۴۔ اسلامی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کے دن ایک عام راستہ ہوگا جس سے ہر ایک کو گذرنا ہوگا۔ روایات کی اصطلاح میں اس راستہ کا نام ''صراط'' ہے۔ مفسرین نے سورہء مریم(۱) کی آیۃ ۷۱ و۷۲ کو بھی اس کی دلیل قرار دیا ہے۔

۱۔ ﴿وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا. ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا﴾ ''اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جسے جہنم کے کنارے حاضر نہ ہونا ہو کہ یہ تمہارے رب کا حتمی فیصلہ ہے۔ اس کے بعد ہم متقی وپرہیزگار افراد کو نجات دیدیں گے اور ظالمین کو جہنم میں ڈال دیں گے''۔)

۵۔ بہشتیوں اور جہنمیوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہے جسے قرآن مجید نے ''حجاب'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے علاوہ قیامت کے دن کچھ عظیم شخصیتیں ایک اونچی جگہ پر بیٹھی ہوئی بہشتیوں اور جہنمیوں کو ان کے چہروں سے پہچانتی ہوں گی۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

﴿ وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الاعراف رجالٌ يعرفون كلابسيمٰهم ﴾

''اور ان کے درمیان پردہ ڈالدیا جائے گا اور اعراف پر کچھ لوگ ہوں گے جو سب کو انکے چہروں سے پہچان لیں گے''۔

۶۔ جب لوگوں سے حساب وکتاب لینے کا کام مکمل ہوگا اور لوگوں کی قسمت واضح ہوجائے گی تو خالق کائنات حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں ایک پرچم دیدیگا، جس کا نام ''لواء الحمد'' ہوگا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہشتیوں کے آگے آگے بہشت کی طرف بڑھیں گے(۱)۔

۷۔ احادیث میں آیا ہے کہ میدان محشر میں ایک بڑا حوض ہوگا جو حوض کوثر کے نام سے مشہور ہے۔ پیغمبر اسلام سب سے پہلے اس حوض پر پہنچیں گے اور امت کے نجات یافتہ افراد، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ہاتھوں اس حوض سے سیراب ہوں گے۔

۱۴اویں اصل:

قیامت کے دن شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اسلام کے مسلّم عقائد میں سے ہے جو اذن الٰہی سے انجام پائے گی۔ یہ شفاعت ان افراد کے بارے میں ہوگی جنہوں نے

۱۔ بحار الانوار ج۸، باب ۱۸، احادیث ۱۔۱۲، مسند احمد ۱/۲۸۱، ۲۹۵، ۳/۱۴۴۔

دین اور خدا سے کلی طور پر رشتہ نہ توڑا ہو اور شفاعت کی لیاقت رکھتے ہوں۔ ایسے افراد، کچھ گناہوں کی آلودگی کے باوجود، شفاعت کرنے والوں کی سفارش کی بدولت دوبارہ رحمت الٰہی کے حقدار ہوں گے۔ شفاعت کا عقیدہ قرآن اور احادیث سے لیا گیا ہے جس کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

الف۔ قرآن میں شفاعت:

قرآن مجید کی آیات، قیامت کے دن شفاعت کے وجود کی خبر دیتی ہیں۔ یہ مقدس کتاب، شفاعت اور اس کے اذنِ الٰہی کے تحت ہونے کے بارے میں یوں وضاحت فرماتی ہے:

﴿وَلَایَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَیٰ﴾ (انبیاء/۲۸)

''اور وہ (شفاعت کرنے والے) کسی کی سفارش نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا اس کو پسند کرے''

ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:

﴿مَامِنْ شَفِیعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ﴾ (یونس/۳)

''کوئی اسکی اجازت کے بغیر شفاعت کرنے والا نہیں ہے''۔

اس لحاظ سے قرآن کے مطابق شفاعت (اذن اور رضائے الٰہی کے تحت) ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ شفاعت کرنے والے کون ہیں؟

بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتے شفاعت کرنے والے ہیں، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَاتُغْنِي شَفٰعَتُهُمْ شَيْـًٔا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللّٰهُ لِمَن يَشَآءُ وَيَرْضَىٰٓ﴾ (نجم/۲۶)

''اور آسمان میں کتنے ایسے فرشتے ہیں جن کی سفارش کسی کام نہیں آ سکتی

ہے جب تک کہ خدا۔جس کے بارے میں چاہے اور اسے پسند کرے۔

اس کی اجازت نہ دیدے''۔

مفسرین آیۂ ﴿عَسَیٰ أن یَبعَثَکَ رَبُّکَ مَقَاماًمحمو داً﴾ (اسراء/۷۹) ''عنقریب آپ کا پروردگار اس طرح آپ کو مقام محمود تک پہنچادے گا''۔کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ''مقام محمود'' کا مقصد مقام شفاعت ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے(۱)۔

ب۔روایات میں شفاعت:

قرآن مجید کے علاوہ احادیث کی کتابوں میں بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے بارے میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں،جن میں سے بعض کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

۱۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انّماشفاعتی لاھل الکبائر من امتی(۲)

''میری شفاعت میری امت کے ان افراد سے مخصوص ہے جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہیں''۔

بظاہر اس شفاعت کا گناہان کبیرہ کے مرتکب افراد سے مخصوص ہونے کا سبب یہ ہے کہ خداوندکریم نے صراحت کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ اگر انسان گناہان کبیرہ سے اجتناب کرے تو اسے بخش دیگا۔(نساء/۳۱) پھر اس صورت میں شفاعت کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔

۲۔نیز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أعطیت خمسًاوأعطیت الشفاعة فادّخرتھاالامتی فھی لمن لایشرک باللہ(۳)

۱۔المیزان ۱۹۱/۱۳۔۱۹۲،مجمع البیان ۵۴۹/۱۰۔

۲۔شیخ صدوق،من لا یحضرہ الفقیہ ۳۷۶/۳۔

۳۔خصال شیخ صدوق،ابواب پنجگانہ،حدیث صحیح بخاری ۴۲/۱،مسند احمد ۳۰۱/۱۔

''خداوندمتعال کی طرف سے مجھے پانچ نعمتیں عطاہوئی ہیں۔ان میں سے ایک شفاعت ہے۔میری شفاعت ان لوگوں کے حق میں ہوگی جوکسی کوخدا کا شریک قرار نہ دیں''۔

قیامت کے دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ شفاعت کرنے والوں (جیسے ائمہ معصومین،علماء اور شہداء)نیز ان کے ذریعہ شفاعت پانے والوں سے متعلق جاننے والوں کو چاہئے کہ وہ عقائد کلام اور حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔

اس ضمن میں،اس امر کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ شفاعت کے عقیدہ کو-توبہ قبول ہونے کے عقیدہ کی طرح-لوگوں کے لئے گناہ کے ارتکاب میں گستاخی کا سبب نہیں ہونا چاہئے،بلکہ اس امید کی ایک کرن سمجھ کر عفووبخشش کی امید سے راہ راست پر آنا چاہئے۔اوران ناامیدوں کی طرح نہ ہونا چاہئے جو پانی سر سے اونچا سمجھ کر صحیح راستے پر آنے کی فکر چھوڑ دیتے ہیں۔

مذکورہ بیان سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ شفاعت کا نمایاں اثر بعض گناہکاروں کی بخشش ومعافی ہے،اس لحاظ سے اس کا اثر صرف شفاعت ہونے والوں کے درجات میں ترقی نہیں ہے،جیسا کہ بعض اسلامی فرقے (معتزلہ وغیرہ) کہتے ہیں۔

۱۵ویں اصل:

جیسا کہ ہم نے بیان کیا،آخرت میں اذن الٰہی کے تحت شفاعت کی بیناد کا عقیدہ اسلام کے مسلّمہ عقائد میں سے ہے اور کسی کو اس میں تغیر وتبدیل کا حق نہیں ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس دنیا میں بھی شفاعت کرنے والوں،جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شفاعت کی درخواست کی جاسکتی ہے،اور دوسرے الفاظ میں کیا صحیح ہے کہ ہم یہ کہیں:

''اے رسول!خدا کے حضور میرے حق میں شفاعت کیجئے''

(یاوجیھًا عنداللہ اشفع لنا عنداللہ)

اس کے جواب میں کہنا چاہئے: آٹھویں صدی ہجری تک شفاعت کی مشروعیت پر مسلمانوں کے درمیان اتفاق نظر تھا۔لیکن آٹھویں صدی کے آدھے حصے کے بعد چند گنے چنے افراد اس کی مخالفت میں اٹھے اورانہوں نے اسے ناجائز قرار دیدیا،جب کہ قرآن مجید کی آیات،معتبر احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمین کی مسلسل سیرت اس کے جائز ہونے کے گواہ ہیں، کیونکہ شفاعت کرنیوالوں کی شفاعت،درحقیقت ان کی وہی دعا ہے جو وہ افراد کے حق میں کرتے ہیں۔اور مؤمنین سے دعا کی درخواست کرنا کسی شک وشبہہ کے بغیر ایک جائز اوراحسن کام ہے چہ جائیکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعا کی درخواست کرنا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ابن عباس کی ایک حدیث اس بات کی روشن دلیل ہے کہ مومن کی شفاعت،دوسرے لوگوں کے حق میں اس کی دعا ہے:

مامن رجل مسلم یموت فیقوم علی جنازتہ اربعون رجالًا لایشرکون باللہ شیئاًالاشفعھم اللہ فیہ(۱)

"اگر کوئی مسلمان مرجائے اورچالیس مؤمن موحد اس کے جنازے پر نماز پڑھیں،تو خدا ان کی شفاعت کواس کے حق میں قبول کرلیتا ہے"۔

کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ نماز جنازہ کے دوران چالیس مؤمنین کی شفاعت اس میت کے حق میں ان کی دعا کے سوا کچھ اورنہیں ہے۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شفاعت کی درخواست کرتے تھے۔ترمذی،انس بن مالک سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انس نے کہا:

۱۔صحیح مسلم،۳/۵۴۔

''میں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ قیامت کے دن میری شفاعت فرمائیں''۔

پیغمبر خدا نے فرمایا:

''ایسا ہی کروں گا''۔

میں نے عرض کی:

''آپ کو قیامت کے دن کہاں پاؤں گا؟''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''پل صراط کے کنارے پر''۔(۱)

شفاعت کی درخواست، حقیقت میں شفیع سے دعا کی درخواست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔عصر انبیاء میں اس کے چند نمونہ قرآن مجید سے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

۱۔حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے ان کے ظلم کے فاش ہونے کے بعد اپنے باپ سے درخواست کی کہ وہ خدا سے ان کی بخشش کی سفارش کریں۔حضرت یعقوب نے بھی انکی درخواست قبول کی اور اپنے وقت پر اس پر عمل کیا۔(۲)

۲۔قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ولو أنّھم اذظلموا انفسھم جاؤک فاستغفرو اللہ و استغفر لھم الرسول لوجدو اللہ توابًا رحیمًا﴾

''کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا تو آپ کے پاس آتے اور خود بھی اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے اور رسول بھی ان

۱۔"سالت النبی ان یشفع لی یوم القیامۃ فقال أنا فاعل،قلت فاین اطلبک؟فقال علی الصراط" صحیح ترمذی ۴/۴۲،باب ماجاء فی شأن الصراط.

۱۔یوسف:۹۷﴿قَالُوا یَٰأَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَآ إِنَّا كُنَّا خَٰطِئِينَ. قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيٓ﴾.

کے حق میں استغفار کرتا تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے“۔

۳۔اسی طرح منافقین کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ﴾ (منافقون/۵)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ تمہارے حق میں استغفار کریں گے تو سر پھرا لیتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ تکبر کی بنا پر منہ بھی موڑ لیتے ہیں“۔

ظاہر ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استغفار درحقیقت وہی طلب شفاعت ہے اور چونکہ طلب استغفار کی مخالفت نفاق اور استکبار کی علامت ہے، لہٰذا قدرتی طور پر اسکی انجام دہی بھی خدا کے حضور ایمام وخضوع کی علامت ہوگی۔اور چونکہ اس بحث سے ہمارا مقصد شفاعت کی درخواست کے جائز ہونے کو ثابت کرنا ہے لہٰذا ان آیات کے مطابق شفیع کا زندہ نہ ہونا مقصد کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتا۔حتیٰ اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ آیات صرف زندہ لوگوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں نہ کہ مردوں کے لئے پھر بھی اس سے ہمارے مقصود کو نقصان نہیں پہنچاتا، کیونکہ اگر زندوں سے شفاعت کی درخواست شرک نہیں ہے تو، قدرتی طور مردوں سے شفاعت کی درخواست بھی شرک نہیں ہوگی، اسلئے کہ شفیع کی حیات وموت شرک وتوحید کی بنیاد نہیں ہے اور جو چیز ارواح سے درخواست شفاعت کے وقت ضروری ہے وہ ان کی قوت سماعت ہے کہ ہم توسل کی بحث کے سلسلے میں اس کی وضاحت کریں گے اور مذکورہ رابطے کے وجود اور فائدہ کو بھی ثابت کریں گے۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مؤمنین وموحدین کی، پیغمبروں اور اولیائے خدا سے شفاعت کی درخواست اور بت پرستوں کی بتوں سے شفاعت کی درخواست کے درمیان

آسمان وزمین کا فرق ہے۔ کیونکہ موحدین ومؤمنین دو بنیادی مطالب کے اقرار کے ساتھ اولیائے الٰہی سے شفاعت کی درخواست کرتے ہیں:

ا۔ شفاعت کا مقام ومرتبہ ایک ایسا مرتبہ ہے جو صرف خدا سے مربوط ہے اور اسی کے اختیار میں ہے، جیسے قرآن فرماتا ہے:

﴿قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا﴾ (زمر/۴۴)

''کہہ دیجئے کہ شفاعت کا تمام تر اختیار اللہ کے ہاتھوں میں ہے''

اور یا:

﴿مَنْ ذَاالَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّابِإِذْنِهِ﴾ (بقرہ/۲۵۵)

''کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے''

۲۔ شفاعت کرنے والے۔ جن کی طرف موحدین ومؤمنین درخواست کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ خدا کے مخلص بندے ہوتے ہیں کہ بارگاہ الٰہی میں تقرب کی وجہ سے ان کی دعا قبول ہوتی ہے۔

مذکورہ دو شرائط کی بناء پر عصر بعثت میں شفاعت کے بارے میں موحدین اور مشرکین کے درمیان بنیادی فرق واضح ہو جاتا ہے:

اول یہ کہ: مشرکین شفاعت کے نفاذ کے سلسلے میں کسی قسم کے قید وشرط کے پابند نہیں تھے۔ گویا خدا نے اپنا حق اندھے اور گونگے بتوں کو بخشد یا ہے، جبکہ موحدین، قرآن کی رہنمائی کے مطابق مقام شفاعت کو صرف خدا کا حق سمجھتے تھے اور شافعین کی شفاعت کو اذن ورضائے الٰہی پر منحصر سمجھتے تھے۔

دوسرے یہ کہ: عصر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشرکین اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کو ''ربّ'' اور ''الٰہ'' سمجھتے تھے اور اپنی حماقت وبیوقوفی کی وجہ سے تصور کرتے تھے کہ یہ بے جان موجودات ربوبیت اور الوہیت کے ایک حصے کے مالک ہیں، جبکہ موحدین ومؤمنین پیغمبروں، اور اماموں علیہم السلام کو خدا کے مقرب بندے سمجھتے ہوئے اس امر کا برابر اقرار کرتے ہیں

کہ:"...عبدہ ورسولہ" و "...عباداللہ الصالحین" ان دونوں میں آسمان وزمین کافرق ہے۔

اس لحاظ سے قرآن مجید کی ان آیات کے ذریعہ، جن سے مشرکین کی بتوں سے شفاعت کی نفی ہوتی ہے، اسلام میں اصل شفاعت کی نفی کرنا ایک کھلم کھلا مغالطہ اور بے اساس قیاس کے علاوہ کچھ اور نہ ہوگا۔

۱۱۶ویں اصل:

گناہگار بندوں پر توبہ کا دروازہ کھلا رہنا، اسلامی تعلیمات بلکہ تمام آسمانی ادیان کی تعلیمات میں شامل ہے۔ جب گناہگار بندہ سنجیدگی سے اپنی بدکرداری پر نادم وپشیمان ہوجاتا ہے، تو اس کی روح اسے خداوند متعال کی طرف توجہ اور بارگاہ رب العزت میں تضرع وزاری کرنے پر آمادہ کردیتی ہے اور وہ دل کی گہرائیوں سے فیصلہ کرتا ہے کہ دوبارہ گناہ کا مرتکب نہ ہوگا اور خداوند کریم بھی اسکی توبہ کو۔ کلام اور تفسیر کی کتابوں میں درج شدہ شرائط کے تحت۔ قبول کرلیتا ہے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿وَتُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (نور/۳۱)

''تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے رہو کہ شاید اسی طرح تمہیں فلاح اور نجات حاصل ہوجائے گی''۔

جو لوگ توبہ کے تربیتی اور تہذیبی آثار اور شفاعت کے اعتقاد سے آگاہ نہیں ہیں، یہ تصور کرتے ہیں کہ ان دو دروازوں کا گنہگاروں کے لئے کھلا رہنا، ان کے گناہوں کے لئے ایک قسم کی حوصلہ افزائی ہے جبکہ وہ حقیقت میں اس نکتہ سے غافل ہیں کہ زیادہ تر انسان بہر حال کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بہت کم ایسے انسان پائے جاتے ہیں جو اپنی پوری زندگی میں گناہ کے نزدیک نہ گئے ہوں۔ اسلئے اگر باب توبہ (وشفاعت) لوگوں پر کھلا نہ ہوتو وہ افراد جو چاہتے

ہیں کہ اپنی باقی عمر میں گناہ سے پرہیز کرکے طہارت و پاکی کا راستہ اختیار کرلیں وہ پھر اپنے آپ سے مخاطب ہوکر کہیں گے: ''ہم نے جو گناہ کئے ہیں اس کی سزا ہمیں بہرصورت ملے گی اور ہم جہنّم میں ڈالدئے جائیں گے۔ لہٰذا اب کیوں نہ باقی عمر میں بھی اپنی نفسانی خواہشات کو پورکرکے ناجائز دنیوی لذتوں سے بہرہ مند ہوتے رہیں؟'' اس طرح توبہ کا دروازہ بند ہونے کی صورت میں رحمت الٰہی سے یأس وناامیدی کے گہرے کنوئیں کا منہ کھلا جاتا ہے جو انسانوں کو اژدھے کی طرح نگلتا رہتا ہے۔

توبہ کے مثبت اثرات اس وقت واضح ہوتے ہیں جب ہم جان لیں کہ توبہ قبول ہونے کے لئے اسلام نے کچھ شرائط رکھے ہیں جن پر دین کے پیشواؤں اور علوم اسلامی کے محققین نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ قرآن مجید واضح الفاظ میں توبہ کے بارے میں یوں فرماتا ہے:

﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوٓءَ ا بِجَهَٰلَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌرَّحِيمٌ﴾ (انعام/۵۴)

''تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم قرار دے لی ہے کہ تم میں جو بھی ازروئے جہالت برائی کرے گا اور اس کے بعد توبہ کرکے اپنی اصلاح کرے گا تو خدا بہت زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے''۔

۱۰۷ویں اصل:

عقل اور احادیث اس امر کے گواہ ہیں کہ قیامت کے دن ہر انسان اپنے نیک اعمال کی جزاء پائے گا۔ قرآن اس سلسلے میں بیان فرماتا ہے:

﴿فَمَنْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًايَرَه﴾ (زلزلہ/۷)

''پھر جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھے گا''

پھر فرماتا ہے:

﴿وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ. ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ﴾

(نجم/۴۱۔۴۰)

''اور اس کی کوشش عنقریب اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی اس کے بعد اسے پورا پورا بدلا دیا جائے گا''۔

مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے برے اعمال اس کے نیک اعمال کو نابود نہیں کر سکتے۔ ساتھ ہی یہ بھی جاننا چاہئے کہ (کفر و شرک جیسے) بعض ایسے خاص گناہ ہیں جن کے مرتکب ہونے یا ارتداد کا راستہ اختیار کرنے سے انسان کے اعمال برباد ہو جاتے ہیں اور اس طرح اس کے نیک اعمال نابود ہو جاتے ہیں اور وہ قیامت کے دن ابدی عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

﴿وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (بقرہ/۲۱۷)

''اور جو بھی اپنے دین سے پلٹ جائیگا اور کفر کی حالت میں مر جائیگا اس کے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور وہ جہنمی ہوگا اور وہیں ہمیشہ رہے گا''۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا اس کے مطابق ہر مؤمن دوسری دنیا میں اپنے نیک و بد اعمال کی جزا و سزا پائے گا۔ لیکن ارتداد اور اس جیسے گناہ۔ جن کا قرآن واحادیث میں ذکر ہوا ہے۔ اس کے نیک اعمال نابود اور برباد ہونے کے سبب بن جاتے ہیں۔

آخر میں اس نکتے کی یاد دہانی ضروری ہے کہ خداوند متعال نے مؤمنین کے نیک کاموں کی پاداش و جزا کا ''وعدہ'' کیا ہے اور اس کے مقابلے میں بدکاریوں کی سزا کے طور پر ''وعید'' ہے، لیکن عقل کے حکم کے مطابق ان دو۔ ''وعدہ'' و ''وعید''۔ میں فرق ہے۔ ''وعدہ'' پر عمل کرنا ایک

عقلی اصول ہے اور اس کی خلاف ورزی قبیح ہے۔ لیکن ''وعید'' کے بارے میں ایسا نہیں ہے۔ چونکہ سزا دینا، سزا دینے والے کا حق ہے اور وہ اپنے حق سے دست بردار بھی ہوسکتا ہے، اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کہ بعض نیک کام برے کاموں کی پردہ پوشی کرتے ہوں۔ اس کام کو اصطلاح میں ''تکفیر'' کہتے ہیں۔(۱)

قرآن مجید میں بعض نیک اعمال کو برے اعمال کی ''تکفیر'' کا سبب جانا گیا ہے کہ ان میں سے ایک انسان کا گناہان کبیرہ سے دوری اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿إِن تَجْتَنِبُواْ كَبَآئِرَ مَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا.﴾ (نساء/۳۱)

''اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمہیں روکا گیا ہے، پرہیز کرلو گے تو ہم دوسرے گناہوں کی پردہ پوشی کریں گے اور تمہیں باعزت منزل تک پہنچا دیں گے''۔

توبہ(۲) اور پوشیدہ طور صدقہ (۳) دینا وغیرہ بھی اسی قسم کا اثر رکھتے ہیں۔

۱۱۸ویں اصل:

جہنم میں تا ابد عذاب میں مبتلا رہنا، کافروں کے لئے مخصوص ہے، اور گناہگار مؤمنین۔ جن کی روحیں توحید سے منور ہیں۔ کے لئے بخشش اور آگ سے نجات کا راستہ بند نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللهَ لَايَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَادُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ وَيُشْرِكْ بِاللهِ فَقَدِافْتَرَىٰٓ إِثْمًا عَظِيمًا﴾ (نساء/۴۸)

۱۔ کشف المراد، ص ۴۳، مقصد ۶، مسئلہ ۷۔

۲۔ تحریم/۸

۳۔ بقرہ/۲۷۱۔

''اللہ اس بات کو معاف نہیں کرسکتا کہ اس کا شریک قرار دیا جائے اور اس کے علاوہ جس کو چاہے بخش سکتا ہے اور جو بھی اس کا شریک بنائیگا اس نے بہت بڑا گناہ کیا''۔

مذکورہ آیت جو واضح طور (شرک کے علاوہ) تمام گناہوں کی بخشش کے ممکن ہونے کی خبر دیتی ہے، یقیناً ایسے افراد کے اعمال پر ناظر ہے جو توبہ کے بغیر مرجاتے ہیں۔ کیونکہ توبہ کی صورت میں تمام گناہ۔ حتیٰ شرک۔ معاف ہوجاتے ہیں اور چونکہ آیت میں مشرک وغیر مشرک کے درمیان فرق بیان ہوا ہے۔ اس لئے یہ آیت ان افراد کی بخشش پر دلالت کرتی ہے جو توبہ کے بغیر مرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا انسان مشرک ہو تو اس کو نہیں بخشا جائیگا۔ لیکن اگر وہ مشرک نہ ہو تو اس کے لئے مغفرت کی امید و مژدہ موجود ہے۔ لیکن قطعی طور پر نہیں بلکہ ''لمن یشاء'' کی شرط کے ساتھ۔ یعنی ایسے ہی افراد کی مغفرت ہوگی کہ خداوند عالم کا ارادہ اور اس کی مشیت جن کے شامل حال ہو۔

''لمن یشاء'' کی شرط جو مذکورہ آیت میں ذکر ہوئی ہے (اور خداوند تعالیٰ کی وسیع رحمت کو بیان کرتی ہے) درحقیقت گنہگاروں کو ''خوف'' و ''رجاء'' کے درمیان قرار دیکران کو خطرے سے بچنے کے لئے توبہ کی ترغیب دیتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ وعدہ انسان کو دوخطروں یعنی ''یأس'' و ''تجرّی'' سے بچا کر صراط مستقیم پر آگے بڑھنے کی ہمت بخشتا ہے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

ولایخلّد اللہ فی النار الّا اھل الکفر و الجحود و اھل الضلالۃ و الشرک.(۱)

''خداوند متعال کفار اور مشرکین کے علاوہ کسی کو ہمیشہ کے لئے آتش جہنم میں نہیں رکھے گا''۔

۱۔ بحار، ج ۸، باب ۲۷، حدیث ۱۔

بالآخر انسان اپنے نیک اعمال کی جزاء پائے گا جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَه﴾

''پھر جس شخص نے ذرّہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھے گا''۔

۱۱۹ویں اصل:

ہمارا اعتقاد ہے کہ جنت و جہنّم اس وقت بھی موجود ہیں شیخ مفید'' اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''جنت اور جہنّم اس وقت موجود ہیں، ان کے وجود پر احادیث گواہ ہیں اور فقہائے اسلام اس پر اتفاق نظر رکھتے ہیں''(۱)۔

قرآن مجید کی آیات بھی ایک طرح سے جنت و جہنّم کے اس وقت موجود ہونے کے سلسلے میں گواہی دیتی ہیں۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ . عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ. عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ﴾ (نجم/۱۳۔۱۵)

''اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرشتہء وحی کو ایک بار پھر سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک دیکھا۔ جس کے قریب جنت الماویٰ بھی ہے''۔

دوسری جگہ پر مؤمنین کو مژدہ دیتے اور کفار کو انتباہ کرتے ہوئے اعلان ہوتا ہے کہ جنت پرہیزگاروں کے لئے اور جہنم کفار کے لئے آمادہ ہے، جیسا کہ جنت کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (آل عمران/۱۳۳)

''اور اسے ان صاحبان تقویٰ کے لئے مہیّا کیا گیا ہے''۔

۱۔ اوائل المقالات، ص ۱۴۱۔

اور جہنم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ﴾ (آل عمران/۱۳۱)

''اور اس آگ سے بچو جو کافرین کے لئے مہیا کی گئی ہے''۔

اس کے باوجود جنت اور جہنم کی جگہ ہمارے لئے پوری طرح واضح نہیں ہے۔ صرف چند آیات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جنت اوپر والے حصے میں واقع ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ﴾ (ذاریات/۲۲)

''اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جن باتوں کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ سب کچھ موجود ہے''۔

نواں حصہ

کلیات عقائد

ایمان، کفر، بدعت،

تقیہ، توسل، بدا و۔۔۔

ایمان وکفر

۱۲۰ ویں اصل:

ایمان وکفر کی بحث کلامی موضوعات میں سے ایک اہم بحث ہے۔لغت میں ''ایمان'' تصدیق کے معنی میں اور ''کفر'' چھپانے کے معنی میں ہیں۔اس لحاظ سے کاشتکار۔جو گندم کے بیج کو مٹی کے نیچے چھپاتا ہے۔کو بھی کافر کہتے ہیں۔لیکن عقائد وعلم کلام کی اصطلاح میں ایمان کا مقصد، خدا کی وحدانیت پر ایمان، قیامت کے دن پر یقین اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر اعتقاد ہے۔البتہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان کے دائرے میں دیگر انبیاء الٰہی، گذشتہ آسمانی کتابوں اور ان تعلیمات واحکام پر یقین بھی شامل ہے جنھیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر کے لئے لائے ہیں۔

ایمان کا اصلی اور حقیقی مرکز انسان کا دل ہے۔جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الإِيمَانَ﴾ (مجادلہ/۲۲)

''اللہ نے صاحبان ایمان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے''۔

اس کے علاوہ صحرائی زندگی بسر کرنے والوں کے بارے میں۔جنھوں نے اسلام کی عظمت وطاقت کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے لیکن ان کے دل ایمان کے نور سے خالی تھے۔فرماتا ہے:

﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ (حجرات/۱۴)

''ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے''۔

لیکن بہر حال ایک شخص کے ایمان کی شرط یہ ہے کہ وہ زبان یا کسی اور طریقے سے اس کا اظہار واقرار کرے یا کم از کم اپنے یقین کا انکار نہ کرے۔ کیونکہ دوسری صورت میں اسے مؤمن نہ کہا جائے گا۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ﴾ (نمل/۱۴)

''آیات خدا کو ان لوگوں نے یقین کے باوجود انکار کر دیا''۔

مذکورہ بیان سے کفر کی حدود واضح ہو جاتی ہیں لہٰذا اگر کوئی شخص خدا کی وحدانیت، قیامت کے دن یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالات کا انکار کرے تو وہ مسلّم طور سے کافر ہوگا۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے مسلّمات میں سے کسی ایک کا انکار۔ جس سے واضح طور انکار رسالت لازم آتا ہو۔ بھی ارتکاب کفر کا باعث ہوگا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت علی علیہ السلام کو قلعہء خیبر فتح کرنے کے لئے روانہ کیا تھا تو ان کے ہاتھ میں ایک پرچم دے کر فرمایا تھا:

''اس پرچم کو اٹھانے والا خیبر کو فتح کر کے ہی لوٹے گا''

اس وقت حضرت علی علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر سوال کیا تھا:

''اُن کے ساتھ جنگ کی حد کیا ہے؟''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

قاتلهم حتىٰ يشهدوا لا اله إلّا الله و انّ محمّدًا رسول الله فاذا فعلوا ذٰلك فقد منعوا منك دمائهم واموالهم الّا بحقّها و حسابهم علىٰ الله

''ان کے ساتھ تب تک جنگ جاری رکھو جب تک وہ خدا کی وحدانیت اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کی گواہی دے دیں۔ اگر انہوں نے یہ گواہی دیدی تو ان کا خون و مال محترم رہے گا۔ ورنہ (اگر مارے گئے اور ان کا مال غنیمت میں لیا گیا تو) ان کا حق وحساب خدا کے ساتھ ہے''۔ (۱)

اس کے علاوہ ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا:

''وہ کمترین چیز جو بندے کے خدا پر ایمان کا سبب ہے، کیا ہے؟''

امام علیہ السلام نے جواب دیا:

یشهد ان لااله الاالله وانّ محمدًا عبده ورسوله ويقر بالطاعة و يعرف امام زمانه فاذا فعل ذلک فهو مؤمن(۲)

''کم ترین درجہ ایمان یہ ہے کہ وحدانیت خدا اور رسالت حضرت محمد مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی دے اور خدا کی اطاعت کا اقرار کرے اور اپنے زمانے کے امام کو پہچان لے۔ اگر ایسا کیا تو وہ مؤمن ہے''۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب ایمان، ص ۱۰، صحیح مسلم، ج ۷، باب فضائل علی علیہ السلام، ص ۱۷۔

۱۔ بحار الانوار ۶۶/۱۶، کتاب ایمان وکفر، بہ نقل از معانی الاخبار شیخ صدوق روایت کی سند صحیح ہے۔

۱۲۱ ویں اصل:

اگر چہ ایمان کی حقیقت وہی دلی اعتقاد ہے، لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ایمان کی یہی مقدار انسان کی نجات کے لئے کافی ہے، بلکہ انسان کو چاہئے کہ ایمان کے آثار اور اس کی عملی ضروریات کا بھی پابند ہو۔ لہٰذا بہت سی آیات اور احادیث میں حقیقی مؤمن اسے کہا گیا ہے کہ جو ایمان کے آثار اور الٰہی فرائض وواجبات کو انجام دینے کا پابند ہو۔ چنانچہ قرآن مجید نے سورہ ''عصر'' میں تمام انسانوں کو نقصان اٹھانے والوں میں شمار کیا ہے اور ان سے درج ذیل گروہ کو الگ قرار دیا ہے:

﴿إِلَّا الَّذِينَ ءَامَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّلِحَٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (عصر/۳)

''علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کئے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت ونصیحت کی''۔

امام محمد باقر علیہ السلام حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ان سے سوال کیا:

''کیا ہر وہ انسان جو صرف خدا کی وحدانیت اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیدے، مؤمن ہے؟''

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

فاين فرائض الله؟

پس خدا کے فرائض کہاں گئے؟''

امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا:

لو كان الايمان كلاماً لم ينزل فيه صوم ولا صلاة ولا حلال ولا حرام.

''اگر ایمان کے لئے صرف شہادتیں پڑھنا کافی ہوتا تو پھر روزہ ونماز اور

حلال وحرام کے شرعی احکام کی ضرورت ہی نہ ہوتی"۔(۱)

ہم مذکورہ بیان سے نتیجہ لیتے ہیں کہ ایمان کے مختلف درجے ہیں اور ہر درجہ ایک خاص اثر رکھتا ہے۔ دلی اعتقاد کے ساتھ اس کا اظہار یا کم از کم عدم انکار، ایمان کا کم ترین درجہ ہے کہ دینی ودنیوی آثار کا ایک سلسلہ اس پر مرتب ہوتا ہے جبکہ ایمان کا ایک اور درجہ، جو انسان کے لئے دنیا وآخرت میں نجات کا سبب بنتا ہے، ایمان کے عملی آثار کا پابند ہونا ہے۔

قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ بعض روایتوں میں دینی فرائض کی انجام دہی کو بھی ارکان ایمان میں شمار کیا گیا ہے۔

امام رضا علیہ السلام اپنے اجداد علیہ السلام سے اور وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الایمان معرفة بالقلب واقرارٌ باللسان وعمل بالارکان.(۲)

"ایمان، معرفت قلبی، زبانی اقرار اور اعضاء وجوارح کے ذریعہ اس پر عمل ہے"۔

بعض روایتوں میں شہادتین کے ساتھ ساتھ، کچھ امور، جیسے نماز قائم کرنے، زکات کی ادائیگی، فریضہ حج کی انجام دہی اور ماہ رمضان کے روزوں کی پابندی کی قید بھی بیان ہوئی ہے ایسی روایتیں یا اس بات کی ناظر ہیں کہ ان اعمال کے ذریعہ مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان تمیز کی جاسکے یا یہ کہ شہادتیں کا پڑھنا اسی صورت میں نجات بخش ہے جب اس کے ساتھ اعمال شرعی بھی انجام پائیں۔ ان اعمال میں نماز، زکات، حج اور روزہ اہم اور سر فہرست ہیں۔

۱۔ کافی ۳۳/۲، حدیث ۲۔

۲۔ صحیح بخاری: ۱۶/۱، کتاب الایمان: شهادة ان لااله الاالله وان محمدرسول الله واقامة الصلاة ایتاء الزکاة والحج وصوم رمضان۔

لہٰذا مذکورہ دو اصل کے تحت مسلمانوں کے کسی فرقہ کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے فرقہ پر صرف اسلئے کہ وہ بعض فروع دین میں آپسمیں اختلاف رکھتے ہوں، کفر کا حکم لگائیں۔ کفر کا معیار یہ ہے کہ انسان اصول سہ گانہ میں سے کسی ایک کا منکر ہو یا کسی ایسی چیز کا منکر ہو جو ان تین اصولوں میں سے کسی ایک کے انکار کا لازمہ ہو اور یہ لازمہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ اس چیز کا حکم شرعی لحاظ سے اس قدر بدیہی اور نا قابل انکار ہو کہ اس کے انکار اور کسی ایک اصول کے اعتراف کو باہم جمع نہ کیا جا سکے۔

اس لحاظ سے مسلمان سزاوار ہیں کہ تمام مراحل میں اسلامی برادری واخوت کی حفاظت کریں اور جو اختلافات اصول سے مربوط نہیں ہیں، ان کو جھگڑے کا سبب یا ایک دوسرے کی تفسیق وتکفیر کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ آپسی فکری اور اعتقادی اختلافات میں بھی علمی گفتگو اور تحقیق پر اکتفا کریں اور خشک و بے منطقی تعصبات، تہمتوں اور تحریفات سے پرہیز کریں۔

۱۲۲ ویں اصل:

چونکہ تمام مسلمان اصول(۱) سہ گانہ پر متفق ہیں، لہٰذا کسی فرقہ کو، چند اصول یا فروعی مسائل پر اختلاف کی وجہ سے کسی دوسرے فرقہ کے خلاف کفر کا حکم نہیں دینا چاہئے، کیونکہ بہت سے اختلافی اصول کلامی مسائل کا جزء ہیں جو بعد میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان مورد بحث قرار پائے ہیں اور ہر فرقہ اپنے لئے دلائل رکھتا ہے۔ لہٰذا ایسے مسائل میں موجود اختلاف ہرگز اس امر کا سبب نہیں بن سکتا کہ ایک دوسرے کے خلاف کفر وفسق کا حکم جاری کیا جائے اور اسلامی وحدت کو درہم برہم کیا جائے۔ باہمی اختلافات کو حل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خشک اور غیر منطقی تعصبات کو چھوڑ کر کھلے دل سے علمی گفتگو کی جائے۔

۱۔ وہ اصول جن کو قبول یا انکار کرنا ایمان وکفر سے وابستہ ہے، جیسے خدا کی وحدانیت، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور قیامت پر ایمان کی شہادت دینا۔

قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَاالَّذِینَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا ضَرَبْتُمْ فِی سَبِیلِ اللهِ فَتَبَیَّنُواْ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَیٓ إِلَیْکُمُ السَّلَٰمَ لَسْتَ مُؤمِنًا﴾ (نساء/۹۴)

''اے ایمان والو جب تم راہ خدا میں سفر کرو تو (مؤمن و کافر کی) تحقیق میں دقت سے کام لو اور خبردار جو اسلام کی پیشکش کرے اس سے یہ نہ کہنا کہ تو مؤمن نہیں ہے''۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے اصول بیان فرماتے ہوئے یہ یاد دہانی فرمائی ہے کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو، کسی گناہ میں مرتکب ہونے کے سبب کافر یا مشرک کہے۔(۱)

۱۔ لاتکفرواهم بذنب ولاتشهدوا علیهم بشرک، کنزالعمال: ج۱، ح۳۰۔

بدعت

۱۲۳ویں اصل:

لغت میں ''بدعت'' کے معنی کسی نئے اور انوکھے کام کی انجام دہی ہے، جو فاعل کے ایک قسم کے حسن وکمال کی دلیل ہوتی ہے۔ چنانچہ خدا کے صفات میں سے ایک صفت ''بدیع'' بھی ہے۔ ''بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ. (بقرہ/ ۱۱۷) ''۔

''بدعت'' کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی ایسی چیز کو شریعت سے منصوب کرے جو شریعت کا جزء نہ ہو۔ بدعت کی مختصر ترین تعریف یہ ہے:

''إدخال مالیس من الدین فی الدین''

جو چیز دین میں نہیں ہے اسے دین میں داخل کرنا۔

دین میں بدعت گزاری گناہان کبیرہ میں سے ہے اور اس کے حرام ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کلّ محدثة بدعة و کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار (۱)

''دین میں ہر قسم کا تصرف بدعت ہے، ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے''۔

۱۔ بحار الانوار: ۲/ ۲۶۳، مسند احمد ۴/ ۱۲۶۔ ۱۲۷

مسئلہ ''بدعت'' میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اس کی تعریف اس طرح بیان کی جائے کہ مفہوم جامع و مانع ہو، تا کہ بدعت کو غیر بدعت سے تمیز دی جا سکے۔ اس سلسلے میں بدعت کی حقیقت کو درک کرنے کے لئے درج ذیل دو باتوں پر توجہ کرنا ضروری ہے:

ا۔ ''بدعت'' کا مفہوم شریعت میں کمی یا بیشی کر کے دین میں تصرف کرنا ہے۔ اس لحاظ سے اگر کوئی نئی ایجاد جو دین سے ربط نہ رکھتی ہو، بلکہ ایک عرفی و عادی عنوان سے انجام پائی ہو، تو وہ بدعت نہیں ہے (اگر چہ اس کے جائز ہونے کی شرط یہ ہے کہ یہ نئی ایجاد شرع میں حرام اور ممنوع نہ ہو)۔ مثال کے طور پر، انسان، رہائش، لباس اور زندگی کے دیگر وسائل میں مسلسل نئی نئی ایجادات کرتا ہے، خاص طور پر عصر جدید میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ مثال کے طور پر جدید ورزشیں اور تفریحی مشغلے ایجاد ہوئے ہیں۔ بدیہی ہے کہ یہ سب (لغوی معنی میں) ایک قسم کی بدعت ہیں، لیکن شرعی و اصطلاحی بدعت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایسی ایجادات کا جائز و حلال ہونا اور ان سے استفادہ کرنا، اس شرط پر ہے کہ یہ امور احکام و موازین شرع کے خلاف نہ ہوں۔ مثلاً زن مرد کا ایک ساتھ اور بے پردہ مجالس و محافل میں شرکت کرنا۔ جو مغربی تمدن کا فاسد تحفہ ہے۔ حرام ہے، لیکن بدعت نہیں ہے، کیونکہ جو لوگ ایسی محافل میں شرکت کرتے ہیں، اس کام کو ایک جائز طور پر جس کی اسلام نے تائید کی ہے، انجام نہیں دیتے، بلکہ یہ جانتے ہوئے کہ یہ ایک خلاف شرع کام ہے، بے اعتنائی کی وجہ سے اتفاقاً اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لہٰذا بعض اوقات عبرت حاصل کر کے یہ قطعی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ایسی محفلوں میں شرکت سے پرہیز کریں گے۔

مذکورہ مطلب کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی قوم کسی خاص دن یا چند ایام کو اپنے لئے جشن و شادی کے طور پر معین کرے اور اس دن اجتماع اور محفل کا اہتمام کرے، لیکن اس نیت

سے نہیں کہ شرع نے اس قسم کا کوئی حکم دیا ہے، بلکہ عام طور سے وہ جشن منائے تو یہ بدعت نہیں ہے، اگر چہ خود اس کام کے حلال یا حرام ہونے کے سلسلے میں دوسرے پہلوؤں سے تحقیق کرنا لازم ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی بہت سی ایجادات جو وہ ہنر، ورزش اور صنعت وغیرہ کے شعبوں میں انجام دیتا ہے، اصطلاحی بدعت کی قلمرو سے خارج ہیں۔ اور جو کچھ ان کے سلسلے میں قابل بحث ہے وہ ان کا حلال یا حرام ہونا ہے، جس کے لئے دیگر پہلوؤں سے تحقیق کی جاتی ہے اور اس کے اپنے معیار اور پیمانے ہوتے ہیں۔

۲۔ شرع میں ''بدعت'' کی کسوٹی یہ ہے کہ کسی چیز کو شرعی فعل کے عنوان سے انجام دیا جائے جبکہ اسکی مشروعیت کے سلسلے میں کوئی شرعی اصول یا دستور موجود نہ ہو۔ لیکن اگر انسان کسی کام کو ایک دینی کام کے طور پر انجام دے اور اس کی مشروعیت اور جواز کی کوئی شرعی دلیل (دلیل خاص، کلی، یا عام) موجود ہو تو یہ کام بدعت نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں عظیم شیعہ عالم دین علامہ مجلسیؒ کہتے ہیں:

> **البدعة فی الشرع ماحدث بعد الرسول (بما انّه من الدین) و لم یکن فیه نص علی الخصوص ولایکون داخلافی بعض العمومات.** (۱)
>
> ''شریعت میں ''بدعت'' وہ چیز ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ایجاد ہوئی ہو اور اس کے جواز میں کوئی خاص یا عام دلیل شرعی موجود نہ ہو''۔

۱۔ بحار الانوار: ۷۴/۲۰۲۔

اہل سنت کے مشہور دانشور ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں:

البدعة ماحدث وليس له اصل في الشرع،وما كان له اصل يدلّ عليه الشرع فليس بدعة.(۱)

''بدعت وہ چیز ہے جو (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد) ایجاد ہوئی ہو اور اس کے جواز میں کوئی شرعی دلیل نہ پائی جاتی ہو۔اور جس چیز کی دین میں کوئی اصل موجود ہو وہ بدعت نہیں ہے''۔

جی ہاں اگر کسی کام کو شریعت سے نسبت دی جائے اور اس سلسلے میں شریعت میں کوئی دلیل خاص یا قاعدہء کلّی موجود ہو، تو یقیناً یہ چیز بدعت نہیں ہوگی۔پہلی صورت (دلیل خاص) کے بارے میں وضاحت کی ضرورت نہیں۔لیکن دوسری صورت (دلیل عام یا کلی) کے بارے میں وضاحت ضروری ہے، چونکہ ممکن ہے ایک کام ظاہراً نئی ایجاد ہو اور تاریخ اسلام میں یہ کام انوکھا ہو، لیکن مفہوم کے لحاظ سے ایک قاعدے کے تحت ہو جسکی شریعت اسلامی نے عموی اور کلی طور تائید کی ہو۔مثال کے طور سے نوجواں کی فوجی ٹریننگ، جو آج کل زیادہ تر ممالک میں رائج ہے۔یہ موضوع یعنی جوانوں کو فریضہ کے طور پر فوجی ٹریننگ کی دعوت دینا، اگر چہ ایک نئی ایجاد ہے، لیکن چونکہ اس کے پیچھے ایک دینی اصول اور قاعدہ کلّی کی تائید ہے اسلئے بدعت نہیں ہے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾ (انفال/۶۰)

''اور تم سب ان کے مقابلے کے لئے امکانی قوت کا انتظام کرو''۔

بدیہی ہے کہ موجودہ عالمی تغییرات اور تحولات کے پیش نظر جوانوں کی فوجی ٹریننگ گھات میں بیٹھے ہوئے دشمنوں کے مقابلے میں بہتر آمادگی کا سبب بن سکتی ہے اور اس زمانے میں مذکورہ آیہء شریفہ پر عمل کا تقاضا بھی یہی ہے۔

۱۔فتح الباری:۱۵۶/۵، ۹/۱۷۔

مذکورہ بیان سے بعض لوگوں کے درمیان پھیلے ہوئے بہت سے بے بنیاد شک وشبہات دور ہوجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر عالم اسلام میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یوم پیدائش پر ''عید میلاد النبی'' کے عنوان سے جشن وسرور کی محفلیں منعقد کرتی ہے اور ایک گروہ سے مربوط افراد اس کام کو بدعت جانتے ہیں، حالانکہ مذکورہ اصول وقواعد کے تحت اس کام پر ہرگز بدعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر یہ فرض بھی کیا جائے اس قسم کا احترام واظہار محبت شریعت میں نہیں آیا ہے، پھر بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام سے اظہار محبت ایک مسلم اسلامی اصول ہے اور اس قسم کے جشن وسرور اور مذھبی اجتماعات اس کلّی اصل کے مظہر ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لایؤمن احدکم حتیٰ أکون أحبَّ الیه من ماله واهله والناس اجمعین.(۱)

''تم لوگوں میں سے تب تک کوئی مؤمن نہ ہوگا جب تک وہ مجھے اپنے مال اپنی اولاد اور دیگر تمام لوگوں سے محبوب تر نہ سمجھے''۔

یہ امر واضح ہے کہ جو لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام میں سے کسی ایک کی ولادت پر اظہار مسرت وشادمانی کے لئے جشن اور محفلیں منعقد کرتے ہیں، ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہوتا ہے کہ ان ایام میں جشن کے پروگرام منعقد کرنا نص میں آیا ہے اور جس طریقے سے آجکل یہ جشن منائے جاتے ہیں بالکل اسی صورت میں شریعت نے حکم دیا ہے، بلکہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کے تئیں اظہار محبت ایک کلّی اصل ہے کہ کتاب وسنت میں اس کے بارے میں مختلف صورتوں سے ذکر ہوا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

۱۔ جامع الاصول: ۲۳۸/۱، اصل: ۱۳۱ میں ہم اس موضوع پر مفصل بحث کریں گے۔

﴿قُلْ لَّاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ (شوریٰ/۲۳)

''(اے رسول) آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا، علاوہ اس کے کہ میرے اقربا سے محبت کرو''۔

اور یہ (اصل) قاعدہ کلّی مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں گونا گوں جلوؤں کا حامل ہوسکتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کے ایام ولادت پر جشن ومسرت کی محفلیں منعقد کرنے میں، خدا کی طرف سے ایسے دنوں میں رحمت وبرکت کے نزول کے علاوہ اس میں خدا کا شکر بجالانے کا پہلو بھی مضمر ہے۔ ایسے امور گذشتہ ادیان الٰہی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کے واضح بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام خداوند کریم سے دعا کرتے ہیں کہ ان پر اور ان کے ساتھیوں پر مائدہ آسمانی نازل کرے تاکہ اس مائدہ کے نازل ہونے کے دن کو وہ اور ان کے پیرو نسل در نسل عید منائیں:

﴿قَالَ عِيسَىٰ ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَءَاخِرِنَا وَءَايَةً مِّنْكَ...﴾

(مائدہ/۱۱۴)

جیسا کہ ہم نے بیان کیا، ''بدعت'' دین میں ایسا تصرف کرنا ہے جس کی شریعت میں کوئی صحیح دلیل (خاص وعام) موجود نہ ہو اور یہاں پر یہ امر غور طلب ہے کہ حدیث متواتر ''ثقلین'' کی روسے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایتیں مصادر شریعت اور دینی احکام محسوب ہوتی ہیں، اس لحاظ سے اگر معصومین علیہم السلام کسی چیز کے جائز ہونے یا اس کے منع کا حکم دیں تو ان کے حکم کی پیروی، دین کی پیروی ہے اور یہ امر دین میں بدعت کے زمرے میں نہیں آتا۔

آخر میں اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ شریعت کی اجازت کے بغیر دین میں تصرف کے معنی میں بدعت کا مفہوم ہمیشہ کے لئے قبیح اور حرام ہے اور قرآن مجید اس سلسلے

میں یوں فرماتا ہے:

﴿ءَآللّٰہُ اَذِنَ لَکُم اَمْ عَلَی اللّٰہِ تَفتَرُونَ﴾ (یونس/۵۹)

''خدا نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے یا تم خدا پر افتراء کر رہے ہو؟''

اس صورت میں بدعت کو قبیح، حسن، حرام اور جائز کے مفہوم میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔

ہاں ''بدعت'' کو اس کے عام لغوی معنی میں، یعنی امور زندگی میں ہر نئی ایجاد یا نئے کام کو شریعت سے منسوب کئے بغیر احکام خمسہ (واجب، حرام، مکروہ، مستحب اور مباح) میں سے کسی ایک میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

تقیّہ

۱۲۴ویں اصل:

قرآنی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ اگر اظہار عقیدہ کی وجہ سے ایک مسلمان کی جان، مال اور عزت وآبرو خطرے میں پڑے تو ایسے مواقع پر وہ اپنے عقیدہ کو چھپا سکتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں اس کو "تقیہ" کہتے ہیں۔ تقیہ کے جائز ہونے کے بارے میں نہ فقط شرعی دلائل موجود ہیں، بلکہ عقلِ انسانی بھی حساس اور نازک حالات میں اس کے ضروری اور جائز ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ ایک طرف جان و مال اور عزّت وآبرو کی حفاظت ضروری ہے اور دوسری طرف عقیدہ کے مطابق عمل کرنا دینی فریضہ ہے۔ لیکن ایسے حالات میں جب عقیدہ کا اظہار اس امر کا باعث بنے کہ شخص کی جان، مال اور عزت وآبرو خطرے میں پڑ جائے، اور ان دو فریضوں کے درمیان تزاحم اور ٹکراؤ پیدا ہو تو طبیعی طور عقل کا حکم یہ ہے کہ اہم فریضہ کو دوسرے پر مقدم قرار دیا جائے۔ حقیقت میں "تقیہ" طاقتور اور بے رحم افراد کے مقابلے میں کمزوروں اور ضعیفوں کا ہتھیار ہے، ظاہر ہے کہ اگر کسی قسم کی دھمکی یا خطرے کا سامنا نہ ہو تو انسان نہ اپنے عقیدہ کو چھپاتا ہے اور نہ اپنے اعتقادات کے برخلاف عمل کرتا ہے۔

قرآن مجید عمار یاسر (اور ان لوگوں کے بارے میں جو کفار کے پنجہء ظلم میں پھنس کر دل میں ایمام رکھنے کے باوجود ظالموں سے نجات کے لئے بظاہر زبان پر کلمہ کفر جاری کرتے ہیں) کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ...﴾ (نحل/۱۰۶)

''جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلے (اپنے کرتوت کی سزا بھگتتا ہے)۔علاوہ اس کے جو کفر پر مجبور کردیا جائے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو.....''

ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللهِ الْمَصِيرُ﴾ (آل عمران/۲۸)

''خبردار صاحبان ایمان، مؤمنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور سرپرست نہ بنائیں کہ جو بھی ایسا کرے گا اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا مگر یہ کہ تمھیں کفار سے خوف ہو تو (ان کے شر سے نجات اور اپنی حفاظت کے لئے ایسا کرنے میں) کوئی حرج بھی نہیں ہے اور خدا تمھیں اپنی ہستی سے مخالفت کے لئے ڈراتا ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے''۔

اسلامی مفسرین نے مذکورہ دو آیتوں کی تشریح و تفسیر میں ''تقیہ'' کو ایک شرعی اصل مانا ہے(۱)۔اصولی طور پر ہر وہ شخص جو تفسیر اور اسلامی فقہ کے بارے میں ابتدائی معلومات بھی رکھتا ہو، اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ''تقیہ'' اسلام کی ایک اصل ہے اور مذکورہ بالا آیات

---

(۱) تفسیر طبری: ۱۵۲/۳، تفسیر رازی: ۱۳/۸ا تفسیر نسفی، تفسیر خازن کے حاشیہ میں: ۲۷۱/۱، روح المعانی: ۱۲۱/۳، مجمع البیان: ۳/....، ۴۳۰/۱)

نیز آل فرعون کے مؤمن کے اپنے عقیدے کو چھپا کر اس کے برعکس اظہار کرنے کے عمل (غافر/۲۸) سے چشم پوشی کر کے ''تقیہ'' سے بالکل انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس ضمن میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگر چہ تقیہ سے مربوط آیات کفار سے تقیہ کرنے پر دلالت کرتی ہیں، لیکن تقیہ کا معیار، نازک اور نامناسب حالات میں مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہی ہے اور یہ کفار سے مخصوص نہیں۔ اگر کسی شخص کا اظہار عقیدہ یا اس پر عمل کسی مسلمان کے سامنے بھی اسکی جان و مال کے لئے خطرے کا سبب بن جائے، تو اس حالت میں بھی تقیہ کا حکم وہی ہے جو کافر کے مقابلے میں ہے۔ یہ وہ بات ہے جس کی دیگر لوگوں نے بھی صراحت وتائید کی ہے۔ رازی کہتے ہیں:

''شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے درمیان آپس میں بھی ویسے ہی حالات رونما ہو جائیں، جیسے مسلمان اور کفار (حربی) کے درمیان ہوا کرتے ہیں، تو اس صورت میں بھی جان کی حفاظت کے لئے تقیہ جائز ہے۔ اسی طرح تقیہ تنہا جان کی حفاظت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مال کے نقصان وضرر کی صورت میں بھی تقیہ جائز ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے، کہ اس کا احترام وتقدس بھی مسلمانوں کے خون کے مانند ہے تو وہ شہید ہے(۱)''۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں:

''میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو قسم کی تعلیمات اور احکام وصول کئے، بعض احکام وتعلیمات کو میں نے لوگوں میں بیان کیا لیکن بعض کے بیان سے اجتناب کیا کیونکہ اگر ایسا کرتا تو مارا جاتا(۲)''۔

۱۔ تفسیر رازی: ۱۳/۸

۲۔ محاسن التأویل: ۸۲/۴

اموی اور عباسی خلفاء کے کارنامے ظلم وستم سے بھرے ہیں۔ظلم وبربریت کے اس دور میں نہ فقط شیعہ اپنے عقیدہ کے اظہار کے جرم میں عذاب وعتاب کا نشانہ بنتے تھے بلکہ مأمون کے زمانے میں سنّی محدثین نے بھی ''خلق قرآن'' کے مسئلے میں غالباً دامنِ تقیہ کو ہی تھاما اور صرف ایک شخص کے علاوہ تمام لوگوں نے ''خلق قرآن'' کے سلسلے میں جاری کردہ مأمون کے حکم نامہ پر اپنے دلی عقیدہ کے خلاف رضامندی کا اظہار کیا، جس کی کہانی تاریخ میں ثبت ہے (۱)۔

۱۲۵ویں اصل:

شیعوں کے نقطۂ نظر کے مطابق، تقیہ بعض حالات میں واجب لیکن بعض حالات میں حرام ہے اور اس صورت میں انسان کی جان و مال کو گزند پہنچنے کے ڈر سے تقیہ نہیں کرنا چاہئے۔ بعض لوگ تصور کرتے ہیں کہ شیعہ تقیہ کو مطلقاً واجب جانتے ہیں، جبکہ یہ تصور سراسر غلط ہے اور شیعوں کے اماموں کا ہرگز یہ طریقہ کار نہیں رہا ہے۔ کیونکہ وہ ہر زمانے میں حالات، مصلحتوں اور مفاسد کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک خاص اور مناسب راستے کا انتخاب کرتے تھے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بعض اوقات تقیہ نہ کرکے اپنے عقیدے کے اظہار کی راہ میں اپنی جان و مال کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا ہے۔

اصولی طور پر شیعوں کے ائمہء معصوم یا دشمن کی شمشیر یا زہر جفا کے ذریعہ درجہء شہادت پر فائز ہوئے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ حکام وقت کے ساتھ مصلحت کوشی سے پیش آتے تو حکام ان کو عالی ترین منصبوں پر فائز کرتے، لیکن وہ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ (مثال کے طور پر یزید جیسے شخص کے سامنے) تقیہ کرنا دین ومذہب کی نابودی کا باعث ہے۔

موجودہ حالات میں بھی مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کو دو قسم کے فریضے درپیش ہیں: بعض حالات میں تقیہ کے راستے کو اپنائیں اور بعض حالات میں، جب دین کی بنیادیں خطرات

۱۔تاریخ طبری ۷/۱۹۵۔۲۰۶۔

سے روبرو ہوں تو جان ہتھیلی پر لیکر موت کا استقبال کریں۔

آخر میں اس امر کی یاد دہانی ضروری ہے کہ: ''تقیہ'' ایک شخصی امر ہے اور ظالم و جابر دشمن کے مقابل کسی کمزور فرد یا ضعیف و ناتوان افراد سے مربوط ہے اور اگر یہ لوگ تقیہ نہ کریں تو ان کی جان بھی خطرے میں پڑے اور ان کا قتل ہونا بھی کسی قسم کا اثر نہ رکھتا ہو۔لیکن معارف اور احکام دین کے بیان اور تعلیم و تربیت میں تقیہ کسی طرح بھی جائز اور قابل قبول نہیں ہے، مثلاً ایک دانشور ایک کتاب کو تقیہ کی بنیاد پر لکھے اور منحرف و غلط عقائد کو شیعوں کے عقیدے کے طور پر معاشرے میں شائع کرے (یہ بالکل جائز نہیں ہے) اسی لئے ہم دیکھتے ہیں شیعوں کی پوری تاریخ میں، کسی بھی وقت عقائد و احکام کے موضوع پر کوئی کتاب تقیہ کی بنیاد پر نہیں لکھی گئی ہے، بلکہ شیعہ علماء نے سخت ترین حالات میں بھی حق پر مبنی اپنے عقیدے کا اظہار و بیان کیا ہے۔البتہ ممکن ہے علمائے شیعہ کے درمیان کسی اصول یا خاص مسئلہ پر نظریہ کا اختلاف ہو، لیکن پوری تاریخ میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ کسی شیعہ عالم نے تقیہ کے بہانے اس مذہب کے مسلّم عقائد کے خلاف کوئی مضمون یا کتاب لکھی ہو، یعنی دوسرے لفظوں میں وہ باہر کچھ کہیں اور خلوت میں کچھ اور، اگر کسی نے یہ طریقہ اختیار کیا ہو تو وہ فرقہ شیعہ امامیہ سے خارج ہے۔

یہاں پر میں ان افراد کی خدمت میں۔جن کے لئے تقیہ کا سمجھنا اور تسلیم کرنا سخت ہے اور جو دشمنان شیعہ کے تبلیغات سے متأثر ہیں۔تاکید کرتا ہوں کہ وہ خلافت بنی امیہ، خلافت بنی عباس اور حتیٰ خلافت عثمانیہ کے زمانے میں ترکی اور شام کے علاقوں میں شیعوں کی تاریخ کا جائزہ لیں، تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ اس فرقہ (شیعہ) نے اپنے عقائد اور اہل بیت علیہم السلام کی پیروی کے دفاع میں کتنی بڑی قیمت ادا کی ہے اور کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں، اور کتنے ظلم و ستم و مصائب برداشت کئے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھیں اپنے گھر بار چھوڑ کر جنگلوں پہاڑوں اور بیابانوں میں پناہ لینی پڑی۔تقیہ کی رعایت کرنے کے باوجود شیعوں پر یہ

حالت طاری ہوئی، اگر اس اصول کی رعایت نہ کرتے تو ان پر کیا گزرتی؟ حقیقتاً کیا اس صورت میں شیعیت کا نام ونشان بھی دنیا میں باقی رہتا؟

اصولاً یہ سوچنا چاہئے کہ، اگر تقیہ کے سلسلے میں کسی قسم کی مذمت یا ملامت ہے تو یہ ان کے لئے ہے جو تقیہ کرنے والوں کو ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس مذمت کے حقدار وہ لوگ ہیں جو اسلامی عدل وانصاف کے اجرا کے برعکس عاشقان ومحبان اہل بیت علیہم السلام کا قافیہ حیات تنگ کرکے انھیں سخت ترین اور جان لیوا سیاسی و مذہبی اذیت وآزار سے دوچار کرتے تھے، نہ کہ وہ لوگ جو مجبوری کے عالم میں اپنی جان و مال وعزت وعصمت کے تحفظ کے لئے تقیہ کا دامن پکڑتے تھے۔ حیرت اور ستم ظریفی یہ ہے کہ کچھ لوگ، تقیہ کے سبب بننے والوں یعنی ظالموں کی مذمت اور ملامت کرنے کے بجائے تقیہ کرنے والوں یعنی مظلوموں کی مذمت کرتے ہیں اور ان پر نفاق کی تہمت لگاتے ہیں، حالانکہ ''نفاق'' اور ''تقیہ'' کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے: منافق، کفر کو اپنے دل میں پنہاں کرکے ظاہر میں ایمان کا ڈھونگ رچاتا ہے، جبکہ مسلمان حالت تقیہ میں اپنے عقیدہ وایمان سے لبریز دل تو رکھتا ہے، لیکن صرف ظالم کے ناقابل برداشت ظلم وآزار کے خوف سے اپنے عقیدہ کے برخلاف اظہار عمل کرتا ہے۔

توسّل

۱۲۶ویں اصل:

انسانی زندگی، قدرتی وسائل واسباب سے استفادہ کرنے کی بنیاد پر برقرار ہے اوران میں سے ہرایک اپنے خصوصی اثرات کا حامل ہے۔ہم سب پیاس کی حالت میں پانی پیتے ہیں اوربھوک لگنے پر کھانا کھاتے ہیں۔حتیٰ قدرتی وسائل کے ذریعہ حاجت روائی۔بشرطیکہ ہم تأثیرگزاری میں ان کے مستقل ہونے کے قائل نہ ہوں۔عین توحید ہے۔قرآن مجید یاددہانی فرماتا ہے کہ ذوالقرنین نے بند تعمیر کرنے کے سلسلے میں لوگوں سے مدد کی درخواست کی:

﴿فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْماً﴾ (کہف/۹۵)

''اب تم لوگ (اپنی) طاقت سے میری مدد کروتا کہ میں تمہارے اوران کے درمیان ایک بند بنادوں''۔

جولوگ ''شرک'' کو''غیرخدا سے تعلق وتوسل'' کے معنی میں تفسیر کرتے ہیں،ان کی بات صرف اس صورت میں صحیح ہے کہ ہم موجودہ آلات ووسائل کے (وجودوعمل میں) ''اصالت واستقلال'' کے قائل ہوجائیں،ورنہ اگران وسائل کوہم ایسے عامل جانیں جومشیت اوراذن الٰہی سے ہمیں نتیجہ تک پہنچاتے ہیں توہم توحید کی راہ سے دورنہیں ہوئے ہیں۔اصولی طور پرانسان کی زندگی پہلے ہی دن سے اس بنیاد پر قائم رہی ہے کہ موجودہ وسائل وامکانات سے استفادہ

کرے، علم وصنعت میں ترقی بھی اسی اصول پر مبنی تھی اور آئندہ بھی رہے گی۔

ظاہری طور پر طبیعی وسائل سے توسل موضوع بحث نہیں ہے، بحث غیر طبیعی وسائل کے بارے میں ہے کہ انسان کے پاس ان کو پہچاننے کے لئے وحی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر کتاب وسنت میں کوئی چیز کا تعارف وسیلہ کے عنوان سے کیا گیا ہو تو اس سے توسل کرنے کا وہی حکم ہے جو طبیعی چیزوں سے توسل کرنے کا ہے۔ اس بنا پر ہم اسی وقت غیر طبیعی وسائل سے دینی جذبے کے ساتھ استناد کر سکتے ہیں جب درج ذیل دو مطلب کا لحاظ رکھا جائے:

۱۔ قرآن وحدیث کے ذریعہ اس چیز کا دنیوی واخروی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وسیلہ ہونا ثابت ہو جائے۔

۲۔ ہم اسباب ووسائل کے بارے میں کسی قسم کی اصالت یا استقلال کے قائل نہ ہوں بلکہ ان کے تأثیر کو اذن ومشیت الٰہی پر منحصر جانیں۔

قرآن مجید ہمیں معنوی وسائل سے استفادہ کرنے کی دعوت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِینَ ءَامَنُواْ اتَّقُوا اللهَ وَابْتَغُوٓا إِلَیْهِ الْوَسِیلَةَ وَجَـٰهِدُواْ فِی سَبِیلِهِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (مائدہ/۳۵)

''ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو کہ شائد اس طرح کامیاب ہو جاؤ گے''۔

جاننا چاہئے کہ وسیلہ بذات خود تقرب نہیں ہے بلکہ ایک ایسی چیز ہے جو خداوند متعال سے تقرب اور اس تک رسائی کا سبب ہے اور ان ہی میں سے ایک طریقہ خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے جو مذکورہ آیہء شریفہ میں ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی چیزیں تقرب الٰہی کا سبب بن سکتی ہیں۔(۱)

۱۔ راغب مفردات میں مادہ، وسل کے ضمن میں لکھتا ہے: الوسیلة التوصل الیٰ الشئی برغبة وحقیقة الوسیلة الیٰ اللہ مراعاة سبیله بالعلم والعباده وتحرّی مکارم الشریعه)

۱۲۷ویں اصل:

گذشتہ اصل میں ثابت ہوا کہ طبیعی اور غیر طبیعی وسائل سے توسل (بشرطیکہ وسیلہ قرار پانے والی چیز کے بارے میں ہم اس کی مستقل تاثیر کے قائل نہ ہوں) عین توحید ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کی راہ میں واجبات و مستحبات کی انجام دہی جیسے نماز، روزہ، زکات اور جہاد وغیرہ سب کے سب وسائل معنوی ہیں جو انسان کو اس کی منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں اور یہ منزل مقصود وہی خداوند متعال کا تقرب ہے۔ انسان ان اعمال کی شعاع میں، بندگی کی حقیقت کو پاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر خدا تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ غیر طبیعی وسائل صرف عبادی امور کے انجام دینے تک ہی محدود نہیں، بلکہ کتاب وسنت میں وسائل کا ایک سلسلہ بیان ہوا ہے جن سے توسل کرنے کا نتیجہ دعا کے قبول ہونے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، ذیل میں ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ خداوند عالم کے اسماء وصفات حسنہ سے توسل کرنا کتاب وسنت میں بیان ہوا ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا...﴾ (اعراف/۱۸۰)

''اور اللہ کے لئے بہترین نام ہیں لہٰذا اسے انہی کے ذریعہ پکارو''۔

اسلامی دعاؤں میں خدا کے اسماء اور صفات سے توسل کرنا بہت زیادہ وارد ہوا ہے۔

۲۔ اللہ کے نیک بندوں کی دعاؤں سے توسل کرنا کہ اس کی عالی ترین قسم انبیاء کرام علیہم السلام اور خدا کے خاص اولیائے عظام کی جناب میں توسل کرنا ہے، تاکہ وہ انسان کے لئے درگاہ الٰہی میں دعا کریں۔

قرآن مجید ان لوگوں کو، جنہوں نے اپنے آپ پر ستم کیا ہے (یعنی گناہگاروں) کو حکم دیتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن پکڑلیں خود بھی طلب مغفرت کریں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کے لئے خدا سے بخشش کی درخواست کریں۔ یہاں پر قرآن

یہ مژدہ دیتا ہے کہ وہ لوگ خداوند کریم کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پائیں گے، چنانچہ فرماتا ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا﴾ (نساء/۶۴)

''اور کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے خود بھی اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے حق میں استغفار کرتا تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے''۔

ایک دوسری آیت میں منافقین کی مذمت کرتے ہوئے ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جائیں تاکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے حق میں خدا سے طلب مغفرت کریں تو وہ اس حکم کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ﴾ (منافقون/۵)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ تمہارے حق میں استغفار کریں گے تو سر پھرا لیتے ہیں اور تم دیکھو گے کہ استکبار کی بنیاد پر منہ بھی موڑ لیتے ہیں''۔

بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کی سیرت کا رواج گذشتہ امتوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر قرآن کی صراحت کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے اپنے باپ سے درخواست کی کہ آپ خدائے تعالیٰ سے ان کے لئے طلب مغفرت کریں اور حضرت یعقوب نے بھی ان کی درخواست منظور کی اور استغفار کا وعدہ کیا:

﴿قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ. قَالَ سَوْفَ

أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيَ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (یوسف/۹۷۔۹۸)

''ان لوگوں نے کہا: باباجان اب آپ ہمارے گناہوں کے لئے استغفار کریں ہم یقیناً خطا کار تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ میں عنقریب تمہارے حق میں استغفار کروں گا کہ میرا پروردگار بہت بخشنے والا اور مہربان ہے''۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اللہ کے نیک بندوں کی دعا سے توسل کرنا اس صورت میں عین توحید (یا کم از کم مؤثر) ہے کہ جس سے توسل کرتے ہیں، وہ زندہ بھی ہو، لیکن اس وقت جبکہ انبیاء واولیاء دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، ان سے توسل کس طرح مفید اور عین توحید ہو سکتا ہے؟

اس سوال یا اعتراض کے جواب میں دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:

الف۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ نبی یا ولی خدا سے توسل کی شرط ان کی حیات ہے، تو اس صورت میں انبیاء واولیاء سے ان کے مرنے کے بعد توسل کرنا صرف ایک بے فائدہ کام ہوگا، شرک کا سبب نہ ہوگا۔ اور یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس سے اکثر وبیشتر غفلت برتی گئی ہے اور تصور کیا گیا ہے کہ موت وحیات، شرک وتوحید کی سرحد ہے۔ جبکہ ایسے مفروضہ کو قبول کرنے کی صورت میں (یعنی لوگوں کا انبیاء واولیاء علیہم السلام کی زندگی میں ان سے توسل کرنا) نبی یا ولی کا زندہ ہونا توسل کے مفید اور غیر مفید ہونے کا معیار تو ہوگا۔ توحید وشرک کی سرحد نہیں ہو سکتا اور نہ یہ عمل شرک آمیز ہو سکتا ہے۔

ب۔ توسل کے مؤثر اور مفید ہونے کی صرف دو شرطیں ہیں:

۱۔ جس شخص سے توسل کیا جاتا ہے صاحب علم وشعور اور صاحب قدرت ہو۔

۲۔ توسل چاہنے والے اور اس کے درمیان رابطہ برقرار ہو۔

انبیاء اور اولیائے الٰہی جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں، ان سے توسل میں مذکورہ دونوں شرائط (یعنی ادراک وشعور وعلم نیز ہمارے اور ان کے درمیان رابطے کا وجود) پائے جاتے ہیں، اور اس سلسلے میں واضح اور نا قابل انکار عقلی ونقلی دلائل موجود ہیں۔

برزخی زندگی کا وجود قرآن کے روشن اور یقینی مسائل میں سے ہے،اس کے دلائل ہم نے اصل ۱۰۵اور ۱۰۶میں بیان کیے ہیں۔قرآن کے صریح اور نا قابل انکار حکم کے مطابق راہ حق میں شہید ہونے والے حیات وزندگی کے مالک ہیں،تو یقیناً انبیاء اور اولیائے الٰہی۔جن میں سے بہت سے شہید بھی ہوئے ہیں۔بہتر زندگی کے مالک ہوں گے۔

ہمارے اور اولیائے الٰہی کے درمیان رابطے کے وجود کے سلسلے میں بہت سے دلائل موجود ہیں،جن میں سے بعض دلائل کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

۱۔تمام مسلمان نماز کے اختتام پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں:السلام علیک ایھاالنّبی ورحمة وبرکاته. کیا اس طرح مسلمان حقیقت میں ایک بیہودہ کام انجام دیتے ہیں اور کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام سلاموں کو نہیں سنتے اور جواب نہیں دیتے؟

۲۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ بدر میں حکم دیا کہ مشرکین کے اجساد کو جمع کر کے ایک چاہ میں ڈالدیا جائے۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان اجساد سے مخاطب ہوئے۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی نے سوال کیا: کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مردوں سے باتیں کررہے ہیں؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم ان سے بہتر نہیں سنتے (۱)

۳۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برابر قبرستان بقیع تشریف لے جاتے تھے اور قبرستان میں سوئی ہوئی ارواح سے یوں خطاب فرماتے تھے:

السلام علی اھل الدّیار من المؤمنین والمؤمنات.

اور ایک دوسری روایت کے مطابق فرماتے تھے:

السلام علیکم دار قوم مؤمنین.(۲)

۱۔صحیح بخاری،ج۵،باب قتل ابی جہل،سیرہ ابن ھشام:۲۹۲/۳ وغیرہ۔

۲۔صحیح بخاری،ج۲،باب مایقال عند دخولا لقبر.

۴۔امام بخاری نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے: جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت فرمائی ،ابوبکر عایشہ کے گھر میں داخل ہوئے۔اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جنازہ کی طرف بڑے،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے سے کپڑا اٹھا کران کا بوسہ لیا اور روتے ہوئے کہا:

بابی انت یانبیّ اللّٰہ لایجمع اللّٰہ علیک مؤتتین،أما الموتہ التی کتبت علیک فقدمتّھا(۱)

''اے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا باپ آپ پر فدا ہو،خدا نے آپ پر دو موتیں نہیں لکھی ہیں پس جو موت آپ پر لکھی گئی تھی،واقع ہوئی''۔

اگر رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برزخی حیات کے مالک نہ تھے اور ہمارے اور ان کے درمیان کسی قسم کا رابطہ باقی نہ تھا تو ابوبکر نے کیسے "یانبی اللّٰہ" کہہ کے خطاب کیا؟

۵۔امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل دے رہے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یوں مخاطب ہوئے:

بابی انت وامی یارسول اللّٰہ لقد انقطع بموتک مالم ینقطع بموت غیرک من النبوۃ والانباء واخبار السماء...بابی انت وامی اذکرنا عند ربّک واجعلنا من بالک.

''میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فدا ہوں یارسول اللہ آپ کی وفات سے وہ چیز ہم سے جدا ہوئی جو دوسروں کے مرنے سے نہیں ہوئی تھی،آپ کی وفات سے نبوت اور وحی کا سلسلہ ٹوٹ گیا.... میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فدا ہوں،خدا کے نزدیک،ہمارا ذکر کیجئے گا اور ہمیں یاد رکھئے گا''۔

آخر پر یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ انبیاء واولیاء الٰہی سے توسل کی مختلف صورتیں ہیں جن کا تفصیلی ذکر عقائد کی کتابوں میں موجود ہے۔

۱۔صحیح بخاری،ج۲،کتاب الجنائز،ص۱۷۔

بداء

۱۲۸ویں اصل:

انسان کے بارے میں تقدیر الٰہی دو قسم کی ہیں:

۱۔ حتمی و قطعی تقدیر، جو کسی صورت میں قابل تغیر نہیں ہوتی۔

۲۔ معلّق اور مشروط تقدیر، جو بعض حالات کے مفقود ہونے پر بدل جاتی ہے اور دوسری تقدیر اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

مذکورہ مسلّم اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ ''بداء'' اسلامی عقائد کے ان بنیادی اصولوں میں سے ہے جس کا اجمالی طور سے تمام اسلامی فرقے اعتقاد رکھتے ہیں اگر چہ ان میں سے بعض لوگ کلمہ ''بداء'' کو استعمال کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ لفظ ''بداء'' کو استعمال کرنے کا یہ خوف اصل مسئلہ کو کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچاتا کیونکہ اصل مقصد اس کا مفہوم بیان کرنا ہے نہ کہ نام کا ذکر کرنا۔

بداء کی حقیقت دو اصلوں پر قائم ہے:

الف۔ خداوند متعال ہستی پر قدرت اور مطلق تسلط رکھتا ہے اور وہ جب چاہے تو کسی تقدیر

کو دوسری تقدیر میں بدل سکتا ہے حالانکہ دونوں تقدیروں کے بارے میں وہ پہلے سے علم رکھتا تھا اور اس کے علم میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہیں ہوگا، کیونکہ پہلی تقدیر الٰہی ایسی نہیں ہے جو خدا کی قدرت کو محدود کرے اور اس میں تغیر پیدا کرنے کی طاقت کو سلب کرلے۔ خداوند متعال یہودیوں کے عقیدہ کے خلاف، جو کہتے تھے کہ "یَدُاللہ مغلولة" (خدا عاجز ہے) کے برخلاف وسیع قدرت کا مالک ہے اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس کے ہاتھ کھلے ہیں:

﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾ (مائدہ/۶۴)

"خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں"۔

دوسرے الفاظ میں، خداوند متعال کے ذریعہ تخلیق و آفرینش اور اس کی قدرت کے کارنامے جاری ہیں اور "کلَّ یوم هوفی شان" کے حکم کے تحت وہ تخلیق کے کام سے فارغ نہیں ہوا ہے اور خلقت کا کام یوں ہی جاری ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام آیہ شریفہ "قالت الیهود یدالله مغلولة..." کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یہودی کہتے ہیں کہ خداوند متعال تخلیق کے کام سے فارغ ہوگیا ہے۔ اب (رزق وعمر وغیرہ میں) کمی و زیادتی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خدا نے اس کی رد کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے:

﴿غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ (مائدہ/۶۴)

"اصل میں انھیں کے ہاتھ بندے ہوئے ہیں اور وہ اپنے قول کی بنا پر ملعون ہیں۔ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے"۔

اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أَلَمْ تسمع قول الله عزّوجل ﴿يَمْحُواللهُ مَايَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ اُمُّ الْكِتَابِ﴾ (رعد/۳۹)

''کیا تم نے خدائے تبارک وتعالےٰ کا یہ قول نہیں سنا ہے کہ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے یا برقرار رکھتا ہے کہ اصل کتاب (لوح محفوظ) اسی کے پاس ہے''۔

نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے عقیدہ کی بنیاد اس پر ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی وسیع طاقت، مطلق حکمرانی اور خلاقیت کا سلسلہ مستقل طور سے جاری ہے، اور خدا جب چاہے انسان کی تقدیر میں، جیسے عمر اور روزی وغیرہ میں تغیر وتبدیلی پیدا کرسکتا ہے اور پہلی تقدیر کی جگہ پر دوسری تقدیر کو قرار دے سکتا ہے اور یہ دونوں تقدیریں پہلے سے ام الکتاب (لوح محفوظ) میں درج ہو چکی ہیں۔

ب۔ خدائے متعال کی طرف سے اختیارات اور حکمرانی کا استعمال اور اس کی طرف سے کسی تقدیر کو دوسری تقدیر سے بدل دینا، حکمت و مصلحت کے بغیر انجام نہیں پاتا۔ اس قضیہ کا ایک حصہ انسان کی اپنی کارکردگی پر منحصر ہے کہ وہ اپنی شائستہ یا ناشائستہ زندگی کو اختیار کرکے اپنی تقدیر میں خود تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔

فرض کریں ایک انسان، خدانخواستہ، اپنے والدین اور اعزّہ کے حقوق کی رعایت نہیں کرتا ہے، نتیجہ میں یہ نامناسب عمل اس کی تقدیر پر ناخوشگوار اثرات ڈالے گا اور اگر کچھ مدت کے بعد وہ اپنی کارکردگی پر پشیمان ہو کر پھر سے اپنے فرائض پر عمل کرنا شروع کردے تو اپنی تقدیر میں دوبارہ تبدیلی کا سامان مہیا کرسکتا ہے اور اس آیہء کریمہ کے زمرے میں آسکتا ہے: یمحو الله مایشاء ویثبت۔ یہی قضیہ برعکس بھی ہوسکتا ہے۔

اس سلسلے میں بہت سی آیات وروایات موجود ہیں جن میں سے ہم بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ ﴿إِنَّ اللهَ لَايُغَيِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّىٰ يُغَيِّرُوامَابِأَنْفُسِهِمْ﴾ (رعد/۱۱)

''خدا کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے کو تبدیل نہ کرے''۔

۲۔﴿وَلَوْاَنَّ اَهْلَ الْقُرٰىٓ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَلٰكِن كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (اعراف/۹۶)

''اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین اور آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی گرفت میں لے لیا (یعنی ان کی بداعمالیوں کی بنا پر عذاب میں مبتلا کر دیا)''

۳۔سیوطی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ: امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیہء شریفہء ''یَمْحُو اللّٰہ مایشاء'' کے بارے میں سوال کیا تو اس کے جواب میں انحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں تم کو اور اپنی امت کو اس آیت کی تفسیر سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔خدا کی راہ میں صدقہ دینا، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اور نیک کام انجام دینا، بدبختی کو خوشبختی میں تبدیل کر دیتا ہے، عمر طولانی ہوتی ہے اور بری اموات سے بچنے کا سبب بھی ہے''(۱)۔

۴۔امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

''صلہ رحم انسان کے اعمال کو پاکیزہ کرتا ہے اور مال میں برکت کا سبب بنتا ہے۔اسی طرح بلاؤں کو دور کرتا ہے، حساب میں آسانی اور قضائے معلق کو ٹالنے کا سبب بنتا ہے''(۲)۔

۱۔الدر المنثور: ۳/۶۶۔

۲۔کافی: ۲/۴۷۰

مذکورہ دو اصل کے پیش نظر واضح ہوتا ہے کہ ''بداء'' پر اعتقاد اسلام کا ایک مسلم عقیدہ ہے۔ بداء کی تعبیر اور اصطلاح خاص سے صرف نظر کرتے ہوئے اسلام کے تمام فرقے اور مذاہب اس کے مفہوم پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

آخر میں، اس امر کی آگاہی کے لئے کہ اس اسلامی عقیدہ کو جملہ ''بداء اللہ'' سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے، اس سلسلے میں دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:

الف۔ اس کلمہ کے استعمال میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقلید کی گئی ہے۔ امام بخاری اپنی کتاب صحیح بخاری میں نقل کرتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین افراد، جو بَرَص، خارش اور اندھے پن کے شکار تھے ان کے بارے میں فرمایا: ''**بدا اللہ عز و جل ان یبتلیھم**'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی داستان کو از اول تا آخر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کس طرح خدائے متعال نے کفران نعمت کی وجہ سے ان میں سے دو افراد سے ان کی سلامتی سلب کر لی اور انھیں ان کے آباء و اجداد کے امراض میں مبتلا کر دیا(۱)۔

ب۔ اس طرح کا استعمال از باب مشاکلہ ہے یعنی لوگوں کی زبان میں گفتگو کرنا ہے۔ عربی عرف میں معمول ہے کہ جب کوئی اپنا فیصلہ بدلتا ہے تو کہتا ہے: ''بدالی'' میرے لئے بداء واقع ہوا۔ دین کے پیشواؤں نے بھی لوگوں کی زبان میں گفتگو کرنے کے طور پر اور مخاطبین کو مطلب اور مقصد سمجھانے کے لئے خدا کے بارے میں اس تعبیر کا استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں مکرر طور پر ذات باری تعالیٰ سے متعلق چند صفات ہیں جیسے مکر، کید، خدعہ و نسیان کی نسبت دی گئی ہے۔ جبکہ یہ امر مسلم اور یقینی ہے کہ خدائے تبارک و تعالی کی ذات مقدس ایسے امور کے ارتکاب سے (جو انسانوں میں رائج صورت میں) منزہ و پاک ہے۔ پھر بھی قرآن مجید میں خدائے متعال کی ذات اقدس سے صفتِ مکر، کید، خدعہ اور نسیان کی نسبت دی گئی ہے:

۱۔ صحیح بخاری: ۱۷۲/۴۔

۱۔﴿يَكِيدُونَ كَيْداً. وَأَكِيدُ كَيْداً﴾ (طارق/۱۵۔۱۶)

۲۔﴿وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا﴾ (نمل/۵۰)

۳۔﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ (نساء/۱۴۲)

۴۔﴿نَسُوا اللهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ (توبہ/۶۷)

بہرصورت، شیعہ محققین نے لفظ بداء کے استعمال کے سلسلے میں مفصل بحث وتحقیق کی ہے کہ علم خدا میں کسی طرح کا کوئی تغیر وتبدیل نہیں ہوتا جن کا تفصیلی ذکر یہاں پر ممکن نہیں اسلئے اس سلسلے میں چند کتابوں کے مطالعہ کی دعوت دی جاتی ہے(۱)

۱۔کتاب توحید، شیخ مفید: ص۳۳۲۔۳۳۶، تصحیح الاعتقاد شیخ مفید: ۲۴، عدۃ الاصول: ۲/۲۹، کتاب الغیبہ، ص۲۶۲۔۲۶۴ طبع نجف۔

رجعت

۱۲۹ویں اصل:

لغت میں ''رجعت'' واپس لوٹنے کے معنی میں ہے۔ شیعوں کی اصطلاح میں اس کا مطلب حضرت مہدی ؑ کے ظہور کے بعد اور قیامت سے، پہلے امت اسلامیہ کے ایک گروہ کا دوبارہ زندہ ہوکر دنیا میں واپس لوٹنا ہے۔ سب سے پہلے رجعت کے مسئلہ پر خود قرآن مجید گواہ ہے کہ سورہ نمل آیت ۸۳ میں فرماتا ہے:

﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ﴾

''اور اس دن ہم ہر امت میں سے ان کے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے جو ہماری آیتوں کی تکذیب کیا کرتے تھے اور پھر الگ الگ تقسیم کردیے جائیں گے''۔

اور اسی سورہء مبارکہ کی آیت ۸۷ میں فرماتا ہے:

﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ﴾

''اور جس دن صور پھونکا جائیگا تو زمین وآسمان میں جو بھی ہے سب لرز جائیں گے علاوہ ان کے جن کو خدا چاہے اور سب اس کی بارگاہ میں سر جھکائے حاضر ہوں گے''۔

جیسا کہ دیکھتے ہیں مذکورہ آیات میں دو دنوں کا ذکر ہوا ہے۔دوسرا ''یوم'' پہلے ''یوم'' پر عطف کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ پہلے دن میں صرف ایک خاص گروہ کے زندہ ہونے کا ذکر ہوا ہے اور دوسرے دن میں تمام لوگوں کے مرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ان نکات کو ربط دینے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلا دن قیامت کے علاوہ کوئی اور دن ہے اور ان دونوں میں آپسمیں فرق ہے۔

یہاں پر پھر سے یاد آوری ضروری ہے کہ پہلی آیت ایک خاص گروہ کے زندہ ہونے کی بات بیان کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا دن قیامت کا دن نہیں ہوسکتا۔چونکہ اس دن صور پھونکے جانے کے بعد تمام انسان زندہ ہوجائیں گے۔جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

﴿إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا ءَاتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا...وَكُلُّهُمْ ءَاتِيهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾ (مریم/۹۳۔۹۵)

''زمین وآسمان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کی بارگاہ میں بندہ بن کر حاضر ہونے والا نہ ہو۔۔۔اور سب ہی (کل) روز قیامت اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے ہیں''۔

ایک دوسری آیت میں قیامت کے وصف کے طور پر فرماتا ہے:

﴿وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا﴾ (کہف/۴۷)

''اور ہم سب کو اس طرح جمع کریں گے کہ کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے''۔

سورۂ نمل کی مذکورہ دو آیتوں کا مقابلہ اور موازنہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا دو دنوں

کے انتظار میں ہے کہ ایک دن صرف چند انسان زندہ ہوں گے اور دوسرے دن سب محشور ہوں گے۔ شیعوں کی روایتیں پہلے دن کو حضرت مہدی ؑ کے ظہور کے بعد اور قیامت سے پہلے جانتی ہیں۔

چند صالح لوگوں اور کچھ بدکردار لوگوں کا قیامت سے پہلے زندہ ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے کیونکہ گذشتہ امتوں میں بھی کچھ لوگ مرنے کے بعد زندہ ہوئے ہیں اور کچھ مدت کے بعد دوبارہ مر گئے ہیں (۱)۔

چند افراد کا دوبارہ زندہ ہو کر اس دنیا میں لوٹنا نہ حکم عقل کے خلاف ہے اور نہ روایت کے مخالف، کیونکہ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں قرآن مجید کے صریح حکم کے مطابق گذشتہ امتوں میں بھی ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں اور یہ اس کے امکان کی بہترین دلیل ہے۔ یہاں پر بھی بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے اور وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ''رجعت'' بھی ''تناسخ'' ہے، یہ بالکل ایک بے بنیاد تصور ہے، کیونکہ تناسخ کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد روح دوبارہ یا نطفے سے زندگی شروع کرتی ہے یا دوسرے بدن میں منتقل ہوتی ہے۔ جبکہ ''رجعت' میں ان دونوں باطل امور میں سے کسی ایک کا بھی وجود نہیں ہے۔ اسی لحاظ سے حکم رجعت، گذشتہ امتوں میں مردوں کے زندہ ہونے اور قیامت میں معاد جسمانی کے مانند ہے اور یہ حقیقت میں اُس اصلی قیامت کا ایک مختصر جلوہ ہے جسمیں تمام انسان کسی استثناء کے بغیر پھر سے زندہ ہوں گے۔

رجعت کے بارے میں شیعوں کی تفسیر، احادیث اور کلام کی کتابوں میں وسیع اور مفصل بحث ہوئی ہے۔ اس موضوع پر شیعوں کی روایات تواتر کی حد تک پہنچی ہیں اور تیس سے زیادہ محدثین نے پچاس سے اوپر کتابوں میں ان احادیث کو نقل کیا ہے (۲)

۱۔ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا زندہ ہونا بقرہ: ۵۵۔ ۵۶، بنی اسرائیل کے مقتول کا زندہ ہونا بقرہ: ۷۲۔ ۷۳، لوگوں کے ایک گروہ کا مرنے کے بعد پھر سے زندہ ہونا بقرہ: ۲۴۳، جناب عزیر کا سو سال کے بعد زندہ ہونا بقرہ: ۲۵۹، مردوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے زندہ ہونا آل عمران: ۴۹۔

۲۔ بحار الانوار: ۱۳۶/۵۳۔

عدالت صحابہ

۳۰ ویں اصل:

صحابہء پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ان پر ایمان لائے اور جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ان سے معرفت حاصل کی، ہم شیعوں کے اعتقاد کے مطابق خصوصی طور پر محترم ہیں، خواہ وہ صحابی جو بدر، احد، احزاب اور حنین کی جنگوں میں شہادت پر فائز ہوئے یا وہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد زندہ رہے۔ یہ سب حضرات اس لحاظ سے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے محترم ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہیں پایا جاتا جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں (اس لحاظ سے کہ وہ صحابی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے) کی بدگوئی کرے یا بے مروتی برتے۔ اگر مسلمانوں کے کسی گروہ پر ایسی تہمت لگائی جائے تو یہ بالکل بے بنیاد ہے۔

لیکن اس مسئلہ کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا مطلب بھی ہے جس کے بارے میں کسی تعصب یا حب و بغض کے بغیر تحقیق کرنی چاہیے: کیا سب صحابی عادل، پرہیزگار اور گناہوں سے پاک تھے؟ یا یہ کہ صحابیوں کا حکم بھی اس نظر سے ''تابعین'' کا حکم ہے کہ ان سب کو عادل اور پرہیزگار

نہیں مانا جاسکتا؟

یہ امر بدیہی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرنا اوران کے ساتھ رہنا اگر چہ ایک قابل فخر بات ہے، لیکن کسی انسان کے لئے اس کا باعث بھی نہیں بن سکتا کہ وہ گناہ سے محفوظ ہوجائے۔ ہر صحابی کو ایک ہی نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا اور تمام صحابیوں کو عادل، پرہیزگار اور گناہ سے پاک ومنزہ نہیں جانا جاسکتا۔ کیونکہ قرآن مجید کی گواہی کے مطابق، وہ لوگ صحابی ہونے کا فخر حاصل کرنے کے باوجود ایمان ونفاق اور خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدا کے مقابلے میں اطاعت کی رو سے سب صحابیوں کو ایک ہی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا اور سب کو عادل اور پرہیزگار نہیں مانا جاسکتا۔

اس میں کسی قسم کا شک نہیں کہ قرآن مجید نے اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مختلف موقعوں پر ستائش کی ہے(۱)۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کرنے والوں کے بارے میں رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِینَ إِذْ یُبَایِعُونَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (فتح/۱۸)

”یقیناً خدا صاحبان ایمان سے اس وقت راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے“۔

لیکن یہ تعریف اور ستائش ان سے بیعت کی حالت میں خدا کی رضامندی کی دلیل ہے۔ (اذیبایعونک) اور یہ اس بات کی ضمانت کی دلیل نہیں ہے کہ وہ سب آخر عمر تک صلاح وکامیابی کے مالک بن گئے ہیں۔ لہٰذا اگر ان میں سے کوئی ایک یا چند افراد بعد میں غلط راستے پر چلے ہوں تو یقیناً پہلی والی خدا کی رضامندی ان کے لئے ابدی کامیابی اور پرہیزگاری کی دلیل نہیں ہوسکتی کیونکہ ان کا مرتبہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ سے ہرگز بلند نہیں ہے، جن

۱۔ سورہ توبہ/۱۰۰، فتح/۱۸ و ۲۹، حشر/۸ و ۹۔

کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَسِرِينَ﴾ (زمر/۶۵)

''اگر تم شرک اختیار کروگے تو تمہارے تمام اعمال برباد کردئے جائیں گے اور تمہارا شمار گھاٹے والوں میں ہوجائے گا''۔

اس طرح کی آیات اس کمال کو بیان کرتی ہیں جوان افراد نے اس حالت میں پایا تھا، اب اگر وہ اس کمال کو اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک محفوظ رکھ سکیں تو کامیاب ہوں گے۔

جو کچھ بیان ہوا، اس کی بناء پر اگر کسی فرد یا افراد کے انحراف وگمراہی کے سلسلے میں قرآن مجید، سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تاریخ قطعی دلائل کے ساتھ گواہی دیں تو ان دلائل کی مذکورہ تعریفوں کی بناء پر تردید نہیں کی جاسکتی ہے۔

مثال کے طور پر قرآن مجید بعض صحابیوں کو ''فاسق'' کے عنوان سے یاد کرتا ہے: اور فرماتا ہے:

﴿إِن جَآءَكُمْ فَاسِقُ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓاْ﴾ (حجرات/۶)

ایک دوسری آیت میں اس کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِناً كَمَن كَانَ فَاسِقًا لَّايَسْتَوُنَ﴾ (سجدہ/۱۸)

یہ شخص، ''ولید بن عقبہ'' تاریخ کی قطعی گواہی کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابی تھا، لیکن، صحابی ہونے اور ہجرت کرنے کی دو فضیلتوں کا مالک ہونے کے باوجود اپنی ساکھ کو نہ بچاسکا اور طائفہ بنی مصطلق کے بارے میں جھوٹ بول کر خداوند متعال کی طرف سے ''فاسق'' کے عنوان سے یاد کیا گیا(۱)

مذکورہ آیات اور ان جیسی دوسری آیت (۲) نیز ان احادیث کے پیش نظر جو بعض صحابیوں کی

۱۔ مذکورہ دو آیتوں کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

۲۔ آل عمران/۱۵۳ و ۱۵۴، احزاب/۱۲، توبہ/۴۵ و ۴۷،

میں حدیث کی کتابوں(۱) میں بیان ہوئی ہیں اوراسی طرح بعض صحابیوں کی زندگی کی تاریخ(۲) کے تناظر میں قطعاً تمام صحابیوں کو جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، عادل اور پرہیزگار نہیں جانا جا سکتا۔

یہاں پر جو مسئلہ قابل بحث ہے وہ ''تمام صحابیوں کا عادل ہونا'' ہے، نہ صحابیوں کو برا بھلا کہنا۔ ستم ظریفی کا مقام یہ ہے کہ بعض حضرات نے ان دو موضوع کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا ہے اور پہلے مسئلہ پر دوسرے مسئلے کی تہمت لگاتے ہیں۔

آخر میں اس امر کی تاکید کرنا ضروری ہے کہ شیعہ امامیہ، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحابیت کو بعض صحابہ کے اعمال وافعال کے بارے میں فیصلہ دینے میں رکاوٹ نہیں سمجھتے اور اس بات کے معتقد ہیں کہ صرف صحابی ہونا آخر عمر تک گناہوں سے پاک نہیں کرسکتا۔ شیعوں کے اعتقاد کے مطابق اس سلسلے میں فیصلہ کی بنیاد قرآن کریم کی آیات، صحیح احادیث، تاریخ اور عقل ہیں۔

۱۳۱ ویں اصل:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام سے محبت رکھنا اصول اسلام میں سے ایک ہے، جسکی قرآن وسنت نے تاکید کی ہے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿قُلْ إِن كَانَ ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَٰنُكُمْ وَأَزْوَٰجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَٰلٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَٰرَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي

۱۔ جامع الاصول، ج۱۱، کتاب حوض حدیث نمبر ۷۹۷۲)

۲۔ صحیح بخاری، ج۵۔ تفسیر سورہ نور، ص ۱۱۸۔۱۱۹)

سَبِیلِهٖ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰی یَأْتِیَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِینَ﴾ (توبہ/۲۴)

''پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ دادا، اولاد، برادران، ازواج، عشیرہ وقبیلہ اور وہ اموال جنھیں تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے خسارہ کی طرف سے فکرمند رہتے ہو اور وہ مکانات جنھیں پسند کرتے ہو تمہاری نگاہ میں اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور راہ خدا میں جہاد سے محبوب ہیں تو وقت کا انتظار کرو یہاں تک کہ امر الٰہی آ جائے اور اللہ فاسق قوم کی ہدایت نہیں کرتا''۔

اور ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے:

﴿فَالَّذِینَ آمَنُوا بِهٖ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِی أُنزِلَ مَعَهُ أُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (اعراف/۱۵۷)

''جو لوگ اس (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے اس کا احترام کیا اس کی امداد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے وہی درحقیقت فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں''۔

خداوند متعال اس آیہء کریمہ میں نجات یافتگان کی درج ذیل چار خصوصیتیں بیان فرماتا ہے:

۱۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا (آمنوا بہ)

۲۔اس کی عزت واحترام کرنا (عزروہ)

۳۔اسکی مدد کرنا (نصروہ)

۴۔نازل شدہ نور (قرآن) کی پیروی کرنا (واتبعوا النور الذی انزل معہ)

اس کے پیش نظر کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرنا تیسری خصوصیت میں آیا ہے، قطعی طور پر ''عزروہ'' جو دوسری خصوصیت میں بیان ہوا ہے، کا مطلب بھی وہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

تکریم وتعظیم ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکریم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہے جیسے آپ پر ایمان لانا جو آیت میں بیان ہوا ہے اس قسم کی محدودیت نہیں رکھتا ہے۔

اہل بیت رسالت علیہم السلام کی محبت کے بارے میں بس اتنا کافی ہے کہ قرآن مجید نے اسے اجر رسالت کے طور پر ذکر کیا ہے اور فرماتا ہے:

﴿قُل لَّا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ (شوریٰ/۲۳)

''آپ کہدیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا ہوں علاوہ اس کے میرے اقربا سے محبت کرو''۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت اور تکریم کا ذکر صرف قرآن مجید ہی میں نہیں ہوا ہے بلکہ اسلامی احادیث میں بھی اس کی تاکید کی گئی ہے۔ ذیل میں ہم اسکے صرف دو نمونے بیان کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لایؤمن احدُ کم حتیٰ اکون احبَّ الیه من ولده والناس اجمعین(۱)

''تم لوگوں میں سے ہرگز ایک آدمی بھی حقیقی مؤمن نہ ہوگا جب تک وہ مجھے اپنے فرزندوں اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ رکھے''۔

۲۔ دوسری حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ثلاث من کنّ فیه ذاق طعم الایمان: من کان لاشئی احبّ

۱۔ کنز العمال، ج۱، ح ۲۰۷، جامع الاصول، ج۱، ص۲۳۸

الیه من اللّٰہو رسوله،ومن کان لئن یحرق بالنّار احبّ الیه من ان یرتدّ من دینه،ومن کان یحب الله ویبغض الله.

"تین چیزیں ایسی ہیں کہ جوان کا مالک ہو اس نے ایمان کا مزہ چکھا ہے:
۱۔وہ شخص جسے خدا اور رسول خدا سے زیادہ کوئی چیز محبوب وعزیز نہ ہو۔۲۔وہ شخص جس کے لئے آگ میں جل جانا دین سے خارج ہونے کی نسبت زیادہ عزیز ہو۔۳۔وہ شخص جو خدا کے لئے دوستی اور خدا کے لئے دشمنی رکھتا ہو۔

اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کی بھی اسلامی احادیث میں تاکید ہوئی ہے، جن میں سے بعض کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

۱۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لایؤمن عبد حتیٰ اکون احبّ الیه من نفسه وتکون عترتی احبّ الیه من عترته،ویکون اهلی احبّ الیه من اهله(۱)

"کوئی بندہ مؤمن شمار نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وہ مجھے اپنے آپ سے زیادہ عزیز کرے اور میرے فرزندوں کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہے اور میرے اہل بیت علیہم السلام سے اپنے خاندان سے زیادہ محبت کرے"۔

۲۔ایک دوسری حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عترت کے بارے میں فرمایا:

من احبّهم احبّه الله ومن أبغضهم ابغضه الله

"جس کسی نے ان (اہل بیت علیہم السلام) سے محبت کی خدا نے اس سے

۱۔مناقب الامام امیر المؤمنین علیہ السلام نگارش حافظ محمد بن سلیمان کوفی، ج۲، ح۶۱۹، ۷۰۰ اور بحار الانوار، ج۲۷،ص۱۳، علل الشرائع باب ۱۱۷، ح۳

محبت کی اور جس نے ان سے دشمنی کی خدا کا دشمن ہوا‘‘ (۱)

یہاں تک ہم دلائل کے ساتھ اس اصول (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے خاندان سے محبت) سے آشنا ہوئے، اب سوال پیدا ہوتا ہے:

۱۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اہل بیت علیہم السلام سے محبت کرنے کا امت کو کیا فائدہ ہے؟

۲۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اہل بیت علیہم السلام سے محبت کا طریقہ کار کیا ہے؟

پہلے سوال کے بارے میں ذکر کرنا لازم ہے کہ: ایک صاحب کمال اور با فضیلت شخصیت سے محبت کرنا خود کمال کی طرف بڑھنے کی ایک سیڑھی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سے دلی محبت کرتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ خود کو اس کے مشابہ بنائے اور وہی کام انجام دیتا ہے جو محبوب کی رضامندی کا سبب بنے اور جو کام اس کے محبوب کو برا لگتا ہے اسے ترک کر دیتا ہے۔

واضح ہے کہ انسان کے اندر اس قسم کی ذہنیت تغیر و تبدیلی کا سبب بنتی ہے تا کہ وہ مسلسل اطاعت و فرمانبرداری کے راستے کو اختیار کر کے گناہوں سے دور رہے۔ جو زبان سے محبت اظہار کرتے ہیں لیکن عمل سے اپنے محبوب کی مخالفت کرتے ہیں، وہ حقیقی محبت سے خالی ہوتے ہیں، امام صادق علیہ السلام سے منسوب مندرجہ ذیل دو بیت میں اس موضوع کی طرف اشارہ ہوا ہے:

تعصی الالہ وانت تظھر حبّہ — ھذالعمری فی الفعال بدیعٌ

لو کان حبّک صادقًا لاطعتہ — انّ المحبَّ لمن یحبُّ مطیعٌ (۲)

۱۔ مناقب الامام امیر المؤمنین نگارش حافظ محمد بن سلیمان کوفی، ج ۲/ ۰۰ ۷ اور بحار الانوار ج ۲۷/ ص ۱۳، علل الشرایع باب ۱۱۷/ ح ۳۔

۲۔ سفینۃ البحار: ۱/ ۱۹۹۔

''خدا کی نافرمانی کرتے ہو اور اس سے دوستی کا اظہار کرتے ہو، اپنی جان کی قسم، یہ کام بہت عجیب ہے۔

اگر اپنی دعویٰ میں سچے ہوتے تو اس کی اطاعت کرتے کہ بلاشبہ چاہنے والا ہمیشہ اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے''۔

اب جبکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام سے محبت کرنے کے بعض نتائج معلوم ہوئے، تو اب اس محبت کے اظہار کے طریقے پر غور کرتے ہیں: یقیناً اندرونی محبت کا کسی قسم کے انعکاس کے بغیر نہیں ہے بلکہ اس کا مقصود و مراد وہ محبت ہے جو انسان کے قول و عمل میں مناسب طور سے منعکس ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام سے محبت کا ایک انعکاس یہ ہے کہ عملی میدان میں انکی پیروی کی جائے، جس کے بارے میں اشارہ ہوا۔ لیکن بات اس اندرونی حالت کے دیگر انعکاس و نتائج کے بارے میں ہے، اور اس کی اجمالی صورت یہ ہے کہ وہ تمام گفتار و کردار جو لوگوں کی نظروں میں کسی کی محبت اور احترام کی علامت بن کر سامنے آئے، اس قاعدے کے زمرے میں آتا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کی تکریم یا اظہار محبت صحیح اور جائز گفتار و عمل کے ساتھ کیا جائے نہ کہ حرام عمل کے ذریعہ۔

اس لحاظ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کی ہر زمانے میں عزت و احترام کرنا خاصکر ان کی ولادت یا وفات کی تاریخوں پر اہتمام کرنا ان سے اظہار محبت کا ایک طریقہ ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کی ولادت کے دنوں میں چراغانی کرنا، جھنڈیاں لگانا یا سجاوٹ کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور آپ کے اہل بیت علیہم السلام کے مناقب وفضائل بیان کرنے کے لئے محفلوں کا انعقاد کرنا، ان سے اظہار محبت کا وسیلہ وعلامت ہیں۔ اسی لئے عید میلاد النبی پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجلیل کرنا مسلمانوں میں زمانہء قدیم سے رائج رہا ہے۔

دیار بکری اپنی کتاب ''تاریخ خمیس''میں لکھتے ہیں:

''مسلمان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے مہینے میں آپ کی عزت واحترام کے طور پر جشن مناتے رہے ہیں، لوگوں کو کھلاتے اور فقراء کی مدد کرتے ہیں، خوشیاں مناتے ہیں اور انکی ولادت کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ بعید نہیں ہے کہ ان کے لئے کوئی کرامت بھی ظاہر ہوتی ہو''۔

بالکل اسی مطلب کو ایک دوسرے عالم، ابن حجر قسطلانی نے بھی اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔(۱)

۱۳۲ ویں اصل:

مذکورہ بیان سے رہبران دینی کے لئے سوگ منانے کا فلسفہ بھی واضح ہوتا ہے، کیونکہ ان کے لئے ہر قسم کی مجالس عزا کا انعقاد کرنا ان کے حق میں اظہار محبت کی علامت ہے۔ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے سالہا سال اپنے لخت جگر حضرت یوسف علیہ السلام سے جدائی پر گریہ وزاری کی اور آنسو بہائے (یوسف/۸۴) تو یہ اپنے بیٹے کی نسبت انکی محبت اور پیار کی علامت تھی۔ لہٰذا اگر محبان اہل بیت علیہم السلام ان حضرات کے ساتھ محبت کے نتیجہ میں ان کی وفات وشہادت کے ایام میں آنسو بہائیں اور گریہ وزاری کریں تو درحقیقت انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیروی کی ہے۔

اصولی طور پر عزیزوں کی جدائی پر مجلس عزا کا انعقاد ایک ایسا کام ہے جسے خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ احد میں انجام دیا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ انصار کی عورتیں شہدائے اُحد پر گریہ وزاری کررہی ہیں تو انھیں اپنے چچا حضرت حمزہ کی یاد آئی اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ المواہب اللادینہ، ج۲۱، ص۲۷، تاریخ خمیس، ج۱، ص۲۲۳۔

و لكن حمزة لابواكى له (۱)

''لیکن کوئی حمزہ پر گریہ نہیں کرتا ہے''۔

جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب نے یہ احساس کیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چچا حضرت حمزہ کے لئے مجلس عزا منعقد کرنے کے خواہاں ہیں تو انہوں نے اپنی عورتوں کو حکم دیا کہ مجلس عزا برپا کر کے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا پر گریہ وزاری کریں۔ مجلس منعقد ہوئی، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس اظہار محبت کا شکریہ ادا کیا اور ان کے حق میں دعا کی اور فرمایا: رحم الله الانصار. ''اللہ انصار پر رحمت نازل فرمائے'' اس کے بعد انصار کے سرداروں سے فرمایا کہ وہ اپنی عورتوں کو حکم دیں کہ وہ اپنے گھروں کو واپس لوٹ جائیں (۲)۔

اس کے علاوہ راہ حق کے شہیدوں کے لئے سوگ منانے میں ایک اور فلسفہ بھی مضمر ہے، وہ یہ کہ ان کی یاد کو زندہ رکھنے سے ان کے مکتب فکر کی حفاظت ہوتی ہے۔ یہ وہ مکتب ہے کہ دین کی راہ میں قربانی دینا اور ذلت وخواری کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا جس کی بنیادیں ہیں۔ شہیدوں کا فلسفہ یہ ہے کہ ''عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہت ہے''۔ ہر سال امام حسین علیہ السلام کے عاشورا پر یہ فلسفہ زندہ کیا جاتا ہے اور قومیں اور ملتیں امام حسین علیہ السلام کی اس انقلابی تحریک سے درس لیتی ہیں۔

۱۳۴ ویں اصل:

دنیا کے تمام اہل عقل اپنے بزرگوں کے آثار کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے اور انھیں ''ثقافتی میراث'' کے عنوان سے زمانہ کے حوادث سے بچاتے ہیں، ان کی حفاظت اور رکھوالی کرتے

۱۔ سیرت ابن ہشام، ج۱/۹۹

۲۔ گذشتہ حوالہ، اور مقریزی، امتاع الاسماع، ج۱۱/۱۶۴۔

ہیں، ان کو قومی سرمایہ اور اپنے اجداد کی قابل قدر یادگار کے طور پر رکھتے ہیں، کیونکہ اجداد کی یادگاریں قدیم اور جدید زمانے کے درمیان ایک رابطہ ہوتی ہیں اور ملتوں کو ترقی کے عالی ترین مراتب ومنازل تک پہنچانے کے راستے دکھاتی ہیں۔ اگر یہ قدیمی آثار پیغمبروں علیہم السلام اور اولیائے الٰہی علیہم السلام سے مربوط ہوں، تو مذکورہ خصوصیت کے علاوہ لوگوں کے ایمان وعقیدہ کی تقویت میں بھی واضح اثر رکھتے ہیں۔ ان آثار کی نابودی ایک زمانہ گذانے کے بعد ان کے پیروؤں کے دلوں میں شک و شبہات پیدا کرتی ہے اور بنیادی موضوع یعنی ان کی شخصیات کی اہمیت پر بھی سوالیہ نشان بناتی ہیں۔

مثال کے طور پر مغربی دنیا کے لوگ ہر لحاظ سے مغربی ہیں اور آداب و رسوم بھی مغربی رکھتے ہیں، لیکن مذہب کے مسئلہ پر انہوں نے مشرق کی طرف ہاتھ پھیلا کر مسیحیت کو اپنایا اور ایک مدت تک یہ عقیدہ ان پر حکومت بھی کرتا رہا، لیکن حالات کی دگرگونی اور مغربی نوجوانوں میں تجسس اور کھوج کی حس نے رفتہ رفتہ ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے وجود پر ہی شک وشبہہ پیدا کردیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اپنے درمیان حضرت مسیح علیہ السلام کے کسی ملموس آثار کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اسے تاریخ کا ایک افسانہ سمجھنے لگے۔

جبکہ مسلمان اس سلسلے میں سربلند اور سرفراز رہے ہیں اور انہوں نے پوری تاریخ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کے چھوڑے ہوئے آثار کو حوادث زمانہ سے بچا کے رکھا ہے۔ اور مدعی ہیں کہ چودہ صدیوں سے زائد عرصہ پہلے ایک الٰہی شخصیت نبوت پر فائز ہوئی اور اس نے ایک ترقی یافتہ منصوبہ کے تحت انسانی معاشرے کی اصلاح شروع کی، اور ایک ایسا انقلاب برپا کیا کہ اس وقت بھی دنیا کے لوگ اس سے استفادہ کررہے ہیں۔ مسلمان اس شخصیت کے وجود کے بارے میں ذرہ برابر شک وشبہہ نہیں رکھتے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے پیدائش، جائے عبادت، خدا سے راز ونیاز کرنے کی جگہ، وہ جگہ جہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے، وہ مقامات جہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

تقریریں فرمائیں، وہ مقامات جہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرافتمندانہ طور سے دفاع کیا، حتیٰ وہ خطوط جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دنوں دنیا کی عظیم شخصیتوں کے نام تحریر فرمائے تھے اس کے علاوہ سیکڑوں دیگر آثار وعلامتیں بالکل محفوظ اور اپنی اصلی حالت میں مشخص اور اس وقت بھی دنیاوالوں کے لئے محسوس وملموس صورت میں موجود ہیں۔

اس اصول کی بنا پر دنیا کے تمام مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ ان آثار کی حفاظت کی کوشش کریں اوران پر علامتی تختیاں نصب کریں۔

یہ بیان آثار کے تحفظ کی اہمیت کو سماجی نقطہ ءنظر کی حیثیت سے واضح کرسکتا ہے، اتفاق سے نص قرآن اور مسلمانوں کی سیرت بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔قرآن مجید بعض آیات میں فرماتا ہے: خداوندمتعال نے ان گھروں کو بلند کرنے کی اجازت دی ہے جہاں صبح وشام خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔

﴿فِی بُیُوتٍ اَذِنَ اللهُ أن تُرْفَعَ وَیُذْکَرَفِیهَا اسْمُهُ یُسَبِّحُ لَهُ فِیهَابِالْغُدُوِّ وَ الْآصَالِ.رِجَالٌ لَاتُلْهِیهِمْ تِجَرَةٌ وَلَابَیْعٌ عَن ذِکْرِاللهِ وَإقَامِ الصَّلٰوةِ وَ إیتَآءِ الزَّکٰوةِ یَخَافُونَ یَوْمًاتَتَقَلَّبُ فِیهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَرُ﴾ (نور/۳۶۔۳۷)

''(یہ چراغ) ان گھروں میں ہے جن کے بارے میں خدا کا حکم ہے کہ ان کی بلندی کا اعتراف کیا جائے اوران میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے کہ ان گھروں میں صبح وشام اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔وہ مرد جنھیں کاروبار یا دیگر خرید وفروخت ذکر خدا، قیام نماز اورادائے زکواۃ سے غافل نہیں کرسکتی وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن کے ہول سے دل اور نگاہیں سب الٹ جائیں گی''۔

مسلّم طور پر''بیوت'' جو آیت میں بیان ہوا ہے، کا مقصد مساجد نہیں ہیں، کیونکہ قرآن

میں ''مساجد'' کے مقابلے میں ''بیوت'' کا استعمال ہوا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ ''مسجد الحرام'' غیراز ''بیت اللہ الحرام'' ہے۔روایات کے مطابق ''بیوت'' کا مقصد پیغمبروں علیہم السلام کے گھر خصوصاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوران کے اہل بیت علیہم السلام کے گھر ہیں۔سیوطی حضرت ابوبکر سے نقل کرتے ہیں کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی تو،ہم سب مسجد میں تھے۔ایک شخص اٹھااوراس نے سوال کیا:یہ گھر کن کے ہیں؟پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : پیغمبروں علیہم السلام کے گھر ہیں۔میں نے اٹھکرسوال کیا:کیاعلی علیہ السلام اورحضرت زہراء علیہا السلام کے گھر بھی اس میں شامل ہیں؟جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:**نعم و من افاضلھا۔** ''ہاں بلکہ ان میں سے بہترین ہیں''(۱)۔

اب جبکہ واضح ہوا کہ ''بیوت'' کا مقصد کیا ہے:تواب ہم ''ترفیع بیوت'' کی وضاحت کریں گے۔یہاں پردواحتمال ہیں:

۱۔ترفیع: تعمیر کرنا اور بلند کرنا ،چنانچہ دوسری آیات میں ''رفع''اسی معنی میں استعمال ہواہے،جیسا کہ قرآن کاارشاد ہے:

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ﴾ (بقرہ/۱۲۷)

''اوراس وقت کویادکروجب ابراہیم علیہ السلام واسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی دیواروں کوبلند کررہے تھے''۔

۲۔ترفیع: سے دوسرااحتمال،احترام ومحافظت کرنا۔

پہلے معنی کے مطابق چونکہ پیغمبروں کے گھر پہلے تعمیر کئے جاچکے تھے،اسلئے مقصد بنانااور تعمیر بیوت نہیں ہے بلکہ مقصد خرابی اورویرانی سے ان کی حفاظت کرناہےاوردوسرے معنی کے لحاظ سے خرابی سے حفاظت کے علاوہ سے جوان کی حرمت سے منافات رکھتی ہوہرقسم کی آلودگی سے جوان کی حرمت سے منافات رکھتی ہوان کی حفاظت کرناہے۔

۱۔الدارالمنثور:ج۵،ص۲۰۳۔

اسلئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منصوب گھروں کی تکریم وحفاظت کریں اور اس کام کو ان سے قرب کا ایک عنوان محسوب کریں۔

اصحاب کہف سے مربوط آیت سے۔ جب ان کے مخفی ہوجانے کی جگہ معلوم ہوئی۔ پتا چلتا ہے کہ ان کے تعظیم وتکریم کے لئے دو جماعتوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔

ایک جماعت کہتی تھی کہ اصحاب کہف کی قبروں پر ان کی تکریم واحترام کے لئے یادگار کے طور پر کوئی عمارت تعمیر کریں۔ اور دوسری جماعت کہتی تھی کہ: ان کی قبروں پر ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ قرآن مجید نے دونوں تجویزوں کو قابل قبول لہجے میں نقل کیا ہے۔ اگر یہ دونوں تجویزیں اسلامی اصولوں کے مخالف ہوتیں تو ان کو دوسرے لہجے میں بیان کرتا۔ یا ان کی تنقید کرتا، لیکن قرآن مجید یوں بیان فرماتا ہے:

﴿إِذْ يَتَنَٰزَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَٰنًا رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰٓ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا﴾ (کہف/۲۱)

"جب یہ لوگ آپسمیں ان کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے اور یہ طے کر رہے تھے کہ ان کے غار پر ایک عمارت بنادی جائے۔ خدا ان کے بارے میں بہتر جانتا ہے اور جو لوگ دوسروں کی رائے پر غالب آئے انہوں نے کہا ہم اس پر مسجد بنائیں گے"۔

یہ دو آیتیں (عصر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آج تک مسلمانوں کی مسلسل سیرت کے پیش نظر جوان آثار کی حفاظت کی کوشش کرتے رہے ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے گھروں کی رکھوالی اور حفاظت کرتے رہے ہیں)۔ اس اصول کے اسلامی ہونے کی واضح دلیل ہیں۔ اس لئے پیغمبروں علیہم السلام کی قبروں کی تعمیر اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کی قبروں پر عمارتیں تعمیر کرنا، قبروں پر یا ان کے کنارے مسجد تعمیر کرنا اسی اسلامی اصول کے مطابق ہے۔

۳۴اویں اصل:

مؤمنوں کی قبروں کی زیارت، خاص کر اپنے اقرباواعزۃ کی قبروں کی زیارت، اصول اسلامی میں سے ایک اصل ہے کہ یہ کام بذات خود ایک تعمیری اثر رکھتا ہے۔ قبرستان کی خاموش وادی، جہاں انسانوں کی زندگی کے چراغ بجھ چکے ہیں، کا مشاہدہ کرنا انسان کی جان ودل کو متزلزل کرتا ہے، اور درس عبرت بنتا ہے اور مشاہدہ کرنے والا اپنے ضمیر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: ''یہ ناپائیدار زندگی، جس کا انجام منوں مٹی کے نیچے دب جانا ہے، ایسی نہیں ہے کہ اسے ناجائز اور ناروا طور سے برباد کیا جائے''۔ بالاخر ایسے افراد اپنی زندگی پر دوبارہ غور کرتے ہیں اور ان کی روح وضمیر میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

زوروا القبور فانّها تذکرکم الآخرة(۱)

''قبروں کی زیارت کرو، کیونکہ یہ تمہیں دوسری دنیا کی یاد دلاتی ہیں''۔

اس کے علاوہ، دینی رہنماؤں کی زیارت، ایک طرح سے دین کی ترویج اور مقامات معنوی کے حصول کی ایک قسم ہے۔ بزرگوں کی قبروں کی طرف لوگوں کی توجہ اس فکر کو تقویت بخشتی ہے کہ ان بزرگوں کی معنویت اور روحانیت ہی ان کی طرف رجحانات کا سبب بنی ہے، ورنہ کتنے مال ودولت اور قدرت والے لیکن معنویت سے خالی مٹی کے نیچے سوئے ہوئے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا۔

رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے آخری ایام میں قبرستان بقیع تشریف لے جاتے تھے اور صاحبان قبور کے حق میں دعائے مغفرت کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''میرے اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ قبرستان بقیع میں آکر ان لوگوں کے لئے طلب مغفرت کروں''۔ اس کے بعد فرمایا: ''جب ان کی زیارت کے لئے جاؤ تو کہو:

۱۔ سنن ابن ماجہ، ج۱، باب ماجاء فی زیارۃ القبور، ص ۱۱۳۔

السلام علی اهل الدیار من المؤمنین و المسلمین یرحم الله المتقدمین منّاوالمستأخرین وانّاان شاء اللهبکم لاحقون.

''سلام ہو اس وادی کے ساکنون میں سے مؤمنین و مسلمین پر، رحمت خدا ہو ہمارے مرحومین اورلواحقین پراور ہم انشاء اللہ تم لوگوں سے آملیں گے''۔

حدیث کی کتابوں میں اولیائے الٰہی اور بزرگان دین کی قبروں کی زیارت کو ایک تاکیدی مستحب کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے خود ائمہ اطہار علیہم السلام، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے سے پہلے والے اماموں کی قبروں کی زیارت کے لئے جاتے تھے اور اپنے پیروں کو اس کام کی انجام دہی کے لئے تاکید و تلقین فرماتے تھے۔

غلو

۱۳۵ ویں اصل:

لغت میں ''غلو'' حد سے تجاوز کے معنی میں آیا ہے۔قرآن مجید اہل کتاب سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَاتَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ﴾ (نساء/۱۷۱)

''اے اہل کتاب (یہاں پر مقصد مسیحی ہیں) اپنے دین میں حد سے زیادہ تجاوز نہ کرو اور خدا کے بارے میں حق کے علاوہ کچھ نہ کہو۔''

مسیحیوں کو اس جہت سے غلو کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ وہ حضرت مسیح کے حق میں حد سے تجاوز کر کے انھیں خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بعض گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصوم علیہم السلام کے بارے میں حد سے تجاوز کر کے ان کے لئے ایسے مقامات کے قائل ہو گئے جو صرف خدا سے مخصوص ہیں۔اس لئے انھیں ''غالی'' یا ''غالیان'' کہا گیا کیونکہ وہ حق کے حدود سے تجاوز کر گئے تھے۔

شیخ مفید کہتے ہیں:

''غالی وہ گروہ ہے جو ظاہر میں اسلام کا لبادہ پہن کر امیر المؤمنین علیہ السلام

اور دیگر ائمہ معصومین علیہم السلام کے بارے میں الوھیت اور نبوت ثابت کر کے ان سے ایسے صفات منسوب کرتا ہے جو حقیقت کی حد سے بالاتر ہیں۔(۱)

علامہ مجلسیؒ کہتے ہیں:

''پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کے بارے میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ انھیں خدا کے نام سے پکارا جائے یا عبادت و پرستش میں انھیں خدا کا شریک قرار دیا جائے یا خلقت اور رزق کو ان سے متعلق جانیں، یا اعتقاد پیدا کریں کہ خدا ان میں حلول کر گیا ہے یا یہ کہیں کہ وہ خدا کی طرف سے الہام کے بغیر علم غیب سے آگاہ ہیں، یا اماموں علیہم السلام کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانیں یا تصور کریں کہ ان کی شناخت اور معرفت ہمیں خدا کی عبادت سے بے نیاز کر کے ہر قسم کے فرائض شرعی سے مستغنی کر دیتی ہے۔''(۲)۔

امیر المومنین علیہ السلام اور ان کی اولاد طاہرین ہمیشہ غالیوں سے دور رہے اور ان پر لعنت بھیجتے تھے۔ ہم یہاں اس سلسلہ میں صرف ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام اپنے پیروؤں کو اس طرح حکم دیتے ہیں:

احذروا علی شبابکم الغلاة لایفسدوهم فانّ الغلاة شرٌّ خلق اللہ، یصغّرون عظمة اللہ ویدّعون الربوبیّة لعباد اللہ.(۳)

''اپنے جوانوں کو غالیوں سے بچاؤ، ایسا نہ ہو کہ وہ ان کے دینی اعتقادات کو فاسد کریں، حقیقت میں ''غالی'' بدترین لوگ ہیں، یہ لوگ عظمت خدا کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور خدا کے بندوں کے لئے ربوبیت اور الوھیت ثابت کرتے ہیں۔''

۱۔ تصحیح الاعتقاد، ص۱۰۹۔

۲۔ بحار الانوار: ۳۴۶/۲۵

۳۔ بحار الانوار: ۲۶۵/۲۵

اسلئے ان (غالیوں) کا اسلام کے سلسلہ میں تظاہر کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور علمائے اسلام انھیں کافر جانتے ہیں۔ بہرحال غلو سے پرہیز کرنا چاہئے لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیائے الٰہی کے بارے میں ہر فکر وعقیدہ کو غلو سے تعبیر بھی نہیں کرنا چاہئے۔ دوراندیشی واحتیاط کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے اور صحیح طرز تفکر کی بنیاد پر عقائد کو پرکھنا چاہئے۔

دسواں حصہ

حدیث، اجتہاد اور فقہ

حدیث

۱۳۶ ویں اصل:

شیعہ امامیہ عقائدواحکام کے سلسلے میں ان احادیث پر عمل کرتے ہیں جوثقہ اور مورد اعتماد افراد کے ذریعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہوں، چاہے یہ روایات شیعوں کی حدیث کی کتابوں میں ہوں یا سنیوں کی حدیث کی کتابوں میں ہوں۔ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شیعوں کی فقہی کتابوں میں سنی راویوں کی نقل شدہ احادیث سے بھی استناد کیا گیا ہے (شیعوں کے علم درایہ میں حدیث کی چہارگانہ تقسیم کے لحاظ سے اس قسم کی احادیث کو ''موثق'' کہا جاتا ہے)۔ اسلئے بعض خودغرض افراد شیعوں پر جوتہمت لگاتے ہیں بالکل بے بنیاد ہے۔

شیعوں کی فقہی بنیاد، کتاب، سنت، عقل اوراجماع پر ہے۔ اورسنت سے مراد قول وفعل یا تقریر معصومین علیہم السلام ہے جن میں سرفہرست پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اسلئے اگر کوئی حدیث موثق راوی کے ذریعہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہواور یہ آنحضرت کے قول، فعل یا تقریر پر مشتمل ہوتو وہ شیعوں کی نظر میں معتبر ہے۔ اس دعوی کی واضح گواہ شیعوں کی فقہی کتابیں ہیں، اورایک لحاظ سے کہنا چاہئے کہ اس باب میں شیعہ وسنی حدیث کی کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ثقہ اور معتبر راوی کی تشخیص میں ہے۔

۳۷ ویں اصل:

جو احادیث و روایات صحیح سند کے ساتھ شیعہ ائمہ معصومین علیہم السلام سے نقل ہوتی ہیں، حجت شرعی رکھتی ہیں، ان کے مضمون پر عمل کرنا چاہئے اور اس کے مطابق فتویٰ دینا چاہئے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام۔ رائج اصطلاحی معنی میں۔ مجتہد و مفتی نہ تھے وہ جو کچھ نقل کرتے ہیں، ایسے حقائق ہیں جن تک وہ درج ذیل مختلف طریقوں سے رسائی حاصل کرتے ہیں۔

الف۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے:

معصوم ائمہ علیہم السلام احادیث کو (بلاواسطہ یا اپنے آباء و اجداد طاہرین کے ذریعہ) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کر کے لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔ اس قسم کی روایات جنہیں ہر امام نے اپنے سے پہلے امام کے ذریعہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہو شیعہ امامیہ احادیث کی کتابوں میں فراوان پائی جاتی ہیں۔ اگر اس قسم کی تمام احادیث۔ جو سند کے لحاظ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تمام ہوتی ہیں۔ جمع کی جائیں تو ایک عظیم مجموعہ تیار ہوگا اور یہ اسلامی محدثین اور فقہاء کے لئے ایک عظیم ذخیرہ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی محکم سند کی ساتھ احادیث، حدیث کی دنیا میں بے نظیر ہیں۔ ہم یہاں پر اس قسم کی احادیث کا ایک نمونہ کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک نسخہ حدیث سلسلۃ الذہب کے عنوان سے، تبرک و تیمن کے طور پر ادب دوست اور ثقافت پرور ''سامانی پادشاہوں'' کے خزانہ میں محفوظ تھا پیش کرتے ہیں:

شیخ صدوق اپنی کتاب ''توحید'' میں دو افراد کے واسطہ سے ابوصلت ھروی سے نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں:

> ''میں علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے ہمراہ تھا۔ امام علیہ السلام نیشاپور سے گزر رہے تھے۔ اس دوران نیشاپور کے محدثین کی ایک جماعت جیسے محمد بن رافع، احمد بن حرب، یحییٰ بن یحییٰ، اسحاق بن راھویہ اور علم دوست افراد کی ایک بڑی جماعت نے امام علیہ السلام کے مرکب کی لگام

کو پکڑ کر عرض کیا: ہم آپ (علیہ السلام) کو آپ (علیہ السلام) کے اجداد پاک کی قسم دیتے ہیں کہ ہمارے لئے ایک ایسی حدیث بیان فرمایئے جسے آپ (علیہ السلام) نے اپنے والد بزرگوار سے سنا ہو۔ امام نے محمل سے سر مبارک کو باہر نکالتے ہوئے یوں فرمایا:

حدثنی ابی العبدالصالح موسیٰ بن جعفر علیه السلام قال حدثنی ابی الصادق جعفربن محمد علیه السلام قال حدثنی ابی ابوجعفر محمدابن علی باقر علم الانبیاء علیه السلام قال حدثنی ابی علی ابن الحسین علیه السلام سیدالعابدین قال حدثنی ابی سید شباب اهل الجنة الحسین علیه السلام قال حدثنی ابی علی بن ابیطالب علیه السلام سمعت النبی صلی الله علیه وآله وسلم یقول سمعت جبریل یقول سمعت اللّٰہ جل جلاله یقول: لا اِلٰه اِلّا اللّٰہ حِصْنی فَمَن دَخَلَ حِصْنی اَمِنَ مِن عَذابِی

اس کے بعد جب چلنے لگے تو بلند آواز میں فرمایا:

بشروطها و انا من شروطها (۱)

ب۔ حضرت علی علیہ السلام کی کتاب سے:

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری بعثت کے زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوش بدوش تھے۔ اسلئے آپ علیہ السلام کافی تعداد میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کا ایک مجموعہ کتابی صورت میں جمع کرنے میں کامیاب ہوئے (حقیقت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو احادیث املا فرماتے تھے اور حضرت علی

۱۔ توحید شیخ صدوق، باب ۱، احادیث ۲۱، ۲۲، ۲۳۔

علیہ السلام لکھ لیا کرتے تھے)۔اس کتاب کی خصوصیات۔ جو آپ علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپ علیہ السلام کے خاندان میں باقی رہی۔ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:''اس کتاب کی لمبائی ستر ہاتھ ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے املا اور حضرت علی ابن ابیطالب کے ہاتھ سے لکھی گئی ہے اور لوگ جس چیز کے محتاج ہیں وہ سب اس کتاب میں بیان ہوا ہے۔''(۱)

قابل ذکر ہے کہ یہ کتاب مسلسل خاندان علی علیہ السلام میں دست بہ دست رہی اور امام باقر علیہم السلام اکثر اس سے حدیث نقل فرماتے تھے اور اپنے خاص دوستوں کو یہ کتاب دکھاتے بھی تھے۔اس وقت بھی اس کتاب کی بعض احادیث شیعوں کے حدیثی مجموعوں میں، خاص کر''وسائل الشیعہ'' کے مختلف ابواب میں درج ہیں۔

ج۔الٰہی الہامات:

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا علم ایک دوسرے منبع کا بھی حامل رہا ہے جسے''الہام'' کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔الہام صرف پیغمبروں علیہم السلام سے ہی مخصوص نہیں تھا۔تاریخ میں بعض دوسری عظیم اور عالی شخصیتیں بھی اس سے مستفید تھیں۔تاریخ متعدد ایسے افراد کا پتہ دیتی ہے کہ پیغمبر نہ ہونے کے باوجود ان پر غیب سے اسرار الہام ہوتے تھے اور قرآن مجید نے ان میں سے بعض کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔چنانچہ حضرت موسیٰ علیہم السلام کے مصاحب اور دوست(حضرت خضر) جنہوں نے چند صباح ان کی تربیت کی قرآن ان کے سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿ءَاتَيْنَٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَٰهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (کہف/۶۵)

''جسے ہم نے اپنی طرف سے رحمت عطا کی تھی اور اپنے علم خاص میں سے ایک علم کی تعلیم دی۔''

اس کے علاوہ حضرت سلیمان کے ایک گماشتہ(آصف بن برخیا) کے بارے میں فرماتا ہے:

۱۔بحار الانوار:۲۶/۱۸۔

﴿قَالَ الَّذِی عِنۡدَهُ عِلۡمٌ مِّنَ الۡكِتٰبِ...﴾ (نمل/۴۰)

''اور ایک شخص نے جس کے پاس کتاب کے ایک حصہ کا علم تھا اس نے کہا.....''

اس لئے کسی کا نبی نہ ہونا اس میں رکاوٹ نہیں بنتا کہ بعض بلند مرتبہ انسان الہام الٰہی کے مالک بن جائیں۔اسلامی احادیث میں فریقین نے نقل کیا ہے کہ اس قسم کے افراد کو'محدَّث' کہا جاتا ہے، یعنی ایسے افراد کہ پیغمبر نہ ہونے کے باوجود فرشتے ان سے باتیں کرتے ہیں۔

امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے:

لقدکان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل یکلّمون من غیر ان یکونوا انبیاء...(۱)

''آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں کچھ افراد ایسے تھے کہ فرشتے ان سے گفتگو کرتے تھے اگرچہ وہ پیغمبر نہ تھے۔''

اس بناء پر ائمہ اہل بیت علیہم السلام جو معارف الٰہی واحکام دین بیان کرنے میں امت کے مرجع ہیں وہ بھی بعض سوالات کے جواب علم غیب سے دیتے تھے جن کے جواب احادیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کتاب حضرت علی علیہ السلام میں موجود نہ رہے ہوں۔(۲)

۱۳۸ ویں اصل:

احادیث رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی طرح خاص اعتبار واہمیت کی حامل ہیں۔سنّت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کتاب خدا کی طرح مسلمانوں کے عقیدتی اور فقہی اسناد کی حیثیت رکھتی ہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے حکومت وقت کے دباؤ میں آ کر احایث لکھنے سے اجتناب کیا، لیکن خوش بختی سے

۱۔صحیح بخاری:۱۴۹/۲۔

۲۔محدَّث اوران کے حدود کے بارے میں کتاب ارشاد الساری فی شرح صحیح بخاری:۹۹/۶ ملاحظہ فرمائیں۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام کے محبوں نے ایک لحہ بھی غفلت نہ کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حدیث لکھنے میں لگ گئے۔ گزشتہ اصل میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام سے مربوط احادیث کا ایک حصہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے۔

پوری تاریخ میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کے شاگردوں نے احادیث کے بڑے بڑے مجموعے لکھے ہیں، علم رجال کی کتابوں میں ان کا ذکر آیا ہے۔ خصوصاً چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں، خود ائمہ اطہار علیہم السلام کے زمانے میں ہی ان کے شاگردوں کے ہاتھوں تالیف کی گئی کتابوں سے استفادہ کر کے حدیثوں کی چند جامع اور مفصل کتابیں تدوین کی گئیں اور اس وقت بھی یہ کتابیں شیعہ عقائد اور احکام کی محور شمار ہوتی ہیں۔ ذیل میں ہم ان کتابوں اور ان کے مؤلفین کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ کافی، مصنف: محمد بن یعقوب کلینی (متوفی ۳۲۹ھ)، ۸ جلد۔

۲۔ من لایحضرہ الفقیہ، مصنف: محمد بن علی بن بابویہ معروف بہ شیخ صدوق (۳۰۶۔۳۸۱ھ)، ۴ جلد۔

۳۔ تہذیب، مصنف: محمد بن حسن طوسی معروف بہ شیخ طوسی (۳۸۵۔۴۶۰ھ)، ۱۰ جلد۔

۴۔ استبصار، مصنف: شیخ طوسی، ۴ جلد۔

یہ کتابیں احادیث کے مجموعوں کا دوسرا دورہ تھا جسے شیعوں نے اپنی جدو جہد سے بھرپور تاریخ میں چوتھی اور پانچویں صدی ہجری تک تنظیم کیا ہے۔ جیسا کہ اشارہ ہوا ائمہ اطہار علیہم السلام کے عصر میں، یعنی دوسری اور تیسری صدی ہجری تک حدیثوں کا ایک مجموعہ ''اصول چہار صدگانہ'' کے ضمیمہ کے ساتھ اولین مجموعہ کے طور پر تألیف ہو چکا تھا اور اسی کے مندرجات دوسرے مجموعہ میں منتقل ہوئے ہیں۔

چونکہ علم حدیث ہمیشہ شیعوں کے لئے اہمیت اور توجہ کا حامل رہا ہے اس لئے گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری میں بھی احادیث کے اور مجموعے تألیف ہوئے کہ ان میں سے بحار الانوار (تألیف محمد باقر مجلسی)، وسائل الشیعہ (محمد حسن حر عاملی) اور وافی (محمد محسن فیض کاشانی) مشہور

اور قابل ذکر ہیں۔

واضح ہے کہ شیعہ ہر حدیث پر عمل نہیں کرتے اور عقائد کے دائرے میں خبر واحد یا قرآن وسنّت کے مخالف روایتیں قطعی حجت نہیں ہیں۔اسی طرح احادیث کی کتابوں میں کسی حدیث کا وجود اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ مؤلف کا عقیدہ بھی وہی ہوگا۔ بلکہ شیعہ علما کی نظر میں احادیث مختلف انواع میں تقسیم ہوئی ہیں جیسے صحیح، حسن، موثق اور ضعیف اور احکام واعتبار کے لحاظ سے ہر ایک قسم کی اپنی خصوصیت ہے۔اس کی تفصیلات علم درایہ کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں۔

اجتھاد

۱۳۹ویں اصل:

گذشتہ حصے میں فقہ شیعہ کے اسناد (دلائل چہارگانہ: کتاب، سنت، عقل اور اجماع) کے بارے میں ہم نے اشارہ کیا۔ علم اصول میں بیان شدہ خصوصی شرائط کے ساتھ ان دلائل سے احکام شرعی کے استنباط کو اجتہاد کہتے ہیں۔

چونکہ شریعت اسلام آخری آسمانی شریعت ہے اور اس کے بعد کوئی اور شریعت آنے والی نہیں ہے، اس لئے اس شریعت کو چاہئے کہ انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی قلمرو میں تمام ضرورتوں کی جوابگو ہو۔ عصر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسلمان اسلام کی اسی کمال وجامعیت کے نتیجہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو اپنے لئے عملی راھنما سمجھ کر زندگی کے تمام شعبوں میں خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے امر ونہی کے منتظر رہتے تھے۔

دوسری طرف سے ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں رونما ہونی والے حوادث اور واقعات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہی زمانے تک محدود نہ تھے بلکہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے نئے حوادث رونما ہوتے رہے، طبیعی طور پر ان میں سے ہر ایک حادثہ اپنے لئے جداگانہ حکم شرعی کا متقاضی ہے۔

ان دو مطلب کے پیش نظر، پوری تاریخ کے دوران فقہا پر اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنا ایک ضروری امر بن جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام، بحیثیت ایک جامع و کامل دین الٰہی، روزمرہ جدید رونما ہونے والے حوادث کے بارے میں خاموش رہے اور بشریت کو تاریخ کے تند و تیز اور نئے نئے چکروں میں حیران و پریشان اور بلا تکلیف رہنے دے؟

ہم سب جانتے ہیں کہ علم اصول کے علما نے اجتہاد کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: ''مطلق اجتہاد'' اور ''ایک خاص مذہب میں اجتہاد''۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص ابوحنیفہ کے فقہی مسلک کے دائرے میں اجتہاد کرے یعنی کوشش کرے کہ کسی مسئلہ میں ابوحنیفہ کا نظریہ معلوم کرے، تو اس عمل کو ''مذہب میں اجتہاد'' کہتے ہیں۔ لیکن اگر ایک مجتہد کسی فرد معین کے مسلک کا مقید نہ ہو اور اپنی تلاش کو اس بنا پر جاری رکھے کہ دلائل شرعی سے حکم خدا کو حاصل کرے (خواہ یہ حکم کسی مسلک کے موافق ہو یا مخالف) تو اس عمل کو ''اجتہاد مطلق'' کہتے ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ۶۶۵ ہجری سے علمائے اہل سنت پر ''اجتہاد مطلق'' کا دروازہ بند ہوا(۱)، اور ایک خاص فقہی دائرے کے اندر ان کا اجتہاد محصور ہو کے رہ گیا۔ یقیناً یہ عمل احکام الٰہی کے حقیقت پسندانہ اور آزادانہ استنباط کی راہ میں ایک قسم کی رکاوٹ ہے۔

شیعہ فقہا، کتاب و سنّت اور عقل و اجماع کی بنیاد پر اجتہاد کرتے ہیں اور حقایق و معارف دینی کے ادراک کے سلسلے میں ان کی کوششوں میں شرعی دلیلوں کی پیروی کے علاوہ کوئی اور پابندی نہیں ہے۔ اسی لئے اس مسلک سے تعلق رکھنے والے علماء نے اس زندہ و مستقل اجتہاد کی شعاؤں میں ایک جامع، زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق اور نو بہ نو فقہ کو وجود میں لا کر ایک عظیم علمی سرمایہ فراہم کیا۔ جس چیز نے اس زندہ و جاوید شیعی فقہ کی مدد کی، وہ یہ ہے کہ اس مذہب نے ابتدائی طور پر میّت کی تقلید کو ممنوع قرار دیکر زندہ مجتہد کی تقلید کا حکم دیا کہ معاشرے اور زمانہ کی نبض اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

شیعہ فقہ بہت سے مسائل میں دیگر مذاہب کے فقہا کی رائے سے موافق ہے۔ شیخ طوسی کی

۱۔ مقریزی، الخطط: ۳۴۴/۲۔

کتاب ''الخلاف'' اس امر کی واضح گواہ ہے، کیونکہ فروعات میں بہت کم ایسا پایا جاتا ہے کہ شیعہ فقہی نظریہ فقہائے چہارگانہ یا ان سے پہلے والے فقہا میں سے کسی ایک کے ساتھ مطابقت نہ رکھتا ہو۔اس کے باوجود یہ مذہب (شیعہ) بعض فروعات مسائل کے بارے میں خاص نظریہ رکھتا ہے، ان میں سے کچھ کی طرف ہم آنیوالے چند اصول میں اشارہ کریں گے۔ کیونکہ بعض اوقات تصور کیا جاتا ہے کہ یہ خاص فروعات کوئی شرعی دلیل نہیں رکھتے یا کتاب وسنت کے خلاف ہیں جبکہ قضیہ اس کے برعکس ہے۔

۱۴۰ ویں اصل:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابیوں کی ایک جماعت کے ذریعہ آئندہ نسلوں کے لئے ضبط ونقل ہوئی ہے۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کردار کی طرح حجت الٰہی ہے اور اس کی پیروی ضروری ہے۔اسلئے اگر ایک صحابی سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نقل کرے اور روایت، حجیت کے شرائط کی حامل ہو تو سب اس کو قبول کر کے اس پر عمل کرتے ہیں۔

اسی طرح اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی صحابی قرآنی لغت کا معنی کرے یا عصر رسالت سے مربوط واقعات وغیرہ کو نقل کرے، تو اس کی بات، بیان شدہ شرائط کے تحت قابل قبول ہے۔

لیکن اگر صحابی کسی آیت یا سنت کو اپنی رائے کے مطابق استنباط کرے، یا کسی بات کو نقل کرے اور واضح نہ ہو کہ یہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نقل کر رہا ہے یا اپنی رائے اور اجتہاد کو بیان کر رہا ہے، تو اس صورت میں اس کی بات حجت نہیں ہوگی، کیونکہ مجتہد کی رائے دیگر مجتہدین کے لئے حجت نہیں ہوتی ہے۔اس لحاظ سے صحابی کے قول پر عمل کرتے وقت اس کی اپنی رائے واجتہاد اور سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فرق کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔اور شیعہ

امامیہ فقط اسی صورت میں قول صحابی پر عمل کرتے ہیں کہ وہ سنت رسول کو نقل کرتا ہو۔

۴۱ ویں اصل:

ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جن مسائل میں اعتقاد لازم ہے، ان پر یقین حاصل کرے۔ ایسے مسائل میں خود یقین حاصل کئے بغیر دوسروں کی تقلید اور پیروی کرنا جائز نہیں ہے۔ چونکہ اعتقادی مسائل کے اصول اور کلیات محدود ہیں اور عقل کے لحاظ سے ہر ایک کے لئے واضح دلیل موجود ہے، اسلئے اصول عقائد میں یقین حاصل کرنا آسان ہوگا۔ جبکہ فروعات اور فقہی احکام کا دائرہ وسیع ہے اور ان کے بارے میں علم حاصل کرنے کے لئے بہت سے مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اکثر افراد ان مقدمات کے ذریعہ علم حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، اسلئے مذکورہ افراد کو چاہئے کہ حکم فطرت اور عقلاء کی سیرت کے شرعی احکام میں فقہا اور مجتہدین کی طرف رجوع کریں اور اس طریقے سے اپنے دینی فرائض پر عمل کریں۔

اصولی طور پر انسان، ایک علمی فاعل ہے اور اپنے کام کو علم کی بنیاد پر استوار کرتا ہے، اگر خود علم حاصل کر سکا تو کیا بہتر، ورنہ دوسروں کے علم سے استفادہ کرتا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ مجتہد جامع الشرائط کی تقلید، (متخصص م) ماہر سے رجوع کرنے کے مانند ہے۔ اور اس کا ان بے بنیاد تقلیدوں سے کوئی ربط نہیں ہے جو قوی تعصبات کی بنا پر ہوتی ہیں۔

چند اختلافی فقہی احکام:

دین اسلام ”عقیدہ“ و ”شریعت“ (ہستی کی شناخت اور احتیاجات) کا مرکب ہے کہ اسے اصول و فروع دین سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ گزشتہ بحث میں اصول کے ایک سلسلہ کے تحت ہم دلائل کے ساتھ شیعہ عقیدہ سے آگاہ ہوئے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت اطہار علیہم السلام سے مربوط احایث کے اعتبار کے بارے میں بھی بیان ہوا۔ اب لازم ہے

خلاصہ کے طور پر شیعوں کے فقہی طریقہ کار کے بارے میں بھی اشارہ کریں اوراس جماعت کے بعض فقہی مسائل کی طرف، جن کے بارے میں یہ گروہ ایک خاص نظریہ کا قائل ہے اشارہ کریں۔

۱۴۲ اویں اصل:

ہم سب جانتے ہیں کہ وضو مقدمات نماز میں سے ایک ہے۔سورہ مبارکہ مائدہ میں بیان ہوا ہے:

﴿یاایّھاالذین آمنوا اذا قمتم الی الصوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وأرجلکم الی الکعبین﴾ (مائدہ/۶)

''ایمان والو جب بھی نماز کے لئے اٹھو تو پہلے اپنے چہروں اور کہنیوں تک اپنے ہاتھوں کو دھوؤ اور اپنے سر اور ٹخنے تک پیروں کا مسح کرو۔''

پہلے جملہ''فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الیٰ المرافق''میں لفظ''أیدی''استعمال ہوا ہے جو''ید''کی جمع ہے۔چونکہ اولاً کلمہ ''ید'' عربی زبان میں مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے،گاہی صرف انگلیوں کو ''ید'' کہا گیا ہے،گاہی انگلیوں سے کلائی تک،گاہی انگلیوں سے کہنی تک اور گاہی انگلیوں سے کندھے تک''ید'' یعنی ہاتھ اطلاق ہوتا ہے۔ثانیاً ہاتھ دھونے کی واجب مقدار کہنی سے انگلیوں کے آخر تک ہے لہٰذا قرآن مجید نے کلمہ ''الی المرافق''کا استعمال کیا ہے تا کہ واجب مقدار بیان ہو جائے۔لہٰذا''الی المرافق'' میں کلمہ ''الی''دھونے کی مقدار بیان کرتا ہے نہ دھونے کی کیفیت (مثلاً اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر کی طرف دھویا جائے) بلکہ دھونے کی کیفیت عرف عام اور لوگوں کی عادت سے مربوط ہے کہ عموماً ہاتھ دھوتے وقت اوپر سے نیچے کی طرف دھوتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر طبیب حکم

دے کہ بیمار کے پاؤں کو گھٹنوں تک دھویا جائے تو اس کے پاؤں کو اوپر سے نیچے کی طرف دھوتے ہیں نہ برعکس۔ اس بناء پر شیعہ امامیہ معتقد ہیں کہ وضو کرتے وقت منہ اور ہاتھوں کو اوپر سے نیچے کی طرف دھونا چاہیے اور اس کے برعکس کو صحیح نہیں جانتے۔

دوسرا مسئلہ پاؤں کا مسح ہے۔ فقہ شیعہ کہتی ہے کہ پاؤں کو مسح کرنا چاہیے نہ کہ دھویا جائے۔ اور ان کی دلیل بھی مختصر طور پر یہ ہے کہ سورہ مائدہ کی آیت ٦ کا ظاہر اس امر کو بیان کرتا ہے کہ نماز گزار انسان وضو کے وقت دو فریضے رکھتا ہے: ایک دھونا (منہ اور ہاتھ کا) دوسرا مسح (سر اور پاؤں کا)۔ یہ مطلب مندرجہ ذیل دو جملوں کے تقارن اور مقابلہ سے واضح ہوتا ہے:

١۔ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق

٢۔ وامسحوا برؤوسکم وارجلکم الی الکعبین

اگر ہم یہ دو جملے ایک عرب زبان کے سامنے رکھیں جو کسی خاص فقہی مزاج سے آگاہ نہ ہو تو کسی تذبذب کے بغیر کہے گا کہ اس آیت کے مطابق ہمارا فرض منہ اور ہاتھ کو دھونا اور سر اور پاؤں کو مسح کرنا ہے۔

ادبی قواعد کے مطابق بھی لفظ ''أرجُلَکُم'' کلمۂ ''رؤوسکم'' پر عطف ہونا چاہیے کہ اس کا نتیجہ وہی پاؤں پر مسح کرنا ہے اور اس کو پہلے جملۂ ''وأیدیکم'' پر عطف نہیں کیا جاسکتا جس کا نتیجہ پاؤں کو دھونا نکلے۔ اگر ایسا کریں تو معطوف ''وأرجلکم'' اور معطوف علیہ ''وایدیکم'' کے درمیان جملۂ معترضہ ''فامسحوا برؤوسکم'' قرار پائے گا، جو عربی زبان کے قواعد کے مطابق صحیح نہیں ہے اور مقصود بیان کرنے میں اشتباہ کا سبب بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ آیت کے اس حصہ (پاؤں پر مسح کرنا) کو ''جر'' یا ''نصب'' سے پڑھنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں قرائتوں کی صورت میں کلمہ ''ارجلکم'' کلمہ ''رؤوسکم'' پر عطف ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اگر اس کے ظاہر پر عطف ہوجائے تو مجرور (أرْجُلِکُمْ) اور اگر اس کے محل پر عطف ہوجائے تو منصوب (أرْجُلَکُمْ) پڑھا جائے گا۔

ائمہٴ اہل بیت علیہم السلام سے متواتر روایتیں اس امر کو بیان کرتی ہیں کہ وضو دو چیزوں سے تشکیل پاتا ہے: ''غسلتان'' (دو دھونا) و ''مسحتان'' (دو مسح)۔ امام باقر علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وضو کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پاؤں پر مسح کرتے تھے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ نہ صرف اہل بیت اطہار علیہم السلام وضو کے وقت پاؤں پر مسح کرتے تھے بلکہ صحابیوں اور تابعین کی ایک جماعت بھی اسی نظریہ پر قائم تھی، لیکن بعد میں بعض وجوہات کی بنا پر کچھ مسلمانوں نے سنت مسح کو دھونے میں تبدیل کر دیا، اس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

۴۳ اویں اصل:

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ حالت نماز میں زمین پر یا اس چیز پر جو زمین سے اگتی ہو (بشرطیکہ یہ چیز کھانے یا پہننے میں استعمال نہ ہوتی ہو) سجدہ کرنا چاہئے، اور اختیار کی حالت میں ان دو چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل شدہ ایک حدیث میں، جسے اہل سنت نے بھی نقل کیا ہے، اس مطلب کی صراحت اور وضاحت ہوئی ہے: وَجُعِلَتْ لِیَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَ طَهُوْرًا (۱)۔ کلمہٴ ''طہور'' جو تیمم کی دلالت کرتا ہے، اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ''ارض'' کا مقصد طبیعی زمین ہے جو پتھر، مٹی اور ان دو چیزوں کے مانند دوسری چیزوں سے تشکیل پاتی ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلسُّجود لایَجُوْزُ اِلَّا عَلَی الأَرضِ أوْ عَلَیٰ ما أنْبَتَ الأرْضُ اِلَّا مَااُکِلَ أوْ لُبِسَ (۲)

عصر رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مسلمان مسجد کی زمین پر سجدہ کرتے تھے جو سنگ

۱۔ صحیح بخاری: ۱/۹۱، کتاب تیمم حدیث ۲۔

۲۔ وسائل، ج ۳، باب ۱، از ابواب ''مایسجد علیہ'' حدیث اول، ص ۵۹۱۔

ریزوں سے مفروش تھی۔ جب شدت کی گرمی کی وجہ سے سنگ ریزے گرم ہوتے تھے اور ان پر سجدہ کرنا مشکل ہوتا تھا، تو انھیں ہاتھ میں اٹھاتے تھے تاکہ سرد ہوجائیں پھر ان پر سجدہ کرتے تھے۔ جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں: ''میں نماز ظہر کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت میں ادا کررہا تھا، مٹھی بھر سنگ ریزوں کو ہاتھ میں لیکر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر پھیر لیتا تھا تاکہ سرد ہوجائیں پھر نماز کی حالت میں ان پر سجدہ کرتا تھا۔''(۱)

ایک صحابی جو اپنی پیشانی کو خاک آلود ہونے سے بچاتا تھا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حکم دیا: ''ترّب وجهک'' اپنے چہرے کو خاک آلود کر(۲)۔ اسی طرح اگر کبھی بعض افراد اپنے عمامہ کے ایک کونے پر سجدہ کرتے تھے تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے عمامے کو پیشانی کے نیچے سے کھینچ لیتے تھے(۳)۔ یہ سب احادیث اس امر کی دلیل ہیں کہ عصر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ابتداء میں مسلمانوں کا فرض پتھر اور مٹی پر سجدہ کرنا تھا اور وہ ہرگز فرش یا لباس یا عمامہ کے گوشے پر سجدہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن بعد میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی ہوئی کہ حصیر اور چٹائی پر بھی سجدہ کرسکتا ہیں، اور بہت سی روایتیں اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حصیر اور چٹائی پر بھی سجدہ کرتے تھے۔(۴)

البتہ عذر کے موقعوں پر اکثر بعض صحابی اپنے لباس پر بھی سجدہ کر لیتے تھے، چنانچہ انس بن مالک کہتے ہیں: ''ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اگر ہم میں سے کوئی زمین پر اپنی پیشانی رکھنے سے معذور ہوتا تو اپنے عمامہ کے کونے یا اپنے لباس پر سجدہ کرلیتا تھا۔''(۵)

۱۔ مسند احمد: ۳۲۷/۳، حدیث جابر، سنن بیہقی: ۴۳۹/۱۔

۲۔ کنز العمال: ۴۶۵/۷، حدیث نمبر ۱۹۸۱۰۔

۳۔ سنن بیہقی: ۱۰۵/۲۔

۴۔ مسند احمد: ۱۷۹/۶، ۳۸۹، ۳۳۱، ۳۷۷، ۱۹۲/۳-۱۹۸۔

۵۔ صحیح بخاری: ۱۰۱/۱، صحیح مسلم: ۱۰۹/۱۔

اس بناء پر، شیعہ امامیہ ہمیشہ اس اصول کے پابند رہے ہیں اور صرف زمین یا زمین سے اگنے والی غیر ماکول اور غیر ملبوس چیزوں، جیسے حصیر اور چٹائی پر سجدہ کرتے ہیں۔ اور اگر شیعہ اس بات پر مصر ہیں کہ حتی الامکان صرف مٹی، پتھر یا چٹائی اور ان جیسی چیزوں پر سجدہ کیا جائے تو اس کی دلیل یہی ہے۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ اسلامی ملکوں میں مسجدوں کو ایسے تعمیر کیا جائے کہ تمام مذاہب کے پیرو اپنے فرائض پر عمل کر سکیں۔

آخر میں اس نکتہ پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ پتھر اور مٹی "مسجودٌ علیه" ہیں نہ "مسجودٌ له" (ان پر سجدہ ہوتا ہے، ان کو نہیں کیا جاتا ہے) بعض اوقات غلط تصور کیا جاتا ہے کہ شیعہ پتھر کو سجدہ کرتے ہیں حالانکہ وہ دیگر تمام مسلمانوں کی طرح صرف خدا کے لئے سجدہ کرتے ہیں اور خدا کی بارگاہ میں خضوع اور تذلل کے ساتھ پیشانی کو خاک پر رکھکر دل میں کہتے ہیں: "این التراب و ربّ الارباب"

۱۴۴ویں اصل:

ہر مسلمان پر واجب ہے کہ روزانہ پانچ وقت نماز ادا کرے۔ ان کے شرعی اوقات قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں: ظہر سے غروب تک نماز ظہر وعصر کا وقت ہے، مغرب سے نصف شب تک نماز مغرب وعشا کا وقت ہے اور طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک نماز صبح کا وقت ہے۔

شیعوں کا اعتقاد ہے کہ ظہر سے غروب تک دو نمازوں کا مشترک وقت ہے۔ لیکن اوّل وقت میں چار رکعت کا وقت نماز ظہر کا مخصوص وقت ہے اور آخر وقت میں چہار رکعت کا وقت نماز عصر کیلئے مخصوص ہے۔ اسلئے مذکورہ دو اختصاصی وقت کے علاوہ ،انسان دونوں نمازوں کو مذکورہ زمانی فاصلہ کے اندر جب چاہے پڑھ سکتا ہے اور ان کے وقتِ فضیلت کو صرف نظر کر سکتا ہے اگر چہ ان دونوں نماروں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے ان کے وقت فضیلت میں بھی پڑھ سکتا ہے۔ (ظہر کی فضیلت کا وقت اول زوال سے اس وقت تک ہے کہ شاخص کا سایہ خود شاخص کے برابر ہو جائے۔ عصر کی فضیلت کا وقت تب ہے جب شاخص

کا سایہ خود شاخص کے دوگنا ہو جائے)

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا زالت الشمس دخل الوقتان الظهر والعصرواذا غابت الشمس دخل الوقتان المغرب والعشاء الآجرة. (۱)

''جب آفتاب نصف آسمان پر پہنچے تو نماز ظہر وعصر پڑھنے کا وقت پہنچتا ہے اور جب آفتاب غروب ہوتا ہے تو نماز مغرب وعشا کا وقت داخل ہوتا ہے۔''

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذازالت الشمس فقددخل وقت الظهروالعصرجميعًاالاانّ هذه قبل هذه،ثم انت فى وقت منهما جميعًا حتىٰ تغيب الشمس. (۲)

''جب آفتاب حد زوال پر پہنچتا ہے تو نماز ظہر وعصر کا وقت پہنچتا ہے، بجز اس کے کہ نماز ظہر، عصر کی نماز سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔اس کے بعد تم آزاد ہو ان دونوں نمازوں کو جب چاہو ادا کرو یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو جائے۔''

امام باقر علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی عذر وعلت کے بغیر نماز ظہر وعصر کو ایک ساتھ بجالاتے تھے(۳)۔

اصولی طور سے بعض مواقع پر دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کے سلسلے میں تمام فقہائے

۱۔ وسائل الشیعہ: ج ۳، ابواب مواقیت، باب ۴، روایت ۱

۲۔ وسائل الشیعہ: ج ۳، ابواب مواقیت، باب ۴، روایت ۱

۳۔ وسائل الشیعہ: ج ۳، ابواب مواقیت، باب ۴، روایت ۱۔

اسلام کا اتفاق نظر ہے۔عرفات اور مزدلفہ میں تمام فقہا نماز ظہر وعصر یا مغرب وعشا کو ایک ساتھ پڑھنے کو جائز جانتے ہیں۔اسی طرح بہت سے سنّی فقہا سفر میں دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا جائز جانتے ہیں۔اور لوگوں سے شیعوں کا فرق یہ ہے کہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر مذکورہ دلیلوں کی بنا پر (نمازوں کو اپنے وقت فضیلت میں پڑھنے کو افضل سمجھتے ہوئے) دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کو مطلقاً جائز جانتے ہیں۔اس امر کا فلسفہ، جیسا کہ احادیث میں بیان ہوا ہے، مسلمانوں پر فرائض کو آسان کرنا ہے۔اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت دفعہ کسی عذر (جیسے سفر، بیماری وغیرہ) کے بغیر دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا ہے تا کہ امت کے لئے راہ آسان کریں۔اب جو چاہے نماز کو ایک ساتھ پڑھے اور جو چاہے دو نمازوں کو الگ الگ پڑھے۔

مسلم اپنی کتاب صحیح مسلم میں نقل کرتے ہیں:

صلّیٰ رسول الله الظهر والعصر جميعًا والمغرب والعشاء جميعًا فی غير خوف ولا سفرٍ.(۱)

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز ظہر وعصر اور مغرب وعشا کو، دشمن کے خوف کے بغیر اور سفر میں نہ ہونے کے باوجود ایک ساتھ ادا فرمایا۔"

بعض روایتوں میں اس عمل کا فلسفہ بیان ہوا ہے، چنانچہ ایک روایت میں یوں بیان ہوا ہے:

جمع النّبی صلی الله علیه و آله وسلم بين الظهر و العصر و بين المغرب والعشاء فقيل له فی ذلک فقال صنعتُ هذا لئلا تحرج امتی.(۲)

"پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز ظہر وعصر اور مغرب وعشا کو ملا کر پڑھا جب ان سے اس کی علت کے بارے میں سوال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے اسلئے ایسا کیا ہے تا کہ میری امت رنج وسختی میں نہ پڑے۔"

۱۔صحیح مسلم: ۲/۱۵۱، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر۔

۲۔موطأ مالک پر زرقانی کی شرح، ج۱، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر والسفر، ص ۲۹۴۔

صحاح اور مسانید میں جو روایتیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو نمازیں ایک ساتھ بجالانے کے بارے میں بیان ہوئی ہیں، ان کی تعداد اکیس سے زائد ہے۔ ان میں سے بعض سفر سے متعلق، بعض خارج از وقتِ سفر اور مرض و بارش سے مربوط ہیں۔ بعض روایتوں میں دو نمازوں کو ایک ساتھ ادا کرنے کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہوا ہے جن کا مقصد مسلمانوں پر فرائض کی ادائیگی میں آسانی پیدا کرنا ہے۔ شیعہ فقہانے اسی سہولت سے استفادہ کرتے ہوئے دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے۔ دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کی کیفیت وہی ہے جس طرح تمام مسلمان عرفات اور مزدلفہ یا سفر میں انجام دیتے ہیں۔

اکثر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ پہلی نماز کو اس کے (وقت فضیلت کے) آخری وقت میں (مثلاً شاخص کے سائے کے خود شاخص کے برابر ہونے پر) اور دوسری نماز کو عصر کے ابتدائی وقت میں پڑھے۔ اس طرح نماز گزار حقیقت میں دونوں نمازوں کو اپنے وقت میں پڑھ لے گا، اگر چہ وہ ایک کو آخر وقت میں اور دوسری کو اپنے وقت کی ابتداء میں پڑھتا ہے۔

یہ تصور ظاہر روایات کے خلاف ہے۔ کیونکہ جیسا کہ بیان ہوا، دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کی کیفیت وہی ہے جو تمام مسلمان عرفات اور مزدلفہ میں انجام دیتے ہیں، اس طرح کہ عرفات میں دونوں نمازوں کو ظہر کے وقت اور مزدلفہ میں دونوں نمازوں کو عشا کے وقت پڑھتے ہیں۔ اس لئے جس جمع کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی بیان ہو چکا ہے وہ یہی مذکورہ جمع ہونا چاہئے نہ ایسی جمع کہ ایک نماز کو آخر وقت میں پڑھا جائے اور دوسری کو اوّل وقت میں پڑھا جائے۔

اس کے علاوہ بعض روایتوں میں دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کا فلسفہ امت کے لئے وسعتِ وقت اور آسائش بیان ہوا ہے، اور بعض روایات میں رفع حرج۔ اور یہ امر اسی صورت میں محقق ہو سکتا ہے جب نماز گزار کے لئے دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کے سلسلے میں آزادی اور اختیار ہو، یعنی نماز ظہر و عصر یا مغرب و عشا کو (وقت وسعت میں) جب چاہے پڑھ لے تا کہ

رفع حرج محقق ہو سکے۔ اس کے علاوہ دونمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کی اس تفسیر کی بنیاد پر کہنا چاہیے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی جدید اور نئی چیز نہیں پیش کی ہے، کیونکہ اس طرح اکھٹے دونمازیں پڑھنا پیغمبر کے عمل سے پہلے بھی جائز اور رائج تھا اور ہر مسلمان نماز ظہر کو آخری وقت میں اور عصر کو اول وقت پڑھ سکتا تھا۔

شیعہ فقہا نے دونمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کے دلائل کے بارے میں وسیع تحقیقی مقالات لکھے ہیں۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے افراد ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

۱۴۵ ویں اصل:

فقہ شیعہ کتاب وسنت کی رہنمائی میں دو قسم کے ازدواج کے صحیح ہونے کے قائل ہیں: ''دائمی عقد''، یہ مسئلہ محتاجِ وضاحت نہیں اور ''عارضی عقد'' یا ''متعہ'' جس کی کیفیت ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

مرد اور عورت جن کے باہم عقد کرنے میں کسی قسم کی شرعی رکاوٹ (نسب اور رضاع وغیرہ کی صورت میں) نہ ہو، مہر مقرر کرنے کے بعد ایک معین مدت کے لئے ازدواجی زندگی کا رشتہ جوڑ سکتے ہیں اور مدت کے تمام ہونے کے بعد صیغہ طلاق جاری کیے بغیر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان دو زن وشوہر سے کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو وہ ان کا شرعی فرزند ہے اور دونوں (ماں باپ) سے وراثت لے سکتا ہے۔ عورت کو بھی مدت تمام ہونے کے بعد عدہ شرعی کی رعایت کرنا ہوگی۔ اگر وہ حاملہ ہو تو اسے بچے کی پیدائش تک صبر کرنا ہوگا اور دوسری شادی سے اجتناب کرنا ہوگا۔

متعہ (موقت شادی) کیفیت کے لحاظ سے عقد دائمی سے مختلف نہیں ہے۔ تمام احکام جو عقد دائمی پر لاگو ہیں وہی متعہ (موقت عقد) پر بھی لاگو ہیں۔ جو بنیادی فرق ان دوشادیوں میں ہے، درج ذیل دو مطلب میں خلاصہ ہوتا ہے:

۱۔متعہ میں مدت کا معین ہونا۔

۲۔ادائیگی نفقہ کا متعہ میں واجب نہ ہونا۔

ان دو مطالب کے علاوہ ان دو شادیوں میں دیگر اختلافات اتنے جزئی ہیں کہ کوئی خاص فرق پیدا نہیں کرتے۔

چونکہ اسلام ایک جامع اور آخری دین ہے، اسلئے اس نے جنسی بحرانوں کو حل کرنے کے لئے اس قسم کا منصوبہ پیش کیا ہے۔ایک ایسے جوان کے بارے میں سوچئے جو بیرون ملک تعلیم حاصل کررہا ہے یا کسی کام میں مشغول ہے اور عقد دائمی کی قدرت نہیں رکھتا۔اس صورت حال میں اس کا فریضہ کیا ہے؟معلوم ہے کہ اس جوان کو مندرجہ ذیل تین راہوں میں سے ایک کو اپنانا ہوگا:

الف۔خودداری کے تحت اپنی آپ کو جنسی خواہشات سے محروم کرے۔

ب۔بدکردار اور بیمار عورتوں سے ناجائز تعلقات کا برقرار کرے۔

ج۔متعہ (وقتی شادی) سے استفادہ کر کے ایک پاک دامن خاتون سے اس طرح ازدواجی زندگی کرے کہ رفع مشکل کے ساتھ ساتھ اس پر مالی بوجھ نہ پڑے۔

واضح ہے کہ مذکورہ مثال میں چوتھی کوئی راہ موجود نہیں ہے جس سے یہ جوان استفادہ کرے (البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ متعہ،ایسے ہی خاص حالات کے لئے مخصوص ہے،لیکن پھر بھی ایسے حالات اس کے شرعی طور پر اس کے وجودی فلسفہ کا سبب ہو سکتے ہیں۔)

ضمناً یہ امر قابل توجہ ہے کہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے فقہا بھی ایک قسم کے عقد دائمی کی تائید کرتے ہیں کہ درحقیقت وہ بھی وہی متعہ ہے،اور وہ یہ ہے کہ ایک مرد اور عورت آپسمیں دائمی عقد کرتے ہیں لیکن ان میں سے ایک یا دونوں جانتے ہیں کہ ایک مدت کے بعد طلاق کی صورت میں ایک دوسرے سے جدا ہو جانا چاہئے۔اس قسم کی شادی درحقیقت ازدواج موقت یعنی ''متعہ'' ہے صرف نام میں فرق ہے۔

قرآن مجید اور سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متعہ کی مشروعیت کی تائید کرتے ہیں۔قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿فَمَا استمتعتم به منهنّ فاتوهنّ اجورهنّ فريضة﴾ (نساء:۲۴)

''پس جو بھی ان عورتوں سے تمتع کرے ان کی اجرت انھیں بطور فریضہ دیدے۔''

مفسرین کی قریب بہ اتفاق اکثریت، اس آیت کے نزول کو متعہ سے مربوط جانتی ہے۔ اصولی طور پر اسلام میں اس قسم کے ازدواج کے شرعی ہونے میں کسی کو انکار نہیں ہے، اگر اس سلسلے میں کوئی اختلاف ہے تو اس آیت کے منسوخ ہونے اور نہ ہونے میں ہے، فریقین (سنی وشیعہ) کی روایتیں اس امر کی گواہ ہیں کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا ہے بلکہ چند وجوہات کی بنا پر خلیفہ دوم کی خلافت کے دوران اس حکم پر عمل درآمد کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اتفاق سے خود خلیفہ دوم کی بات بھی اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں متعہ جائز تھا اور صاف ظاہر ہے کہ اس کی ممانعت میں ان کی ذاتی رائے کے علاوہ اور کوئی پہلو نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے یوں کہا ہے:

ایهاالناس ثلاثٌ كنَّ على عهدرسول الله أناانهىٰ عنهنّ وأُحرّمهنّ وأُعاقب عليهنّ وهى متعة النساء ومتعة الحج وحيّ علىٰ خيرالعمل.

''اے لوگوں تین چیزیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں رائج تھیں میں ان سے نہی کرتا ہوں اور انھیں حرام قرار دیتا ہوں جس کسی کو ان کا مرتکب پایا جائے گا اسے سزا دی جائے گی. وہ تین چیزیں یہ ہیں: عورتوں سے متعہ، متعہ ءحج اور حی علیٰ خیر العمل۔''(۱)

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پہلے اور تیسرے مسئلہ میں خلیفہ کی ممانعت ابھی تک اپنی قوت کے ساتھ باقی ہے، لیکن متعہ حج -خلیفہ کے نظریہ کے خلاف- تمام مسلمان انجام دیتے ہیں۔ (متعہ حج کا مقصد یہ ہے کہ خانہ ء خدا کا زائر عمرہ اور اعمال حج کے درمیان حالت احرام سے باہر جائے اور محرم ہونے کی وجہ سے حرام شدہ چیزیں پھر سے اس پر حلال ہو جائیں۔)

۱۔ شرح مزید بحث امامت، ص۳۶۴ وغیرہ

اس امر کی واضح دلیل کہ پیغمبر اسلام نے متعہ سے نہی نہیں کی ہے، یہ ہے کہ عمران بن حصین سے بخاری نے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا:

آیہ متعہ کتاب خدا میں نازل ہوئی، ہم نے بھی رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس پر عمل کیا۔ اور ہرگز اس کے تحریم میں کوئی دوسری آیت نازل نہیں ہوئی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات تک اس سے نہی نہیں فرمائی۔ اس کے بعد ایک شخص نے اپنی رائے کی بنا پر اس سلسلے میں حکم صادر کیا۔ (یہاں پر متعہ کو خلیفہ دوم کے ذریعہ حرام قرار دینے کی طرف اشارہ ہے۔)(۱)

۱۴۶ اویں اصل:

فقہ امامیہ کے مطابق ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا بدعت و حرام ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

لایجمع المسلم یدیه فی صلاته وهو قائمٌ بین یدیّ الله یشبّه باهل الکفرمن المجوس(۲)

''نماز گزار، جب خدا کے سامنے کھڑا ہو جائے تو اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے اوپر قرار نہ دے یہ عمل مجوسی کفار کا شیوہ ہے۔''

ایک بڑے صحابی، ابوحمید ساعدی نے صحابیوں کی ایک جماعت کے سامنے جن کے درمیان ابوہریرہ دوسی، سہل ساعدی، ابواسید ساعدی، ابوقتادہ، حارث بن ربعی اور محمد بن مسلمہ بھی موجود تھے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کی کیفیت بیان کی اور تمام چھوٹے بڑے مستحبات بھی بیان کئے، لیکن ہاتھ باندھ کے نماز پڑھنے کے بارے میں کچھ نہ کہا(۳)

۱۔ صحیح بخاری: ۶/ ۲۷، بخش تفسیر سورہ بقرہ کی آیہ ۱۹۶ کے ذیل میں۔

۲۔ وسائل الشیعہ، ج ۴، باب ۱۵، از باب قواطع نماز، حدیث ۷۔

۳۔ بیہقی، سنن: ۲/ ۷۲، ۷۳، ۱۰۱، ۱۰۲، ابوداؤد، سنن: ۱/ ۱۹۴، باب افتتاح الصلاۃ حدیث ۷۳۰، ۷۳۶، ترمذی، سنن: ۲/ ۹۸، باب عقد الصلاۃ)

ظاہر ہے کہ شیوہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا ہوتا تو وہ ضروری ذکر کرتے یا حضار یاددلاتے۔ساعدی کی حدیث کی مشابہ حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی حماد بن عیسیٰ کے ذریعہ ہماری حدیث کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔(۱) سہل ابن سعد کی حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وجود میں آیا ہے۔وہ کہتے ہیں: کان الناس یؤمرون "لوگوں کو حکم دیا گیا تھا" اگر یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہوتا تو، اس کام کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کرتے۔(۲)۔

۴۷ ویں اصل:

نماز "تراویح" پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی میں مستحبات مؤکدہ میں سے ہے۔شیعہ فقہ بتاتی ہے: مستحب ہے کہ انسان ماہ رمضان کی تمام شبوں میں ہزار رکعت نماز پڑھے، لیکن ان نمازوں کا باجماعت پڑھنا بدعت ہے بلکہ ان کو فرادیٰ صورت میں مسجد بلکہ بیشتر گھر میں ادا کرنا چاہئے۔زید ابن ثابت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ، مرد کے لئے گھر میں نماز پڑھنا مسجد کی نسبت افضل ہے، لیکن واجب نماز کو مسجد میں پڑھنا مستحب ہے(۳)۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مستحب نمازوں کو باجماعت نہیں پڑھا جاسکتا۔دین میں ہر قسم کی بدعت گمراہی کا سبب بنتی ہے اور اس کا انجام آتش جہنم ہے۔" (۴)

امام رضا علیہ السلام اپنے ایک رسالہ میں جسے آپ علیہ السلام نے ایک فرد مسلمان کے

۱۔ وسائل الشیعہ: باب اول من ابواب افعال الصلاۃ، حدیث ۸۱۔

۲۔ فتح الباری: ۲/۲۲۴ وسنن بیہقی: ۲/۲۸۔

۳۔ طوسی: خلاف، کتاب صلوٰۃ، مسئلہ ۲۶۸۔

۴۔ صدوق، خصال: ۲/۱۵۲۔

عقائد واعمال کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے، ذکر کیا ہے کہ "مستحبی نمازوں کو باجماعت نہیں پڑھا جا سکتا، اور یہ کام بدعت ہے(۱)۔"

نماز تراویح کو باجماعت پڑھنے - جو اہل تسنن میں رائج ہے - کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس عمل کو اجتہاد بالرائے نے شرعی حیثیت بخشی ہے، حتیٰ اسے بدعت حسنہ کہا گیا ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے، حاشیہ میں دئے گئے حوالہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں (۲)۔

۱۴۸ ویں اصل:

تمام فقہائے اسلام معتقد ہیں کہ جنگی غنائم جہاد کرنے والوں میں تقسیم ہوتے ہیں، لیکن اس کا پانچواں حصہ (خمس) خاص موارد میں مصرف ہونا چاہئے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں فرماتا ہے:

واعلموا أنما غنمتم من شيءٍ فانّ الله خمسه والرسول ولذی القربی والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل... (انفال:۴۱)

"اور یہ جان لو کہ تمہیں جس چیز سے بھی فائدہ حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، رسول کے قرابتداروں، ایتام، مساکین اور مسافران غربت زدہ کے لئے ہے..."

شیعہ فقہا اور دیگر فقہا کے درمیان جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ دیگر فقہانے خمس کو جنگی غنیمت تک ہی محدود جانا ہے اس کے علاوہ اس فریضہ کے قائل نہیں ہیں۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت غنائم جنگی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

۱۔ صدوق، عیون اخبار رضا، ج ۲، ص ۱۲۴۔

۲۔ قسطلانی، ارشاد الساری: ۳/ ۲۲۶، عینی، عمدۃ القاری ۱۰/ ۱۲۶، شاطبی، الاعتصام ۲/ ۲۹۱۔

لیکن یہ مطلب درج ذیل دو نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے:

۱-لغت عربی میں جو چیز انسان کے ہاتھ آئے، اسے غنیمت کہا جاتا ہے اور یہ غنیمت جنگی سے مخصوص نہیں ہے۔ چنانچہ ابن منظور کہتے ہیں:

الغنم الفوذ بالشئی من غیر مشقة (۱)

''غنیمت کسی چیز کا محنت ومشقت کے بغیر ہاتھ آنا ہے۔''

اس کے علاوہ قرآن مجید نے بھی اسے جنّت کی نعمتوں میں استعمال کیا ہے اور فرماتا ہے:

﴿فعند اللہ مغانم کثیرة﴾ (نساء:۹۴)

''اور خدا کے پاس بکثرت فوائد پائے جاتے ہیں۔''

اصولاً ''غنیمت''، ''تاوان'' کے مقابلے میں ہے۔ اگر انسان کو کسی نفع اور فائدے کے بغیر کوئی رقم ادا کرنے پر مجبور کیا جائے تو اسے ''تاوان'' کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی نفع اس کے ہاتھ آئے تو اسے ''غنیمت'' کہتے ہیں۔

اسلئے اس آیت کو غنایم جنگی سے مخصوص کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے اور اس آیت کا ''جنگ بدر'' کے غنائم کے سلسلے میں نازل ہونا جنگ سے اختصاص کی دلیل نہیں بنتا ہے۔ اور تمام آمدنی میں خمس کا قانون ایک کلی قانون ہے اور نازل شدہ آیت کے لئے مخصص نہیں ہے۔

۲-بعض روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر قسم کی آمدنی پر خمس ادا کرنا واجب قرار دیا ہے۔ اس کے بعد قبیلہ عبد القیس میں سے ایک جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سوال کیا: ہمارے اور آپ کے درمیان دشمن حائل ہیں اور ہم صرف حرام مہینوں میں (جب امنیت برقرار ہے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور آسکتے ہیں۔ مہربانی کرکے ایسے احکام بیان فرمایئے کہ ان پر عمل کرکے ہم بہشت میں داخل ہوں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم لوگوں کو ایمان کی تلقین کرتا ہوں۔''

۱۔ لسان العرب، کلمہ غنم، اس معنی کے نزدیک ہے۔ کلام ابن اثیر النہایہ میں اور کلام فیروز آبادی قاموس اللغۃ میں۔

پھر ایمان کی تفسیر میں فرمایا:

''شهادة ان لاالہ الااللہ واقام الصلاة،وایتاء الزکاة، و تعطوا الخمس من المغنم''(۱)

''خدا کی وحدانیت پر شہادت،نماز قائم کرنا،زکات ادا کرنااوراپنی آمدنی کاپانچواں حصہ (خمس) ادا کرنا''

یقیناً اس حدیث میں ''غنیمت'' غیر جنگی آمدنی ہے،چونکہ سائل کہتا ہے:''ہم ایسے مقام پر ہیں کہ پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک رسائی نہیں رکھتے،یعنی مشرکین کے ڈر سے مدینہ نہیں آسکتے۔''ایسے افراد جومشرکین کے محاصرے میں تھے،مشرکین سے جہاد کی طاقت نہیں رکھتے تھے خمس ادا کرتے۔

اس کے علاوہ ہرقسم کی آمدنی سے خمس کی ادائیگی کے واجب ہونے کے سلسلے میں ائمہ اطہار علیہم السلام کی روایتوں میں صراحت ہوئی ہےاورکسی قسم کاابہام باقی نہیں ہے(۲)۔

فقہ سے مربوط یہ چندفروعی مسائل ہیں کہ شیعہ ان کے سلسلے میں خاص نظریہ رکھتے ہیں۔البتہ شیعوں کے دوسرے مذاہب سے فروعی مسائل میں اختلاف ان ہی مذکورہ چندمسائل تک محدود نہیں ہیں۔بلکہ ''خمس''،''وصیت''اور''ارث'' کے ابواب میں بھی شیعہ اختلاف نظر رکھتے ہیں۔لیکن اس کےباوجود شیعوں کادوسروں کے ساتھ احکام کے کلیات میں اشتراک،تطبیقی صورت میں فقہ کی تدریس،خاص کرخاندان وحی کے مستدل آراء کی طرف خصوصی توجہ جیسے امور شیعہ سنی کے درمیان اختلافات کے فاصلہ کوکم کرسکتے ہیں۔

۱۴۹ ویں اصل:

اسلامی تہذیب،امت اسلامیہ کی مسلسل کوششوں کی مرہون منت ہے۔مسلمان،گوناگون

۱۔صحیح بخاری ج۴،ص۲۵۰۔

۲۔وسائل الشیعہ،ج۶،کتاب خمس،باب اول۔

قومیتوں سے تعلق رکھنے کے باوجود، ایمان وعقیدے کے سائے میں اسلام اور اس کی خدمت میں ذوب ہوکر اپنی تمام جدوجہد کو اسلام کے عالی مقاصد کی کامیابی کے لئے عمل میں لائے، اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی کہ اس وقت بھی انسانی سماج اس درخشان تہذیب کا مرہون منت ہے۔

اس سلسلے میں، اسلامی تہذیب کی شاندار عمارت کی تعمیر میں شیعوں کا مؤثر اور نمایاں رول رہا ہے۔ بجا ہے کہ یہاں پر ہم علوم اسلامی اور تہذیب سے متعلق کتابوں کی ورق گردانی کریں جن میں ہر جگہ شیعہ دانشوروں کے نام روشن ہیں:

ادبیات اور علوم ادبیات میں، بس اتنا کافی ہے کہ اس علم کی بنیاد ڈالنے والے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام علیہ السلام تھے اور آپ علیہ السلام کی اس راہ کو آگے بڑھانے والا آپ کا شاگرد ابوالاسود دوئلی اور اس کے بعد دیگر شیعی شخصیات جو زیادہ تر عراق میں رہتے تھے، جیسے: مازنی (متوفی ۲۴۸)، ابن سکیت (متوفی ۲۴۴)، ابو اسحاق نحوی (محبان امام موسیٰ کاظم میں سے)، کتاب "العین" کے مؤلف خلیل ابن احمد فراہی (متوفی ۱۷۰)، کتاب الجمہرہ کے مؤلف ابن دُرَید (متوفی ۳۲۱) اور کتاب "المحیط" کے مؤلف صاحب بن عبّاد (متوفی ۳۸۶) اور ان کے علاوہ سیکڑوں شیعہ ادیب جن میں سے ہر ایک کو اپنے زمانے میں لغت، صرف ونحو اور شعر وعروض میں صاحب کمال سمجھا جاتا تھا۔

علم تفسیر میں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد پہلے مفسر امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اور آپ علیہ السلام کے بعد اہل بیت اطہار تھے ان کے بعد عبد اللہ ابن عباس (متوفی ۶۸) اور اہل بیت علیہم السلام کے دیگر شاگرد تھے، جنہوں نے گزشتہ چودہ صدیوں کے دوران قرآن مجید کی مختلف صورتوں میں سیکڑوں تفسیریں لکھی ہیں۔ ہم نے "تبیان" شیخ طوسی کے مقدمے میں شیعوں کے تفسیر نگاری کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔

علم حدیث میں، شیعہ دیگر اسلامی فرقوں پر مقدم تھے۔ انہوں نے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس زمانے میں تحریر وتقریر کے ذریعے محفوظ کیا، جب کہ عصر خلفاء میں حدیث

لکھنا ممنوع قرار پایا تھا۔اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کے دوستداروں میں سے عبداللہ ابن ابی رافع، ربیع بن سمیع اور علی بن ابی رافع اوران کے بعد امام سجاد علیہ السلام، امام صادق علیہ السلام اور امام محمد باقر علیہ السلام کے شاگردوں میں نامور شخصیات قابل ذکر ہیں۔

عصر حضرت امام صادق علیہ السلام میں حدیث نے اس قدر نشو ونما پائی کہ حسن ابن علی الوشاء کے بقول: میں نے مسجد کوفہ میں نوسو محدثوں کو یہ کہتے ہوئے دیکھا: "حدثنی جعفر بن محمد"(۱)

فقہ کی قلمرو میں، ائمہ اطہار علیھم السلام کے مکتب سے تعلق رکھنے والے نامور فقہا نے تربیت پائی ہے، جیسے: ابان بن تغلب (متوفی ۱۴۱ر)، زرارہ بن امین (متوفی ۱۵۰)، محمد بن مسلم (متوفی ۱۵۰ر)، تیس کتابوں کے مؤلف صفوان بن یحییٰ بجلی (متوفی ۲۱۰ر) اوران کے علاوہ سیکڑوں زبردست مجتہد ومحقق جیسے شیخ مفید، سید مرتضیٰ، شیخ طوسی، ابن ادریس، محقق حلّی اور علامہ حلّی جنہوں نے قیمتی علمی سرمائے آثار اور یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔

شیعوں نے صرف مذکورہ علوم میں ہی نمایاں خدمات انجام نہیں دی ہیں بلکہ دیگر علوم، جیسے تاریخ، مغازی، رجال، درایہ اور شعروادب میں بھی عالم اسلام کے لئے ایسی شایان شان خدمات انجام دی ہیں کہ ہرایک کا ذکر یہاں پر ممکن نہیں۔

جو کچھ اب تک بیان ہوا وہ علوم نقلی سے مربوط تھا، لیکن علوم عقلی جیسے علم کلام اور فلسفہ میں بھی شیعہ دیگر تمام مذاہب سے آگے ہیں، کیونکہ شیعہ دیگر تمام فرقوں کی نسبت عقل کی اہمیت کے زیادہ قائل ہیں۔اورانہوں نے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اوران کے معصوم فرزندوں کی ارشادات سے الہام حاصل کر کے عقائد اسلامی کے تبیین میں حد سے زیادہ کوشش وسعی کی ہے اور عالیقدر متکلمین نیز عظیم فلاسفہ عالم اسلام کے سپرد کئے ہیں۔

شیعی علم کلام پرثمرترین مکاتب کلام اسلامی محسوب ہوتا ہے جو کتاب وسنت کے علاوہ عقل وفہم سے بھی مناسب استفادہ کرتا ہے۔

۱۔نجاشی، شمارہ ۷۹۔

اورامام جعفرصادق علیہ السلام کے عصرمیں آپ علیہ السلام کے نامور شاگرد جابرابن حیان علوم طبیعی میں ایسے مقام پر پہنچے تھے کہ انہیں آج بابائے علم کیمیا (کمسٹری) کے نام سے جاناجاتاہے۔

علم جغرافیا کی تدوین میں، احمد بن ابی یعقوب معروف بہ یعقوبی (متوفی ۲۹۰) وہ پہلاجغرافیادان تھاجس نے ''البلدان'' نامی کتاب تألیف کر کے عالم اسلام میں نام کمایا۔

شیعہ دانشوروں کی مذکورہ کوششیں پہلی صدی ہجری سے آج تک جاری ہیں اوراس راہ میں بہت سے حوزہ، مدارس اور یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔علم ودانش کی راہ میں یہ ادارے بشریت کی مسلسل خدمت کررہے ہیں۔جوکچھ بیان ہوا، یہ سب علم اوراسلامی تہذیب میں شیعوں کے عمل کے بارے میں ایک مختصراشارہ تھا۔تفصیلات کے لئے اس موضوع سے مربوط کتابوں کامطالعہ فرمائیں۔

۱۵۰ویں اصل:

شیعہ امامیہ، فروعات میں اختلاف کی موجودگی کووحدت اوراخوت اسلامی کے لئے رکاوٹ نہیں سمجھتے، اوراعتقادرکھتے ہیں کہ پرسکون ماحول میں علمی مناظروں اورمباحثوں کا انعقادکر کے بہت سے مشکلات اورفکری وفقہی اختلافات کو (جومسلمانوں کے اتحاداورسیاسی ہماہنگی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہیں) دورکیاجاسکتاہے اصولی طورپرذوق اورافکارمیں اختلافات کا وجودایک فطری امرہےاوردانشوروں کے لئے مناظرہ ومباحثہ کادروازہ بندکرناعلم ودانش کی موت کاسبب ہوسکتاہےجوبالاخرفکروخیال کی موت ہے۔اس لئے ہمارے علماءاوربزرگوں نے ہرزمانہ میں علمی وعقیدتی مباحث منعقدکر کے حقائق کوواضح کرنے کی کوشش کی ہے اوراسلام کےقسم خوردہ دشمنوں کےمقابلے میں مسلمانوں کے باہمی اتحادواتفاق کاہمیشہ استقبال کیاہے۔

تمام شیعہ مفکرین اور مصلحین کے یہ نعرے ہیں:

بنی الاسلام علیٰ دعاتین:

"کلمة التوحید، و توحید الکلمه"

اسلام دو ستونوں پر استوار ہے:

۱- خدائے وحدہ لاشریک کی اطاعت

۲- اتحاد و یکجہتی

خداوندا پرچم اسلام کو تمام دنیا میں سربلند فرما۔ اختلاف ڈالنے والوں کو۔ جو استعماری طاقتوں کے فائدے میں کام کرتے ہیں۔ نابود فرما۔ مشرکین، منافقین اور ضمیر فروشوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی قوت اور طاقت میں اضافہ فرما۔ اور ہمیں راہ راست کی ہدایت فرما۔

بمنك و كرمك

والحمد للّٰہ رب العالمین

مصادر و منابع

-پس از قرآن مجید۔

۱۔ارشادالساری لشرح صحیح البخاری۔ابن حجر قسطلانی،احمد بن محمد(م۹۲۳ھ)،۸ج،داراحیاء التراث العربی،بیروت،افست بی تا۔

۲۔الاعتصام شاطبی،ابواسحاق ابراھیم بن موسیٰ غرناطی(م۷۹۰ھ)درالفکر۔

۳۔اعتقادات صدوق،محمد بن علی بن الحسین(ابن بابویہ)قمی(م۳۸۱ھ)،چاپخانہء آفتاب،تھران، ۱۳۷۱ھ۔

۴۔الإلھیات۔سبحانی،جعفر،۲ج،الدارالإسلامیۃ،بیروت،۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹م۔

۵۔امالی۔صدوق،محمد بن علی بن الحسین(ابن بابویہ)قمی(م۳۸۱ھ)،مؤسسۃ الأعلمی بیروت،۱۴۰۰ھ۔

۶۔الإمامۃ والسیاسۃ۔ابن قتیبہ،عبداللہ بن مسلم(م۲۷۶ھ)،۲ج،المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ،قاھرہ،افست بی تا۔

۷۔اوائل المقالات فی المذاھب والمختارات۔مفید،محمد بن محمد بن نعمان(م۴۱۳ھ)،مکتبہء حقیقت، تبریز،۱۳۷۱ھ۔

⊙۸۔ انیس الاعلام۔ فخر الاسلام، محمد صادق
ارموی (م ۱۳۲۷ھ)، ۲ج، تہران (سنگی)، افست بی تا۔
⊙۹۔ بحار الأنوار۔ مجلسی، محمد باقر (م ۱۱۱۱ھ)، ۱۱۰ج، مؤسسۃ
الوفاء، بیروت، ۱۴۰۳ھ۔
⊙۱۰۔ تاریخ بغداد۔ خطیب بغدادی، احمد ابن علی (م ۴۶۳ھ)، ۱۴ج، المکتبۃ
السلفیۃ، مدینۂ منورہ، افست بی تا۔
⊙۱۱۔ تاریخ الخلفاء۔ سیوطی، عبد الرحمٰن بن أبی
بکر، (م ۹۱۱ھ)، دار الجیل، بیروت، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸م۔
⊙۱۲۔ تاریخ الرسل والملوک۔ طبری، محمد بن جریر، ابی جعفر، (م ۳۱۰ھ)، ۱۳ج،
دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷م۔
⊙۱۳۔ تفسیر القرآن العظیم۔ ابن کثیر، اسماعیل، ابی
الفداء، (م ۷۷۴ھ)، ۷ج، دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳م۔
⊙۱۴۔ تمدن اسلام وعرب۔ گوستاولوبون، ترجمہ فارسی سید محمد تقی فخر داعی
گیلانی، چاپخانۂ علمی، تہران، ۱۳۳۴ش۔
⊙۱۵۔ تنزیۃ الأنبیاء۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ (۳۵۵-۴۳۶)، چاپ
تبریز، سنگی ۱۲۹۰ھ۔
⊙۱۶۔ التوحید۔ صدوق، محمد بن علی بن الحسین (ابن
بابویہ) قمی، (م ۳۸۱ھ)، مکتبۃ الصدوق، تہران، ۱۳۸۷ھ۔
⊙۱۷۔ تہذیب الأصول۔ سبحانی، جعفر، ۲ج، مؤسسہ
النشر الاسلامی، قم، ۱۴۰۵ھ/۱۳۶۳ش۔
⊙۱۸۔ جامع الأصول فی احادیث الرسول۔ ابن

اثیر جزری (م۶۰۶ھ)، ۱۱ج، دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳م۔

⊙۱۹۔ جامع البیان فی تفسیر القرآن۔طبری، محمد ابن جریر(ابی جعفر)(م۳۱۰ھ)، ۳۰ج، دار المعرفۃ ، بیروت، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰م۔

⊙۲۰۔ الحکمۃ المتعالیۃ فی الأسفار الأربعۃ۔صدر الدین الشیرازی(م۱۰۵۰ھ)، ۹ج، داراحیاء التراث العربی ، بیروت، ۱۹۸۱م۔

⊙۲۱۔ حلیۃ الأولیاء۔ابی نعیم اصفہانی، احمد بن عبداللہ (م۴۳۰ھ)، ۱۰ج، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷م۔

⊙۲۲۔ خصائص الإمام امیر المؤمنین علیؑ۔نسائی، احمد بن شعیب(م۳۰۳ھ)، تحقیق ونشر محمد باقر محمودی، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳م۔

⊙۲۳۔ الخصائص الکبری۔سیوطی، عبدالرحمٰن بن أبی بکر، (م۹۱۱ھ)۔

⊙۲۴۔ الخصال۔صدوق، محمد بن علی بن الحسین (ابن بابویہ) قمی (م۳۸۱ھ)، منشورات جامعہ مدرّسین، قم، ۱۴۰۳ھ/۱۳۶۲ش۔

⊙۲۵۔ الخلاف۔الطوسی، محمد بن الحسن شیخ الطائفۃ (م۴۶۰ھ)، ۶ج، مؤسسۃ النشر الإسلامی، قم، ۱۴۱۶ھ۔

⊙۲۶۔ الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور۔سیوطی، عبدالرحمٰن بن أبی بکر (م۹۱۱ھ)، ۸ج، دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳م۔

⊙۲۷۔ رجال النجاشی۔نجاشی، احمد بن علی (م۴۵۰ھ)، ۲ج، دار الأضواء، بیروت، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸م۔

⊙۲۸۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن۔۔۔ آلوسی، محمود بغدادی (م۱۲۷۰ھ)، ۲۲ج، داراحیاء التراث العربی، بیروت، افست بی تا۔

⊙۲۹۔سنن ابن ماجہ۔ابن ماجہ،محمد بن یزید قزوینی (م۲۷۵ھ)،دار احیاء التراث العربی،بیروت،۱۳۹۵ھ /۱۹۷۵م۔

⊙۳۰۔سنن بیہقی۔بیہقی،احمد بن حسین بن علی (م۴۵۸ھ)،۱۰ج،افست دار صادر،بیروت،۱۳۴۴ھ۔

⊙۳۱۔سنن ترمذی۔ترمذی،محمد بن عیسیٰ (م۲۹۷ھ)،۵ج،دار احیاء التراث العربی،بیروت،افست بی تا۔

⊙۳۲۔سنن دارمی۔دارمی،عبداللہ بن بہرام (م۲۵۵ھ)،۲ج،دار الفکر،بیروت،افست بی تا۔

⊙۳۳۔السنۃ۔احمد بن حنبل (م۲۴۱ھ)،دار الکتب العلمیۃ،بیروت،۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵م۔

⊙۳۴۔السیرۃ النبویۃ۔ابن ھشام،عبدالملک بن ایوب حمیری (م۲۱۳یا۲۱۸ھ)،۴ج،دار احیاء التراث العربی،بیروت،افست بی تا۔

⊙۳۵۔شرح الأصول الخمسۃ۔عبدالجبار بن احمد (م۴۱۵ھ)،مکتبۃ وھبیۃ،قاھرہ،۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸م۔

⊙۳۶۔شرح تجرید۔قوشجی،علی بن محمد،علاء الدین (م۸۷۹ھ)،چاپ سنگی،تبریز،۱۳۰۷ھ۔

⊙۳۷۔شرح الزّرقانی علی موطأ مالک۔زرقانی،محمد بن عبدالباقی (م۱۱۲۲ھ)،۴ج،طبع عبدالحمید احمد حنفی، قاہرہ،افست بی تا۔

⊙۳۸۔شرح عقائد صدوق (تصحیح الاعتقاد)،مفید،محمد بن محمد بن نعمان (م۴۱۳ھ)،مکتبہء حقیقت،تبریز، ۱۳۷۱ھ۔

⊙۳۹۔شرح المقاصد۔تفتازانی،عمر اسعد الدین(م۷۹۲ھ)،چاپ
بوسنوی،استانبول،۱۳۰۵ھ۔
⊙۴۰۔الشفاء۔ابن سینا،حسین بن عبداللہ،ابوعلی(م۴۲۷)،شیخ
الرئیس،انتشارات بیدار،قم،افست بی تا۔
⊙۴۱۔صحیح بخاری۔بخاری،محمد بن اسماعیل(م۲۵۶ھ)،۹ج،داراحیاء التراث
العربی،بیروت،۱۴۰۰ھ۔
⊙۴۲۔صحیح مسلم۔مسلم بن حجاج قشیری
نیشابوری(م۲۶۱ھ)،۸ج،دارالجیل،بیروت،افست بی تا۔
⊙۴۳۔الصواعق المحرقۃ۔ابن حجر ہیثمی مکی،شہاب الدین
احمد(م۹۷۴ھ)،مکتبۃ القاہرۃ،قاہرۃ،۱۳۸۵ھ۔
⊙۴۴۔عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری۔عینی،محمود بن
احمد،بدرالدین(م۸۵۵ھ)،۲۲ج،دارالفکر،بیروت، افست بی تا۔
⊙۴۵۔عیون اخبار الرضاؑ۔صدوق،محمد بن علی بن الحسین(ابن
بابویہ)قمی(م۳۸۱)،مؤسسہ الأعلمی، بیروت،۱۴۰۴ھ۔
⊙۴۶۔الغدیر۔امینی،عبدالحسین احمد(م۱۳۹۰ھ)،۱۱ج،دارالکتاب
العربی،بیروت،۱۳۸۷ھ۔
⊙۴۷۔فتح الباری بشرح صحیح البخاری۔عسقلانی،احمد بن
حجر(م۸۵۲ھ)،۱۳ج،داراحیاء التراث العربی، بیروت،۱۴۰۲ھ۔
⊙۴۸۔فتح القدیر۔شوکانی،محمد بن علی
صنعانی(م۱۲۵۰ھ)،دارالمعرفۃ،بیروت،افست بی تا۔
⊙۴۹۔فجر الإسلام۔احمد امین مصری(م۱۳۷۳ھ)۔

۵۰۔ فرق الشیعۃ۔ نوبختی، حسن بن موسیٰ (م ۳۱۰ھ)، دارالاضواء، بیروت، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴م۔

۵۱۔ الکافی۔ کلینی، محمد بن یعقوب (م ۳۲۹ھ)، (اصول کافی)، ۲ج، دارصعب - دارالتعارف، بیروت، ۱۴۰۱ھ

۵۲۔ کشف الغمۃ فی معرفۃ الأئمۃ۔ اربلی، علی بن عیسیٰ (م ۶۹۲ھ)، دارالاضواء، بیروت، ۱۴۰۵ھ۔

۵۳۔ کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد۔ علامہ حلی، حسن بن مطہر (۶۴۸-۷۲۶)، مؤسسۃ النشر الإسلامی، قم، ۱۴۱۳ھ۔

۵۴۔ کفایۃ الأثر۔ خزاز قمی، علی بن محمد (م قرن ۴ھ)، منشورات بیدار، قم، ۱۴۰۱ھ۔

۵۵۔ کمال الدین وتمام النعمۃ۔ صدوق، محمد بن علی بن الحسین (ابن بابویہ) قمی (م ۳۸۱ھ)، مؤسسۃ النشر الإسلامی، قم، ۱۴۰۵ھ۔

۵۶۔ کنز العمال فی سنن الأقوال والأعمال۔ متقی هندی، علی بن حسام الدین (م ۹۷۵ھ)، ۱۶ج، مکتبۃ التراث الإسلامی، حلب، افست بی تا۔

۵۷۔ مجمع البیان۔ طبرسی، فضل بن حسن (م ۵۴۸ھ)، ۵ج، المکتبۃ العلمیۃ الإسلامیۃ، تہران، افست بی تا۔

۵۸۔ محاسن التأویل۔ قاسمی، جمال الدین محمد (م ۱۳۳۲ھ)، ۱۷ج، دارالفکر، بیروت، ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸م۔

۵۹۔ المستدرک علی الصحیحین۔ حاکم نیشابوری، حافظ أبی عبداللہ (م ۴۰۵ھ)، ۴ج، دارالمعرفۃ، بیروت، افست بی تا۔

۶۰۔ مسند احمد۔ احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)، ۶ج، داراحیاء التراث العربی، بیروت،

افست بی تا۔

⊙۶۱۔معانی الأخبار۔صدوق،محمد بن علی بن الحسین(ابن بابویہ)قمی(م۳۸۱ھ)،دارالمعرفۃ،بیروت،۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹م۔

⊙۶۲۔مفاتیح الغیب(تفسیر کبیر رازی)۔رازی،فخرالدین(م۶۰۶ھ)،دارالکتب العلمیۃ،تہران،افست بی تا۔

⊙۶۳۔المفردات فی غریب القرآن۔راغب اصفہانی،حسین بن محمد(م۵۰۲ھ)،المکتبۃ المرتضویۃ،تہران، ۱۳۳۲ش۔

⊙۶۴۔مقالات الإسلامیین واختلاف المصلّین۔ اشعری،ابوالحسن،علی بن اسماعیل(م۳۲۴ھ)،دارالنشر فرانزشتایز،ویسباون،افست بی تا۔

⊙۶۵۔مقاییس اللغۃ۔ابن فارس،احمد بن زکریا(م۳۹۵ھ)،۶ج،داراحیاء الکتاب العربیۃ،قاہرہ،افست بی تا۔

⊙۶۶۔الملل والنحل۔شہرستانی،عبدالکریم(م۵۴۸ھ)،دارالکتاب العلمیۃ،بیروت،۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰م۔

⊙۶۷۔المنار فی تفسیرالقرآن۔

(۶۸)رشیدرضا(م۱۳۵۴ھ)،۱۲ج،دارالمنار،قاہرہ،۱۳۷۳ھ۔۶۸۔

مناقب،خوارزمی،موفق بن احمد بن محمد مکّی(م۵۶۸ھ)،مؤسسۃ النشر الإسلامی،قم،۱۴۱۱ھ۔

⊙۶۹۔من لا یحضرہ الفقیہ۔صدوق،محمد بن علی بن الحسین،(ابن بابویہ)قمی(م۳۸۱ھ)،۴ج، دارالتعارف،بیروت،۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰م۔

⊙۷۰۔المواعظ والاعتبار بذکرالخطط والآثار(خطط مقریزیۃ)۔مقریزی،تقی الدین(م۸۴۵ھ)،۲ج،دارصادر، بیروت،افست بی تا۔

۷۱۔ میزان الاعتدال۔ ذھبی، محمد بن احمد، شمس الدین (م ۷۴۸ھ)، ۴ ج، دار المعرفۃ، بیروت، افست بی تا۔

۷۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن۔ طباطبائی، سید محمد حسین، ۲۰ ج، مؤسسۃ الأعلمی، بیروت، ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳م۔

۷۳۔ نہج البلاغہ۔ رضی، ابوالحسن محمد (م ۴۰۶ھ)، ضبط وفہرست الدکتور صبحی الصالح، بیروت، ۱۳۸۷ھ تہران ۱۳۹۵م۔

۷۴۔ وحی محمدی۔ منشی المنار رشید رضا (م ۱۳۵۴ھ)۔

۷۵۔ وسائل الشیعہ۔ حر عاملی، محمد بن حسن (م ۱۱۰۴ھ)، ۲۰ ج، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳م۔

۷۶۔ ینابیع المودۃ۔ قندوزی، باباخواجہ حسینی (م ۱۳۰۳ھ)، مطبع اختر، استانبول، ۱۳۰۱ھ۔